مصنف کی مہر کے بغیر کتاب مسروقہ تصور ہوگی

اسلامی افسانے

نہ سنتے تم جو غیروں کی زبانی
بہت دلچسپ تھی میری کہانی

جلد دوم

از

مولانا نور احمد خاں فریدی

ناشر

قصر الادب جگو والہ براہ لودھراں ضلع ملتان

فہرست

۵۲۲۷

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تقریب و تقریظ

(از حضرت علامہ مولانا عبدالرشید صاحب نسیم فاضل السنۂ شرقیہ ملتان)

مولانا نور احمد خاں صاحب فریدی کچھ ان جانے دیوں میں سے نہیں ہیں کہ ناظرین سے ان کا تعارف کراؤں۔ وہ ہمارے ملک کے معروف ترین لوگوں میں سے ہیں اہل علم ان کو خوب اچھی طرح جانتے ہیں۔ تاریخ سے ان کا شغف کچھ ڈھکی چھپی بات نہیں۔ تاریخی مضمون لکھنا اور تاریخ کی غلطیوں کو درست کرنا آپ کا محبوب ترین مشغلہ رہا ہے۔ تعلیمی و غیر تعلیمی کتابوں کے مصنف کی حیثیت سے بھی لوگ انہیں پہچانتے ہیں۔

البتہ جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ آپ نے "اسلامی افسانے" نامی ایک کتاب بھی تصنیف فرمائی ہے تو یقیناً مجھے تعجب ہوا۔ کیونکہ تا حال میں یہ سمجھتا تھا کہ علمی و تاریخی مضامین لکھنے والے اصحاب کو افسانہ و حکایت سے بہت کم لگاؤ ہوتا ہے۔ مگر جب آپ کے افسانے پڑھنے شروع کئے۔ تو کتاب ختم کرنے سے پہلے اُسے چھوڑنا مشکل ہو گیا اور بے اختیار زبان سے نکلا

ع ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں

آپ کے افسانے حقیقتاً تاریخ زیادہ اور افسانے کم ہیں مگر ان کے پڑھنے کے بعد یہ بات اچھی طرح ذہن نشین ہو جاتی ہے کہ:-

حقیقت افسانے سے زیادہ دلچسپ ہے

ایک دن میری آپ سے ملاقات ہو گئی تو میں نے "اسلامی افسانے" ایسی کامیاب کتاب لکھنے پر آپ کی خدمت میں مبارک باد عرض کی آپ نے اس کا صلہ یہ دیا فرمایا "اسلامی افسانے جلد دوم بھی کل پرسوں تک تیار ہو جائے گی اور اس کا پیش لفظ آپ کو ہی لکھنا ہوگا۔"

میں نے کہا: میری کیا بساط ہے کہ آپ جیسے "ادیب فریدی" کی کتاب کا پیش لفظ لکھوں کہنے کو تو یہ الفاظ میں کہہ گیا مگر اعماق قلب میں یہ خواہش چٹکیاں لے رہی تھی کہ کاش یہ کتاب اس وقت آپ کے ہاتھ میں ہوتی اور میں پیش لفظ لکھنے کے بہانے سے لے جا کر اُسے پڑھ سکتا۔

یہ میری خوش قسمتی سمجھیے کہ آپ نے میری دلی خواہش کے مطابق جواب میں فرمایا کہ کتاب کل پرسوں تک آپ کو پہنچ جائے گی اور پیش لفظ آپ کو لکھنا ہی ہوگا۔

آپ چلے گئے اور میرے لیے یہ انتظار کے دن کاٹنے مشکل ہوگئے تیسرے دن "اسلامی افسانے" کا مسودہ عربی رومال میں لپٹا ہوا موصول ہوا۔

شبیتہ الحمد۔ شہنشاہ کی دونی۔ مغلوں کی سزائیں۔ طاہرہ سلیمہ ۔۔۔۔۔۔۔

میں افسانے پر افسانہ پڑھتا چلا جا رہا تھا۔ اور ایک لمحے کے لیے بھی میرے ذہن میں یہ بات نہ آئی کہ مجھے تو ان افسانوں پر پیش لفظ یا تعارف لکھنا ہے میں ان کی عبارت پر غور کروں یا ان کی تکنیک پر تنقیدی نگاہ ڈالوں۔ افسانوں کی دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ پلاٹ اور اس کی جزئیات کی طرف دھیان دینے کا داعیہ ہی ذہن سے خارج ہو گیا۔

لیلیٰ پڑھنے کے بعد ذہن اس طرف منتقل ہوا کہ مجھے تو یہ کتاب پیش لفظ لکھنے کی خاطر بھیجی گئی ہے۔

ع کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

اب سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ اپنی رائے کی بجائے اہل فکر و نظر کی کچھ رائیں جو مجھے میسر آسکی ہیں۔ وہ آپ کی خدمت میں پیش کر دوں۔ سب سے پہلے ملک کے مشہور ادیب جناب عبدالرحیم صاحب شبلی بی کام سابق ایڈیٹر عالمگیر و خیام و حال چیف ایڈیٹر روزنامہ زمیندار کی رائے ملاحظہ فرمائیں۔

"مولانا نور احمد خاں فریدی علمی و ادبی حلقوں میں اپنے مطالعہ تاریخ کی وسعت اور تحقیق و تدقیق کی گہرائی کے باعث تعارف کے محتاج نہیں ہیں حال

ہی ہیں انہوں نے مروّجہ افسانہ نگاری کی ڈگر سے ہٹ کر تاریخ اسلام کے بعض درخشندہ واقعات کو افسانوی زبان میں ڈھالا ہے۔ اور اپنی قوتِ بیان اور شگفتگی زبان سے ایسا اثر پیدا کیا ہے کہ ہر افسانے کو بار بار پڑھنے کے باوجود طبیعت سیر نہیں ہوتی۔ مغل شہنشاہوں کے عدل و انصاف، افغان فرما بروں کی سخاوت و مروت۔ دکنی و بہمنی سپالاروں کے عزم و استقلال کی داستانیں نہایت سادہ و پرکار زبان میں ادا کی گئی ہیں اور لطف یہ ہے کہ ان میں حقیقت کی چاشنی اپنا اثر چھوڑتی جاتی ہے

یہ کتاب اس قابل ہے کہ والدین اپنے بچوں اور نوجوانوں کو پڑھنے کے لئے تحفۃً دیں۔

۲۰ نومبر ۱۹۵۱ء عبدالرحیم شبلی بی کام

مشہور مصنف جناب میاں منتصر باللہ صاحب ایم۔ اے ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول ملتان کی رائے ملاحظہ ہو۔

ڈرامہ نگاری اور افسانہ نویسی ایک ایسا فن ہے کہ اس کے ذریعے تاریخ کو نہایت دلچسپ پیرائے میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس فن میں بعض دفعہ "خطرہ" یہ پیدا ہو جاتا ہے۔ کہ کہیں مصنف حقیقت کو افسانوی پردہ میں لپیٹ کر ایسا نہ پیش کر دے کہ افسانہ محض تعیش ہی بن کر رہ جائے۔ اور واقعات مسخ ہو جائیں۔

مولانا نور احمد خاں فریدی نے اسلامی افسانے لکھ کر اس امر کو واضح کر دیا ہے کہ کس طرح افسانویت کو حقیقت پر غالب آنے سے روکا جا سکتا ہے۔ مولانا کی یہ کوشش نہایت کامیاب رہی ہے اور میں انہیں اس خوبصورت سی تصنیف پر مبارک پیش کرتا ہوں۔ مجھے مولانا سے انکی ایک پہلی تصنیف "سرزمین ملتان" کی وجہ سے ہی عقیدت تھی۔ اب آپ نے چند

تاریخی افسانوں کو پیش کر کے میری عقیدت میں اور پختگی پیدا کر دی ہے۔
اسلامی افسانے خصوصاً سکول کے طلباء کے لئے دلچسپ طور پر نہایت سادہ، شستہ اور شیریں انداز میں لکھے گئے ہیں۔ ادبیت کا معیار بھی بچوں کی ذہنی کیفیت کے مطابق رکھا گیا ہے۔ کتاب کی طباعت وغیرہ بھی دیدہ زیب ہے۔

مستنصر باللہ

۱۰ نومبر ۱۹۵۸ء

اب شاکر عروجی صاحب مدیر پرچم لائل پور کی رائے دیکھئے:۔
مولانا نور احمد خاں فریدی کو مبدء فیاض کی طرف سے ملکۂ تحقیق کی بدولت وہ طبع غواص نصیب ہوئی ہے۔ جو تاریخ کے بحر ناپیدا کنار سے دُر دانے آبدار نکالنے میں اپنے فرائض کی تکمیل کا سامان سمجھتی ہے۔
مولانا کو فن تاریخ سے وابستگی ہی نہیں بلکہ عشق ہے۔ قدرت نے واقعی انہیں اس لئے پیدا کیا ہے۔ کہ یہ فن تاریخ کی خدمت کریں۔ فریدی صاحب نہ تو ملک کے کوئی لیڈر رہیں۔ نہ مقتدر رئیس۔ بلکہ ایک قناعت پسند درویش ہیں اور ادبی حلقوں سے کوسوں دور ایسی فضا میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ جہاں نہ کوئی کتب خانہ ہے۔ نہ اہل زبان۔ گویا ؎

دُرِ عدن سمجھتے ہیں اہل نظر اسے
لیکن پڑا ہے سوادِ عدن سے دُور

"اسلامی افسانے" جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ تاریخ اسلام کا گنجینۂ تابناک ہے اور ہر افسانہ اسلامیات کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہے کتاب کی خوبیوں دلچسپیوں اور گوناگوں دلآویزیوں کے ضمن میں صرف مولانا فریدی کی شخصیت کا تعارف ہی کافی و وافی ہے۔ ہم ہر سکول کی لائبریری کے لئے اس کتاب کو ضروری خیال کرتے ہیں۔ اُمید ہے

کہ قارئین کرام بھی اس سے پورا استفادہ کرینگے۔"

۱۱ اکتوبر ۱۹۶۵ء
شاکر عروجی

آگرہ کے ادیب شہیر سید حشمت علی کاظمی کی رائے ملاحظہ فرمایئے:۔

"میرا ذاتی خیال ہے کہ کوئی بھی انصاف پسند نقاد "اسلامی افسانے" کی افادیت اور اہمیت کو سراہے بغیر نہ رہے گا۔ کیونکہ یہ افسانے جس محنت اور جانفشانی سے لکھے گئے ہیں۔ اتنے ہی یہ کامیاب ہیں۔ ان افسانوں میں شاہانِ اسلام کے عادات واخلاق، عدل وانصاف، حلم وعفو، صداقت وجرأت، حریت ومساوات، اور محبت وشجاعت کے بصیرت افروز کارناموں کو نہایت مؤثر اور دلکش انداز میں اجاگر کیا گیا ہے۔ یہ بھولے ہوئے افسانے مایوس اور مردہ دلوں کے لئے پیغام حیات ہیں۔

۱۵/۱۱/۱۵
سید حشمت علی کاظمی ادیب
آگرہ (بھارت)

اب ذرا مولانا جامی مدیر "انسان" گوجرانوالہ کا تازہ ترین مکتوب بھی پڑھ ڈالئے جو انہوں نے حال ہی میں مصنف کو تحریر کیا ہے۔ لکھتے ہیں:۔

گرامیِ محترم: سلام مسنون۔ عرصہ سے جناب کی تلاش میں تھا۔ آج پتہ پایا ہے۔ ماہنامہ "انسان" گوجرانوالہ کے ستمبر کے پرچہ میں آپ کا افسانہ "سلمیٰ" (شبستہ الحمد، ماہنامہ "باقہ" دہلی سے لے کر شائع کیا ہے۔ اسکی تعریف میں اس وقت تک ۱۷۲ خطوط موصول ہو چکے ہیں اور متقاضی ہیں کہ ماہنامہ "انسان" کی کوئی اشاعت مولانا کے افکار سے خالی نہ ہو۔

مولانا! میں ایک درویش ہوں۔ اور غریب ترین۔ کسی خدمت کے قابل نہیں۔ البتہ آنسوؤں سے شکریہ ادا کروں گا۔ نومبر کا پرچہ ارسال

خدمت ہے اس کی گذارشات ہیں میں نے خریداروں سے وعدہ کیا ہے کہ دسمبر کے پرچہ میں مولانا فریدی صاحب) کا افسانہ ضرور ہوگا۔ دسمبر آرہا ہے۔ اب میری لاج رکھنا اور میرے عہد کی پاسداری آپ پر منحصر ہے۔ بدیں عریضہ ہذا کوئی تاریخی افسانہ یا جو بھی پسند فرمائیں آج ہی بھیج دیں۔ کہ وقت کم اور ضرورت زیادہ ہے۔ اللہ آپ کو طاقت اور آپ کے قلم کو اور بھی پُر اثر بنائے۔ آمین۔

دعاگو

۱۱/۱۵/ ۷۱ء

عبدالرحمٰن جامی

آخر میں ہندوستان کے مشہور مورخ و نقاد الحاج مولانا حامد حسن صاحب قادری کے وہ اشعار ملاحظہ فرمائیں جو انہوں نے از راہِ عقیدت ہمارے "ادیب فریدی" کی خدمت میں تحریر فرمائے ہیں۔

رہے تاریخ کے میدان میں گردش ممندِ کلک کو ہرگز نہ ٹھیرا
مئے اسلام کے سب جام و خم ہیں تری ایک ایک سطرایک ایک پیرا
بیا اے ساقی تاریخ اسلام بگردش آر ایں مینا و مے را

حَمَاكَ اللّٰهُ عَنْ شَرِّ النَّوَائِبْ
جَزَاكَ اللّٰهُ فِي الدَّارَيْنِ خَيْرًا

جہاں تک میرا خیال ہے اب تقدمہ و تعارف کا کام بھی ہوگیا ہے اور مجھے کوئی حق نہیں کہ کتاب اور قارئین کرام کے درمیان دیر تک حائل رہوں۔ والسلام خیر ختام

ملتان
۲۲ ستمبر ۱۹۵۲ء

عبدالرشید نسیم

شیبتہ الحمد

ماخذ

۱۔ تاریخ طبری
۲۔ معارج النبوۃ
۳۔ سیرۃ عثمانؓ
۴۔ حیات سید العرب صلی اللہ علیہ وسلم

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے جدّ امجد سیّدنا عبدالمطلب کی ولادت کا حسین و جمیل تذکرہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جدّ بزرگوار کا اصلی نام شیبۃ الحمد تھا آپ ابھی دس برس کے بچے ہی تھے کہ آپ کے چچا مطلب آپ کو مدینہ سے مکہ لے آئے۔ چونکہ آپ کی والدہ سلمیٰ آپ کو مکہ بھیجنے پر راضی نہیں تھیں اس خیال کے پیش نظر کہ شاید بی بی صاحبہ کسی ملازم کو بھیج کر واپس منگوا لیں۔ یا یہودی علماء جو آپ کی تلاش میں ہیں۔ پہچان کر کسی قسم کی تکلیف پہنچائیں اس لئے جب مطلب انہیں لے کر مکہ میں داخل ہوئے اور لوگوں نے آپ کی دلفریب صورت دیکھ کر پوچھا۔

"یہ بچہ کون ہے"؟

تو آپ نے فرمایا ھٰذا عبدی! یعنی "یہ میرا غلام ہے"۔ اس دن سے آپ کا نام مکہ میں عبدالمطلب مشہور ہو گیا۔ اس افسانہ میں آپکی ولادت کے واقعات کو اجاگر کیا گیا ہے۔

اِبتدائیہ

مکہ مکرمہ ـــــــــ اسلامی دنیا کا پر شوکت مرکز جس کی پر کیف فضاؤں میں اکناف عالم سے آتی ہوئی سعید روحیں خدا شناسی کا درس لیتی ہیں جس کا ذرہ ذرہ عظمتِ رفتہ کا آئینہ دار ہے اسلامی عہد سے پہلے بھی روحانیت کا سر چشمہ خیال کیا جاتا تھا۔ بنی عدنان اُس گھر کے متولی چلے آتے تھے۔ جس کی بنیاد ان کے آباء و اجداد سیدنا ابراہیم و اسمٰعیل (علیہم السلام) نے اپنے مقدس ہاتھوں سے رکھی تھی۔ اس لئے عرب کی تمام قومیں انکی سیادت کو تسلیم کرتی تھیں۔ عبد المناف جو اپنے حسن و جمال کے سبب قمر البطحا کہلاتے تھے۔ قریش کے سردار اور کعبہ کے متولّی تھے۔ نزار کا علم اور حضرت اسمٰعیل کی کمان ان کے قبضے میں تھی۔ الندوہ کی صدارت اور حجاج کی سقائی کا شرف بھی انہیں حاصل تھا۔ انہوں نے اپنی عمر بڑے ٹھاٹھ سے گذاری تھی۔ بڑے سخی انسان تھے۔ روزانہ ان کے کئی اونٹ ذبح ہوتے تھے۔ خاص کر جن دنوں باد شمالی چلتی۔ ان کا دسترخوان بچھ جاتا اور اس پر بھونا

ہوا گوشت اور خالص شہد قرینے سے لگا دیا جاتا۔ لوگ جوق در جوق آتے اور ان کے مائدہ فیض سے بہرہ یاب ہو کر واپس لوٹتے۔ اس میں اپنے پرائے اور امیر و غریب کی کوئی تمیز نہ تھی۔ اس لئے اہل مکہ کو اپنے امیر سے بڑی محبت تھی۔ جب ان کی بیماری کی خبر مشتہر ہوئی تو سارے شہر نے اسے شدّت سے محسوس کیا اور آپ کے رفیع الشان دروازے پر آٹھوں پہر عقیدت مندوں کا ہجوم رہنے لگا۔

عبدالمناف بسترِ مرگ پر

مرض بڑھتا چلا گیا یہاں تک کہ مکہ کے بوڑھے سردار کو موت قریب دکھائی دینے لگی۔ رات کا وقت تھا۔ مکہ کے گلی کوچوں میں سیاہ گھُپ اندھیرا چھا رہا تھا۔ عبدالمناف چھت سے ٹکٹکی لگائے ایک پلنگ پر دراز تھے آپ کی اہلیہ محترمہ جنابہ عاتکہ سرہانے بیٹھی پنکھا کر رہی تھیں۔ اور جوان بیٹے مٹھیاں بھرنے میں مصروف تھے۔ کمرے میں ایک مہیب سکوت طاری تھا۔

دفعتہً عبدمناف نے کھانستے ہوئے پہلو بدلا۔ اور فرمایا۔

"ہاشم بیٹا ———— ! کسی آدمی کو بھیج کر اپنے چچوں اور دوسرے قریبی تعلقداروں کو بلا لو ———— !!"

اُسی وقت آدمی بھیج دیا گیا۔ اور تھوڑی دیر میں ہی خاندانِ قریش

کے محسن لوگ آپ کے گرد جمع ہو گئے۔ آپ نے فرمایا۔

دوستو ——— ! میرا وقت آخر قریب ہے۔ میں نے زندگی بھر میں اگر آپ سے کچھ سختی کی ہو۔ تو خدا کے لئے معاف کر دیجئے۔ اور اگر کسی کا حق میرے ذمہ ہو۔ تو وہ یہیں مجھ سے وصول کر لے۔ تاکہ دربار الٰہی میں مجھے رسوا نہ ہونا پڑے ——— !"

حاضرین کی آنکھیں فرطِ غم سے اشک بار ہو گئیں۔ خواجہ عدی نے کہا۔

بھائی صاحب! آپ عرب کے بہترین سردار تھے۔ آپ نے اپنے خاندان اور گرد و نواح کے لوگوں پر جو احسانات کیے ہیں۔ وہ مدت تک یادگار رہیں گے۔ آپ کی جدائی کے ناقابلِ اظہار احساس نے ہم سب کو بے چین کر رکھا ہے۔ ہمیں آپ سے کوئی شکوہ نہیں۔ لیکن ہم سے نفسانی کمزوری کے سبب بہت سی لغزشیں صادر ہوتی رہی ہیں۔ ہم امیدوار ہیں کہ جناب ان سے درگذر فرما کر ہمیں صدق دل سے معاف فرمائیں گے۔

یہ کہہ کر جناب عدی رو پڑے۔ اور خواجہ عبدالمناف کی آنکھوں سے بھی آنسوؤں کے موٹے موٹے قطرے بہہ نکلے۔ فرمایا۔

"تم لوگ گواہ رہو۔ میں نے سب کو معاف کیا۔"

اس کے بعد بی بی عاتکہ سے فرمایا۔ اندر سے تبرکات لے آؤ۔
خاتونِ اعظم نوفل کو ہمراہ لے گئیں اور حضرت نزار کا جھنڈا اور حضرت اسمٰعیلؑ کی کمان اُٹھوا لائیں۔ خواجہ عبدالمناف نے حضرت عدی سے کہا میرے سامنے یہ دونو چیزیں ہاشم کے حوالے کیجئے۔ اور خواجہ ہاشم سے فرمایا۔
"آگے بڑھ اور اپنے بزرگوں کی امانت سنبھال ——"
خواجہ ہاشم جس کا لڑکپن آغازِ جوانی سے ہمکنار ہو رہا تھا اس کے ہونٹ تھرتھرائے۔ ٹھوڑی کپکپائی اور آنسوؤں کے دو موٹے موٹے قطرے اس کے رخساروں کو تر کرتے ہوئے فرش پر گر پڑے۔ لڑکھڑاتا ہوا آگے بڑھا۔ قریب المرگ باپ نے مرتعش ہاتھوں سے اپنی دستار اُٹھا کر اس کے سر پر رکھی۔ وفورِ غم سے خواجہ ہاشم کی چیخ نکل گئی۔ اور اعزّا و اقارب بھی دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ حضرت عدی نے ایک ہاتھ میں نزار کا جھنڈا اور دوسرے میں حضرت اسمٰعیلؑ کی کمان پکڑائی۔ اور کہا۔
"بیٹا۔ رو نہیں تو نے سارے خاندان کا بوجھ اُٹھانا ہے۔ مکہ کی سرداری کرنی ہے۔ دل کو مضبوط بنا ——!!"
عبدالمناف نے ہاتھ بڑھا کر ہاشم کا ہاتھ تھاما۔ اور لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں کہنا شروع کیا:۔

پیارے بیٹے! جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو۔ میں اس وقت اجل کے دروازے پر پڑا ہوں۔ موت خوفناک اژدھے کی طرح منہ پھاڑے مجھے نگل جانے کی منتظر ہے۔ ایسے عالم میں میں تجھ سے ایک خاص امر کی بابت وصیت کرنا چاہتا ہوں۔ اُمید ہے تم اس پر حرف بحرف عمل کرنے کی کوشش کرو گے۔"

خواجہ ہاشم ادب سے جھک گئے۔ گویا والد مہربان کے حکم کی تعمیل کے لئے بسر و چشم تیار ہیں۔ عبدالمناف نے کچھ دیر کھانسنے کے بعد پھر کہنا شروع کیا۔

"تم جانتے ہو۔ کہ یہ گل اندامی اور رعنائی تجھے کس سبب سے ملی ہے۔! باقی دنیا سے تم اس قدر زیادہ حسین و جمیل کیوں ہو!! اور کبھی تو نے سوچا ہے کہ تیرے ماتھے پر نور کیوں چمکتا ہے —— !!!

اگر معلوم نہیں تو سُن عنقریب دنیا میں بہت بڑے پیغمبر کو ظاہر ہونا ہے اب اس کے ظہور کا وقت بالکل قریب آگیا ہے۔ خدائے لایزال نے اس جلیل القدر اور عظیم المرتبت نبی کی ولادت کے لیے ہمارے خاندان کو منتخب کیا ہے۔ آدم علیہ السلام سے یہ نورِ نبوّت پُشت در پُشت منتقل ہو کر مجھ تک پہنچا۔ ہم سب نورِ محمدی کے امانت دار تھے۔ ہم میں سے کسی نے حرام کے لئے آزار نہیں کھولا۔ اب یہ نور تجھ میں جلوہ فگن ہے اس لیے

میں تجھے وصیت کرتا ہوں کہ ہوشیار رہو کر رہنا۔ اور اس نور کی بڑی حفاظت کرنا۔"

بولتے بولتے حضرت عبدالمناف تھک گئے۔ اور آپ پر غشی طاری ہوگئی۔ تھوڑی دیر بعد پھر آنکھ کھولی۔ اور فرمایا۔

"ہاشم!"

"لبیک یا ابی!" ہاشم نے گلوگیر آواز میں جواب دیا۔

"سنتے ہو۔ جب وہ پیکرِ لطیف ہمارے خانوادے کو سرفراز کرے اگر تیری نگاہوں کو اس کی جلوہ آرائی کا شرف حاصل ہو تو اسے میرے سلام دینا۔"

اس کے بعد خواجہ عبدالمناف نے عدی اور عبدالعزیٰ کی طرف نگاہ کی۔ اور فرمایا۔

"یہ تیرے بزرگ چچا ہیں۔ انہیں میری جگہ سمجھنا۔ اور بھائیوں پر ہمیشہ شفقت کی نظر رکھنا۔ انہیں میں تیرے سپرد کرتا ہوں۔ اور تجھے خدا کی امان میں چھوڑتا ہوں۔ لو خدا حافظ۔!"

اس کے بعد آپ نے آنکھیں بند کرلیں۔ ضعف حد سے زیادہ تھا۔ جو لحہ بہ لحہ بڑھتا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ دوپہر کو مایوسی کے آثار پیدا ہوئے اور شام کو جھٹپٹے کے وقت جبکہ سورج کی شعاعیں جبل ابوقبیس کی چوٹیوں

پر تاریکیوں سے مصافحہ کر رہی تھیں۔ مکہ مکرمہ کا بہت بڑا رئیس اور بیت ربی کا فیاض متولی ہمیشہ کے لئے چل بسا۔ اُن کے مرنے پر شہر بھر میں ایک کہرام برپا ہو گیا۔ حضرت ہاشم نے بڑی شان سے نامور باپ کا جنازہ اٹھوایا۔ بے شمار مرثیہ خواں جنازہ کے آگے مرثیے پڑھتے چلے جا رہے تھے، اور ہزاروں آدمی بلند آواز سے چلّا چلّا کر درد انگیز اشعار پڑھ رہے تھے۔ صحن کعبہ میں جنازے کو لے جا کر طواف کرایا گیا۔ اس کے بعد حجون سے ہوتے ہوئے المعلاۃ کے دامن میں لے گئے۔ جہاں اس بلند اقبال رئیس کو قصی کے پہلو میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔

حضرت ہاشم کی فیاضیاں

خواجہ ہاشم اپنے خاندان میں سب سے حسین نوجوان تھے۔ کنول کے پھول سا سفید رنگ جس میں آمدِ شباب کی ہلکی سرخی کی جھلک سپیدۂ سحر میں شفق کی گلکاری معلوم ہوتی تھی۔ موٹی موٹی سیاہ اور چمکیلی آنکھیں، کمان کی مانند تنی ہوئی بھنویں، دراز پلکیں، گھنگریالے بال، پتلے پتلے یاقوتی ہونٹ، موتیوں کی طرح ننھے ننھے سفید دانت، گلستانِ ابراہیمی کی یہ نوخیز کلی ابھی کھلی ہی نہ تھی۔ کہ سر سے باپ کا سایہ اُٹھ گیا۔ خاتونِ عظم

عاتکہ نے آپ کی شادی بنی خزاعیہ کے ایک مقتدر رئیس عامر کی صاحبزادی سے کردی۔ اس کے بطن سے اسد پیدا ہوئے۔ لیکن وہ نور جو جبین قدسی پر چمک رہا تھا منتقل نہ ہوا۔ دوسری شادی عمرو بن ثعلبہ کی معصومہ دجیہہ الہند سے ہوئی۔ اس خاتون سے ابا صیفی تولد ہوئے مگر نورِ نبوت بدستور آپ کی پیشانی پر جگمگاتا رہا۔ آپ کو سخت فکر ہوئی۔ اور گھبرا کر تیسری شادی بنی قضاعہ کے ایک ممتاز گھرانے میں کی۔ اس حرم سے جناب نضلہ پیدا ہوئے۔ لیکن نورِ نبوت نے آپ کی پیشانی سے حرکت نہ کی۔ اس پر آپ نے صدقات و خیرات پر کمر ہمت باندھ لی۔ روزانہ کئی اونٹ ذبح ہوتے اور ثرید کا دسترخوان بچھ جاتا۔ سرد ہواؤں کے ایام میں مہمانوں کی تعداد اور زیادہ ہو جاتی تھی۔ کیونکہ مضافات کے اعراب بھی شہر میں آ جاتے تھے اور یہ سب خواجہ ہاشم کے خوان پہ پلتے تھے۔ ذی الحج کی پہلی تاریخ کو آپ کعبہ کی دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑے ہو جاتے اور قوم کو خطاب کر کے فرماتے۔

اے سردارانِ قریش! بے شک تم عرب کے سردار ہو۔ اور عقل و صورت حسب و نسب کے لحاظ سے سب پر فوقیت رکھتے ہو۔ صلہ رحمی کا بھی تم میں باقی اقوام کے مقابلہ میں زیادہ احساس ہے۔

اے قریشی بزرگو! بے شک تم بیت اللہ کے پڑوسی ہو۔ اللہ نے تمہیں

اپنی دوستی کے شرف سے نوازا ہے۔ اور اپنی ہمسائیگی کی عزت بخشی ہے حج کا مہینہ شروع ہو چکا ہے۔ اطراف واکناف عالم سے لوگ اس مبارک و مکرم گھر کی زیارت کے لئے جوق در جوق آرہے ہیں۔ اس لحاظ سے وہ اللہ کے مہمان ہیں۔ اور تم اس کے مہمانوں کی خاطر مدارات بجا لانے کا سب سے زیادہ حق رکھتے ہو۔ اگر میرے پاس اتنا مال ہوتا، جس سے ان کی مہمان نوازی ہوسکتی۔ تو میں آپ کو اس سے بے نیاز کر دیتا میں اپنا حلال مال اس راہ پر صرف کرتا ہوں تم میں سے بھی جو لوگ اس کار خیر میں حصہ لینا چاہیں۔ اپنی حلال کمائی کا مال پیش کریں۔

اس پر اہل مکہ دھڑا دھڑ دار الندوہ میں مال لانے لگتے۔ یہاں تک کہ گندم۔ کھجور۔ زیتون اور نقدی سے وہاں ایک انبار لگ جاتا۔ سینکڑوں اونٹ ان ایام میں حوضوں کو میٹھے پانی سے بھرنے پر مقرر ہو جاتے جو دور دور کے چشموں سے پانی بھر لاتے تھے۔ مکہ مکرمہ۔ منیٰ اور عرفات میں حاجیوں کے لئے اتنے حوض بھرا دیئے جاتے تھے۔ کہ حج کے ایام میں کسی کو تشنگی کا موقعہ نہ ملتا تھا۔

اُمیّہ کی دعوت

جب آپ کے بھائی عبدالشمس نے انتقال کیا۔ تو اس کے بڑے

لڑکے امیہ نے خواہش کی۔ کہ ایک بار اُسے حاجیوں کو کھانا کھلانے کی اجازت ہو۔ آپ یہ شرفِ سعادت کسی دوسرے کو سپرد کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ اور آپ یہ بھی جانتے تھے۔ کہ اُمیہ کا یہ مطالبہ حسد اور رشک کے خیال سے ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ قریش پر میری سیادت کا اثر نہ رہے لیکن موتی مٹی کی نشانی سمجھ کر اوپرے دل سے اجازت دے دی۔

اُمیہ نے اپنی بساط سے بڑھ چڑھ کر ضیافت کا اہتمام کیا۔ گھر کا سارا اثاثہ خرچ کر ڈالا۔ مگر کھانا حاجیوں کو پورا نہ ہو سکا۔ غول کے غول حضرت ہاشم کے دروازے پر آ جمع ہوئے۔ "العطش" "الجوع" کی صدا بلند ہونے لگی۔ جناب ہاشم جھنجھلا کر اُمیہ کی طرف لپکے۔ وہ خوف کے مارے روپوش ہو گیا۔ حضرت نے اس کی تلاش میں ہر طرف آدمی دوڑائے اور ساتھ ہی اپنے غلاموں کو حکم دیا کہ جبل ثور کی طرف جو اونٹ چر رہے ہیں۔ ان میں سے پچاس موٹے تازے اونٹ ہانک لاؤ۔!

آپ صفا کی پہاڑی پر بیٹھ گئے۔ نوکر چاکر دوڑے گئے اور اونٹ ہانک کر لے آئے۔ آپ نے نیزہ لے کر نحر کرنا شروع کیا چشم زدن میں پچاس اونٹ حلال ہو کر اور پک کر دستر خوان پر آ گئے۔ مطبخ میں روٹیوں کا انبار لگا پڑا تھا۔ منگوا کر دستر خوان پر قرینے سے رکھوا دیں۔ ڈھنڈورچی نے جبل جحوں تک پیچ چیخ کر ندا دی۔ کہ جس کسی نے کھانا نہ کھایا ہو۔ وہ

خواجہ ہاشم کے دسترخوان پر آکر کھا لے۔ پردے کے پردے حاجیوں کے آتے اور خوان کرم سے بہرہ یاب ہو کر دعائیں دیتے ہوئے واپس لوٹے
اُمیّہ کو اس واقعہ سے اتنی ندامت ہوئی کہ وہ مکہ چھوڑ کر شام کی طرف بھاگ گیا۔ اور جب تک ہاشم زندہ رہے۔ واپس نہ آیا۔

ایک سال مکہ میں ہولناک قحط پڑا۔ لوگ فاقے سے مرنے لگے۔ حضرت ہاشم سے خلق خدا کی یہ حالت دیکھی نہ گئی۔ گھر کی آخری کوڑی تک ہمراہ لے کر شام کو روانہ ہو گئے اور وہاں سے سینکڑوں من آٹا خرید لاتے۔ ہر طرف اطلاع کرائی گئی۔ اور جب تک مکہ قحط کے خطرے سے نہ نکل گیا حضرت ہاشم کا لنگر بے حساب جاری رہا۔ آپ کے چچا زاد بھائی وھب بن عبد قصی نے اسی موقعہ پر یہی کہا تھا ؎

تحمل ھاشم ماضاق عنہ — واعیا ان یقوم بہ ابن بیض
اتاھم بالغرائر متاقات — من ارض الشام بالبر النفیض
فاوسع اھل مکۃ من ھشیم — وشباب الخبز بالحم الغریض
نظل القوم بین مکللات
من الشیزی وحائرھا یفیض

مدینہ کی ایک بہادر حسینہ

انہی ایام میں مکہ مکرمہ سے بہت دُور مدینہ شہر کے اندر ایک نو عمر حسینہ بیوہ ہو چکی تھی۔ اس کا خوبصورت کنول سا چہرہ موت کی طرح زرد تھا۔ اسکی غزال کی طرح نشیلی اور بڑی بڑی سیاہ آنکھیں وقف اشکبار تھیں۔ اگرچہ اس کی ماں تا کی ماری ماں نے پیاری بچی کے غم کو ہلکا کرنے کی ہزار دں کوششیں کیں۔ مگر کوئی صورت کارگر نہ ہوئی۔ اس کے حسین چہرے پر رقت حزن وملال طاری رہتا تھا۔ اسی عالم میں دن گزرتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ اس واقعہ کو پورا سال ہو گیا۔ ایک دن وہ انہی غم انگیز اور روح فرسا احساسات میں گھری بیٹھی تھی کہ دفعتہً ڈیوڑھی سے کسی کے اونچا اونچا بولنے کی آواز سُنائی دی۔ حسینہ چونک پڑی یہ ام سلیم کی آواز تھی۔ جو اس علاقہ کی مشہور کاہنہ تھی۔ سارا شہر اس خاتون کا احترام کرتا تھا۔ عورتیں اس سے اپنی قسمتوں کے بارے میں سوال کرتی تھیں۔ اور عرب اپنے مقدمات طے کرانے کے لئے اس کی طرف رجوع کرتے تھے۔ وہ چلاتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ "کہاں ہے میری سلمٰی"! یہی اس کمسن بیوہ کا نام تھا۔ ہائے مجھ نگوڑی کو کیا علم تھا۔ کہ میری بچی پر یہ حادثہ آنے والا ہے۔!

ہائے بدنصیبی ——— وائے بدقسمتی ———!

سلمیٰ کی ماں اور امِ سلیم دونوں بہنیں بنی ہوئی تھیں۔ وہ ایک کونے میں غم کی پوٹ بنی دبکی بیٹھی تھی۔ اسے دیکھ کر کھڑی ہوگئی اَھلاً وَ سہلاً کہہ کر اس کو گلے سے لگایا۔ اور پھر سلمیٰ کے پاس لے آئی۔ امِ سلیم کو دیکھ کر سلمیٰ کا غم تازہ ہوگیا۔ ڈاڑھیں مار مار کر رونے لگی۔ کاہنہ نے لپک کر اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ سر اور منہ پر پیار کرنے کے بعد کلیجہ سے چمٹا کر خوب روئی۔ سلمیٰ اپنی بربادی کے بین کرتی تھیں اور کاہنہ دنیا کی ناپائیداری کے اشعار پڑھتی تھیں۔ جب دونوں رو رو کر تھک گئیں تو امِ سلیم نے صبر کی تلقین شروع کی۔ سلمیٰ سسکیاں بھر رہی تھی۔ اور اس کی حسین مرمریں باہیں ابھی تک خالہ اماں کی گردن کے گرد حمائل تھیں۔ کاہنہ کی نظر اس کے گورے گورے نازک ہاتھوں پر جا پڑی۔ وہ کتنی ہی دیر تک اس کے گداز ہاتھوں کی لکیروں کا مطالعہ کرتی رہی۔ پھر اس نے سلمیٰ کے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر اس کی فراخ پیشانی اور اس کے بیفسوی چہرے کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنا شروع کیا۔

کاہنہ کی پیش گوئی

سلمیٰ جانتی تھی کہ کاہنہ کو غیب کی باتوں کا علم ہو جاتا ہے۔ وہ خود کہا کرتی تھی کہ جن میرے تابع ہیں۔ اور وہی مجھے ایسی خبریں بتا دیا کرتے

ہیں۔ چہرے کے خدوخال اور ہاتھ کی لکیروں سے بھی وہ غیب کی خبریں پڑھ لیتی تھی۔ سلمٰی گھبرا کر بولی۔

"خالہ اماں! بیٹھی کیا سوچ رہی ہو۔ کیا تقدیر نے اس سے بھی کوئی اور زیادہ مصیبت میرے نام لکھ دی ہے؟"

نہیں بیٹی ——— معاملہ کچھ اور ہے۔ میرا علم بتاتا ہے کہ ابھی تیری ایک اور شادی ہو گی۔ عرب کا حسین ترین جوان کالے کوسوں کا سفر طے کر کے یہاں آئے گا۔ اس کی خوبصورتی سے مدینہ کا شہر جگمگا اُٹھے گا اس کی آنکھیں سیاہ اور بال گھنگریالے ہوں گے وہ عالی مرتبہ اور اور عرب کے ممتاز خاندان کا چشم و چراغ ہو گا اس سے ایک ایسا لڑکا پیدا ہو گا۔ جس کی زمین کے علاوہ آسمانوں پر بھی بادشاہت ہو گی ———"

کاہنہ کی اس پیشین گوئی سے سلمٰی کے مُردہ جسم میں زندگی کے آثار پیدا ہوئے۔ اس کا پژمردہ چہرہ ایک دفعہ پھر دمک اُٹھا۔ کاہنہ سے نظریں چار کرتی ہوئی بولی! ———

"خالہ اماں! کیا آپ سچ کہہ رہی ہیں ———؟"

"تو کیا میں اپنی دُکھیا بیٹی سے مذاق کر رہی ہوں!

بیٹی! یہ تیری تقدیر ہے۔ مگر ہاں اس راز کو کسی پر ظاہر نہ کرنا ایسی باتوں کو افشا نہیں کیا جاتا۔

ام سلیم نے ایک دفعہ پھر سلمیٰ کو کلیجہ سے لگا کر بھینچا۔ اور اس کی ماں ریحانہ کو بلا کر کہا۔ میرا کھانا یہاں بھیجو۔ میں اپنی بیٹی کے ساتھ مل کر کھاؤں گی سلمیٰ کے ابا خواجہ عمر اور اس کی نازبردار ماں ریحانہ یہ تبدیلی دیکھ کر باغ و بہار ہو گئے۔ خادمہ نے آکر دسترخوان بچھایا۔ اور ام سلیم نے سلمیٰ کے ہمراہ کھانا تناول کیا۔ سات آٹھ دن کا ہنہ سلمیٰ کے ہاں مقیم رہی اور اُسے دین ابراہیمی کی تلقین کرتی رہی۔ جب وہ رخصت ہوئی۔ خواجہ عمر نے اشرفیوں کی ایک تھیلی اس کی نذر کی۔ مگر وہ اس قدر سیر چشم واقع ہوئی تھی کہ چلتے چلتے ساری کی ساری تھیلی فقیروں اور محتاجوں میں بانٹ گئی۔

سلمیٰ کے تفریحی مشغلے

خواجہ عمر مدینہ کے بہت بڑے سوداگر تھے۔ انہوں نے اپنی لڑکی کی بڑے اعلیٰ پیمانہ پر تربیت کی تھی۔ وہ اعلیٰ درجے کی شہسوار اور تیرانداز تھی، سارے عرب میں اس کی خوبصورتی کے چرچے تھے۔ صبح سویرے اپنی سہیلیوں کو ہمراہ لے کر اُحد کی وادی میں شکار کے لیے نکل جاتی تھی۔ کبھی دوپہر کو اور کبھی شام کو واپس ہوتی۔ خواجہ عمر کو بچی کے اس تفریحی مشغلہ سے اس قدر دلچسپی تھی۔ کہ کبھی کبھی وہ بھی خیمے بھجوا دیتے تھے۔ اور خود سلمیٰ کے ساتھ تین تین دن شکار میں صرف کر دیتے تھے۔ سلمیٰ جب احد اور سلع کی وادیوں میں گھوڑے کو

کا وہ دبنی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ بہشت کی کوئی حور ہے جو فردوس کی آوارہ خرامی سے گھبرا کر سکون آفرین تنہائی کی تلاش میں اُڑی چلی جاتی ہے۔ اس کا نشانہ ایسا درست تھا کہ کبھی خطا ہی نہ ہوتا تھا جس ہرن یا خرگوش پر تیر چلاتی قضائے مبرّم بن کر گرتا تھا۔ بڑے بڑے رئیسوں نے اس کی خوبصورتی اور بہادری کی تعریف سن کر شادی کے پیغام بھیجے۔ مگر سلمٰی نے صاف جواب دے دیا۔ وہ تو گھنگریالے بالوں اور موٹی موٹی سیاہ آنکھوں والے جوان رعنا کی انتظار میں تھی۔ انہیں خاطر میں کیسے لاسکتی تھی۔ بلکہ اس نے اپنے باپ سے بھی کہہ دیا تھا کہ آپ میری ایک شادی کر چکے ہیں۔ میری دوسری شادی میں آپ دخل نہ دیں میں اپنی مرضی سے شادی کروں گی۔ خواجہ عمر نے بھی سلمٰی کے اس مطالبہ کو تسلیم کر لیا تھا۔ اور جب کوئی ان کے ہاں آرزومند ہو کر آتا۔ تو وہ دخل دینے سے انکار کر دیتے۔

اُمِّ سلیم کا سفرِ مکہ

ام سلیم نے کچھ عرصہ خیبر میں گذارا۔ اور کچھ قبا میں۔ اس کے بعد وہ حج کے لئے مکہ مکرمہ روانہ ہو گئی۔ اس سے پہلے بھی وہ ایک بار حج کر چکی تھی۔ مگر ان دنوں وہ بہت چھوٹی عمر کی تھی۔ اب کے وہ بڑے طمطراق سے

جا رہی تھی۔ ڈیڑھ سو عقیدت مند جلو میں تھے کئی شاعر اس کے آگے فخریہ اشعار پڑھتے جا رہے تھے اور کئی نبرد آزما پہلوان اس کے دائیں بائیں ہاتھ میں نیزے سنبھالے اونٹ دوڑا رہے تھے۔ دس دن کے اندر دو سو میل کا طویل سفر طے کر کے یہ مختصر سا قافلہ مکہ میں جا پہنچا۔ ام سلیم نے باب ابراہیم کے قریب شیخ حارث کے گھر میں قیام کیا۔ صبح شام کعبہ میں جا کر طواف کرتی۔ اور پھر خاموشی سے اپنے حجرہ میں آ کر معتکف ہو جاتی۔ شہر کے لوگ اور باہر سے آئے ہوئے حجاج اسے ملنے کے لئے آتے اور اپنی قسمتوں کے بارے میں اس سے سوال کرتے رہتے۔ اس نے صحن کعبہ میں ایک دو مرتبہ خواجہ ہاشم کو دیکھا۔ تو اس کے غیر معمولی حسن و جمال کو دیکھ کر مبہوت رہ گئی۔ اس نے حارث سے آپ کی بابت دریافت کیا۔ حارث نے کہا۔

"کہ یہ شیخ ہاشم عرب کے سردار اور کعبہ کے متولی ہیں۔ کبھی کبھی ان کے ماتھے پر خاص قسم کی تجلّی چمک اٹھتی ہے۔ جس کے بارہ میں مشہور یہ ہے کہ یہ نبی آخر الزمان کا نور ہے۔ جس کے ظاہر ہونے کا وقت بہت قریب آ گیا ہے۔ شیخ نے اس نور کے انتقال کے لئے تین شادیاں کی ہیں مگر یہ نور منتقل نہیں ہوا ——— اس لئے وہ ان دنوں خاص طور پر ملول رہتے ہیں"۔

ام سلیم کا ذہن سلمیٰ کی طرف منتقل ہوا۔ اور وہ آپ ہی آپ زیر لب کچھ بڑبڑانے لگی۔ حارث نے پوچھا۔

"اے مخدومہ! تیرا علم کیا کہتا ہے۔ کیا اس قسم کا کوئی اعجاز ظہور میں آنے والا ہے؟"

ہاں۔ ان لوگوں کا خیال درست ہے۔ میرے پاس جو جن آتے ہیں وہ بھی یہی ظاہر کرتے ہیں۔ کہ اب ہمیں آسمان پر جانے سے روکا جاتا ہے اے حارث! میں شیخ ہاشم سے ملنا چاہتی ہوں۔ کوئی سبیل ایسی پیدا کرو کہ میں گھڑی دو گھڑی ان سے باتیں کروں کاہنہ نے حارث کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔

حارث نے کہا۔ آج کل وہ بہت معروف ہیں۔ جب حجاج اور زوار واپس چلے جائیں گے۔ تب وہ اطمینان سے آپ کے ساتھ ملاقات کر سکیں گے

"نہیں حارث! میرے ساتھی اتنا عرصہ یہاں قیام نہیں کر سکتے ہیں ان کا زیادہ وقت نہیں لیتی، ایک اہم مقصد کے پیش نظر میرا ان سے ملنا بہت ضروری ہے۔" کاہنہ نے "ضروری ہے" پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"بہتر۔ میں ابھی جاتا ہوں۔" یہ کہہ کر حارث باہر نکل گیا۔

ام سلیم اور ہاشم کی گفتگو

۵ ذی الحج کو عصر کے وقت حضرت ہاشم حارث کے گھر سے گذر رہے تھے کہ حارث نے لپک کر ان سے مصافحہ کیا۔ اور فرطِ محبّت سے ہاتھ چومے آپ اس وقت جلدی میں تھے۔ پندرہ بیس آدمی بھی آپ کے ہمراہ تھے لیکن آپ ٹھہر گئے۔ اور پوچھا حارث کہو۔ کیا حال ہے۔ ؟ سنا ہے تمہارے ہاں مدینہ سے مہمان آئے ہیں تم غریب آدمی ہو۔ دونوں وقت ہمارے ہاں سے کھانا منگوا لیا کرو۔

حارث نے دست بستہ عرض کی حضرت! میرے ہاں مدینہ کی مشہور کاہنہ ام سلیم اُتری ہوئی ہے۔ وہ بہت مالدار خاتون ہے سب خرچ اُسی کا ہو رہا ہے۔ اور وہ آپ سے ضروری طور پہ ملنا بھی چاہتی ہے۔!"

"چلو میں ابھی مل لیتا ہوں ——— !" حضرت ہاشم حارث کے ہمراہ کاہنہ کے مختصر سے حجرے میں داخل ہوئے۔ اُس نے ستاروں میں ماہ کامل کی طرح جگمگاتے ہوئے حسین و جمیل نوجوان کو اندر آتے دیکھا۔ تو اس کے رعب حسن سے متاثر ہو کر سرو قد کھڑی ہو گئی۔ ہاشم نے دیکھا کہ ایک ادھیڑ عمر کی خوش پوش خاتون اسے خوش آمدید کہنے کے لئے آگے بڑھ رہی ہے۔ آپ نے سبقت کر کے سلام کہا۔ اور اس کے پاس ہی غالیچے پہ بیٹھ گئے۔ کاہنہ نے

حارث اور خواجہ ہاشم کے رفقاء کو دوسرے کمرے میں جانے کا اشارہ کیا اور خود حضرت ہاشم کی طرف متوجہ ہو کر۔ بولی۔

"میں مدینہ کی کاہنہ ہوں۔ اور چند یوم سے آپ کے شہر میں مقیم ہوں میں نے صحن کعبہ میں آپ کو دُور سے دیکھا تھا۔ مجھے آپ کے چہرے سے چند ایسی باتیں معلوم ہوئیں۔ جن کی بابت آپ سے ضروری طور پر کچھ دریافت کرنا تھا۔ آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کی آرزو مند تھی۔ لیکن عورت ذات کہاں اور کیسے ملتی! آپ نے کمال احسان کیا۔ کہ خود تشریف لاکر اس ضعیفہ کو ممنون کیا۔ ——!"

حضرت ہاشم نے فرمایا۔ میں آپ کی تشریف آوری کو اس شہر اور اپنے لئے باعث برکت سمجھتا ہوں۔ افسوس ہے۔ اتنے دنوں سے آپ مکہ میں ہیں اور میں آپ کی خدمت سے قاصر ہوں۔ آپ جتنے دن یہاں مقیم ہیں۔ آپ میری مہمان ہیں۔ اگر یہ جگہ تنگ ہو تو میرے ہاں تشریف لے چلئے۔ وہاں وسیع اور کشادہ مکان آپ کو مل جائیگا۔ اور کھانا تو ہر حالت میں میرے ہاں سے ہی کھانا پڑے گا۔

کاہنہ مسکرا کر بولی۔

"مجھے یہاں ہر گونہ آرام میسر ہے۔ اور یہ بھی آپ ہی کا شکر ہے ویسے تبرکاً ایک وقت کا کھانا آپ کے ہاں کھالوں گی۔ اس وقت مجھے آپ سے

اس "نورِ نبوت" کی بابت سوال کرنا تھا۔ جو آپ کے ماتھے پر چمکتا گر ایک آنے والے نبی کی خبر دیتا ہے ——— !"

حضرت ہاشم نے سنجیدہ ہو کر فرمایا۔

"خاتونِ اعظم! میرے قبلہ گاہ نے عالمِ وفات میں فرمایا تھا۔ کہ عنقریب دنیا میں ایک بہت بڑے نبی کو ظہور کرنا ہے۔ اور وہ ہمارے گھرانے سے ہی مبعوث ہوں گے۔ مجھے یہ خوشخبری دی گئی تھی۔ کہ وہ "نورِ نبوت" میرے ماتھے پر ہی چمک رہا ہے۔ میں اس وقت تک تین شادیاں کر چکا ہوں۔ ان سے اولاد بھی ہوئی ہے۔ لیکن جس "نور" کا آپ ذکر کر رہی ہیں۔ وہ کسی میں منتقل نہیں ہوا۔ میں حد درجہ فکرمند ہوں۔ اور اس غم میں گھلا جاتا ہوں کہ کہیں وہ نور میرے ساتھ قبر میں نہ چلا جائے۔ !"

ام سلیم، اگرچہ بڑے غور سے خواجہ ہاشم کی تقریر سن رہی تھی۔ لیکن اس کی نگاہیں جبینِ ہاشمی پر مرکوز تھیں اس قلیل سے وقفے میں دو دفعہ "نورِ نبوت" چمک کر اس کی آنکھوں کو خیرہ کر چکا تھا۔ جونہی حضرت ہاشم نے گفتگو ختم کی۔ اُس نے مسکرا کر کہا۔ عزیز من! تجھے مبارک ہو۔ گوہرِ مقصود کا حاصل کرنا اب چنداں دشوار نہیں رہا۔ میں مدینہ میں ایسی حسینہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آ رہی ہوں۔ جس کی کوکھ میں "نورِ نبوت" کو "انسانی شکل" میں ظاہر ہونا ہے!"

خواجہ ہاشم اس غیر متوقع خبر سے چونک پڑے۔ اُن کی آنکھیں چمک

اُٹھیں۔ اور چہرہ ماہِ کامل کی طرح دمکنے لگا۔ اسی اثنا میں خواجہ ہاشم کے ماتھے سے نورِ نبوت کی ایک ایسی تجلّی ظاہر ہوئی جس سے کاہنہ کا چہرہ "بقعہ نور" بن گیا۔ ام سلیم نے کہا۔ برخوردار! واقعی خاتم الانبیاء کی بعثت کا زمانہ بہت قریب آگیا ہے۔ اسی لئے یہ نور بار بار اپنی تجلّیات پھینک رہا ہے۔ ہاں میں نے جس حسینہ کا ذکر کیا ہے۔ وہ مدینہ کے امیر کبیر عمرو بن زید کی صاحبزادی ہے اگرچہ وہ بیوہ ہے۔ لیکن کمسنی کے سبب شباب کی گوناگوں رعنائیوں کی زندہ تصویر نظر آتی ہے۔ وہ حسن کا لاجواب پیکر اور دستِ قدرت کا بے نظیر شاہکار ہے۔ میں نے اس کے ہاتھوں کی لکیروں کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ اور اس کے اقبال مند چہرے کے خدوخال پر کئی کئی گھنٹے اپنی نگاہیں گاڑ کر بیٹھی رہی ہوں یقین فرمائیے کہ میری آنکھیں سیر نہیں ہوئیں۔ میرے خیال میں وہ آپ کا موزوں جوڑا ہے۔ چونکہ قدرت کو یہی منظور تھا کہ "نورِ نبوت" اسی کی کوکھ میں آرام پکڑے اس لئے اُس کے خاوند کو دنیا سے اُٹھا لیا گیا۔

خواجہ ہاشم فرطِ مسرت سے باغ باغ ہوتے جاتے تھے اور انہیں اب "ام سلیم" کی اہمیت کا احساس ہو رہا تھا۔ فرمایا۔ کہ یہ کام آپ کے سپرد ہے اور میں حج کے فوراً بعد ہی مدینہ کو چل پڑونگا۔ جس طرح آپ نے یہ راہ دکھائی ہے۔ اسی طرح منزلِ مقصود تک پہنچنے میں بھی رہبری کیجئے۔

"آپ بے فکر رہیں"۔ ام سلیم نے دوپٹہ درست کرتے ہوئے کہا۔ وہ لڑکی مجھے خالہ کہہ کر پکارتی ہے اور میں اُسے اپنی بیٹی سے بھی زیادہ پیار کرتی ہوں۔ اس کی ماں مجھے بمنزلہ بڑی بہن کے جانتی ہے۔ یہ سب کام درست ہو جائیگا۔ مگر آپ اس راز کو کسی پر ظاہر نہ کریں۔ اور عاہنہ بہن خوب بن ٹھن کر آئیں سلمیٰ کا باپ ذرا وجاہت پسند واقع ہوا ہے۔"

خواجہ ہاشم کاہنہ کی باتوں میں اس قدر محو تھے۔ کہ انہیں اپنے رفقاء کا بھی خیال نہ رہا۔ ملاقات بڑی طویل ہو چکی تھی۔ اس لئے انہوں نے تنگ آکر حارث کی وساطت سے آپ کو بلوا بھیجا۔ آپ فوراً کھڑے ہو گئے اور ام سلیم کو دوبارہ اپنے ہاں منتقل ہو آنے کی دعوت دی۔ مگر اس نے وہی معذرت پیش کر کے معافی مانگ لی۔ خواجہ ہاشم نے گھر آکر اس کے ہاں مکلّف کھانا بھجوایا۔ اور جب تک وہ مکہ مکرمہ میں مقیم رہی۔ آپ کے لنگر سے اس کے رفقاء کو دونوں وقت کا کھانا ملتا رہا۔

کاہنہ پھر مدینہ میں

حج کے ختم ہوتے ہی ام سلیم حضرت ہاشم سے آخری ملاقات کرنے کے بعد مدینہ روانہ ہو گئی۔ اگرچہ راستے میں اُسے ارادتمندوں نے اپنے ہاں ٹھہرنے پر بہت زیادہ مجبور کیا لیکن وہ سب کے عذر معذرت کرتی چلتی رہی۔ یہاں

تک کہ بارہویں دن وہ اپنے گھر جا پہنچی۔ سلمٰی اس کے انتظار میں تھی۔ اُسے جونہی اس کی آمد کا پتہ چلا خادمہ بھیج کر بلا بھیجا۔

دوسرے دن نہا دھو کر کاہنہ خواجہ عمرو کے گھر گئی۔ سلمٰی اور اس کی والدہ بڑی گرم جوشی سے ملیں اور مکہ مکرمہ کے حالات دریافت کرتی رہیں۔ چونکہ اُمّ سلیم کو سلمٰی سے خاص بات چیت کرنی تھی۔ اس لئے رات کو وہیں رہ پڑی جب تنہائی میں مل بیٹھنے کا موقعہ ملا۔ تو ام سلیم نے سلمٰی کو خوب بھینچ بھینچ کر گلے سے لگایا۔ اور کہا لو اور سنو۔ میں تمہارے ہونے والے شوہر کو دیکھ کر آرہی ہوں۔ جو نہی ام سلمٰی نے ایک شرمیلی ادا کے ساتھ اپنے آپ کو ام سلیم کی گود میں ڈال دیا۔ اور کہا۔

”خالہ اماں! آپ یہ کیسی باتیں کرتی ہیں جب تک میری اور میرے ماں باپ کی رضامندی نہ ہو۔ کوئی میرا شوہر کیسے کہلا سکتا ہے۔ ممکن ہے میں عمر بھر شادی ہی نہ کروں ——— ؟

کاہنہ نے سلمٰی کے منہ پر پیار سے ہلکا سا تھپڑ لگاتے ہوئے کہا۔ تو تو بڑی شریر ہوتی جا رہی ہے۔ کیا کوئی تقدیر سے بھی لڑ سکتا ہے! میں نے مکہ میں ایک ایسے سردار کو دیکھا ہے جس کے ماتھے پر ”نور نبوت“ رہ رہ کر چمک اُٹھتا ہے۔ وہ حسن و جمال میں عرب بھر میں نظیر نہیں رکھتا۔ کعبہ کا متولّی ہے اور حضرت ابراہیم کی تمام اولاد کا امیر ہے۔ اس نے پہلے پہلے

تین شادیاں کی ہیں۔ مگر وہ نو کہیں منتقل نہیں ہوا۔ اب وہ مدینہ آنے کو تیار بیٹھا ہے۔ ہفتہ عشرہ میں اُسے یہاں سمجھو ــــــــــ!"

"توبہ! توبہ!! اری خالہ! کیا تو مجھے تین سوکنوں پر ڈالنا چاہتی ہے ایسے شخص سے تو میں کبھی شادی نہ کروں گی خواہ وہ سونے کا کیوں نہ بن آئے ـــــ!" سلمیٰ نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔

ام سلیم کچھ جھینپ سی گئی۔ اُس نے محسوس کیا کہ سوکنوں کا ذکر کر کے اس نے بڑی غلطی کی ہے مگر ہوشیار عورت تھی۔ فوراً سنبھل گئی۔ کہا سوکنیں ہوئیں تو کیا ہو گیا۔ تم ان پر بھی حکومت کرو گی۔ تمہارے پیٹ سے جو بچہ پیدا ہونے والا ہے۔ وہ شرق اور غرب کو تیرے قدموں میں لا ڈالے گا۔ ام سلیم نے اس قسم کی بہت سی باتیں کیں لیکن ان کا سلمیٰ کے دل پر کچھ اثر نہ ہوا۔ جس طرح رات کے سناٹے میں اچانک گھڑیال کی آواز سنائی دے۔ اور دوبارہ سکوت چھا جائے۔ اسی طرح ایک بار پھر مہیب خاموشی طاری ہو گئی۔

سلمیٰ کا شگفتہ چہرہ پھر مُردہ ہو چکا تھا۔ وہ دم بخود بت بنی بیٹھی تھی اکی کھلی ہوئی نظریں کسی گہری سوچ کے اتھاہ سمندر میں غواصی کرتی دکھائی دیتی تھیں۔ فضا میں بھیانک سکوت چھا رہا تھا۔ اُم سلیم نے کچھ دیر سوچنے کے بعد اچانک زبان کو جنبش دی۔

"واہ سلمیٰ ــــ! دیکھ لیا تیرے دل گردے کو۔ اتنی سی بات بھی برداشت نہ کر سکی۔ اری نادان! میں تو تیرے ساتھ مذاق کر رہی تھی۔ بھلا کوئی بیاہا ہوا شخص بھی اڑھائی سو میل کا سفر طے کر کے یہاں تیری خواستگاری کیلئے آسکتا ہے! ذرا عقل کے ناخن لو ــــ!!

اور اگر خدانخواستہ ایسا کوئی شخص آبھی جائے۔ تو یہ تیری مرضی کا سودا ہے چاہے قبول کرے چاہے انکار کر دے۔ زبردستی تھوڑی ہے۔!"

ان باتوں سے سلمیٰ کا حوصلہ پھر بندھ گیا۔ اور وہ بے اختیار کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ دوسرے دن صبح کو ام سلیم بیم ورجا کے عالم میں لٹھیا ٹیکتی گھر کو روانہ ہو گئی۔

خواجہ ہاشم کی مدینہ کو پُراسرار روانگی

۱۵ ذی الحج کو جناب ہاشم نے اپنے چچازاد بھائی وھب بن عبد قصیٰ کو بلا کر کہا۔ بھتیجے تجھے میرے ساتھ مدینہ چلنا ہے۔ آج اور کل کی مہلت ہے۔ پرسوں چاند نکلنے پر ہم یہاں سے روانہ ہو جائینگے۔"

وھب نے حیران ہو کر پوچھا "آخر اس قدر جلد کوچ کرنے کی وجہ۔؟"

یہ تمہیں مدینہ میں ہی بتاؤنگا۔ جناب ہاشم نے جواب دیا۔

وھب نے زیادہ کرید نہ کی۔ اور بہت اچھا کہہ کر گھر کو چل دئیے۔ خواجہ

ہاشم نے پانچ چھ اور قریبی رشتہ داروں کو بھی طلب کر کے مدینہ چلنے کیلئے کہا۔کس کی مجال تھی۔کہ انکار کرتا۔سب ساتھ چلنے کو تیار ہو گئے بیس پچیس غلاموں کو بھی ہمراہ جانے کا نوٹس ملا۔اس کے بعد آپ نے اشرفیوں سے بھری ہوئی کئی تھیلیاں۔بے شمار زنانی پوشاکیں قسم قسم کے زیور جمع کر کے اپنے معتمد خاص یوسف کے حوالے کئے۔ایک غلام کو بھیج کر طائف سے اپنی سواری کا خاص اونٹ طلب کیا۔اور ۱۷ ذی الحج کو بیت اللہ کا طواف کر کے تینتیس آدمیوں کا مختصر سا قافلہ مدینہ کو روانہ ہوا۔مکہ مکرمہ سے مدینہ تک پہاڑوں کا لامتناہی سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ان پہاڑوں کی چوٹیوں پر بدویوں کے غول مسافروں کو لوٹنے کے لئے چشم براہ نظر آ رہے تھے۔جناب ہاشم کے رفیقوں میں سے ہر شخص سو بدویوں پر بھاری تھا۔راستے میں ایک دو مقامات پر خفیف سی جھڑپیں ہوئیں لیکن نقصان کچھ نہ ہوا۔اگرچہ مدینہ کا ہولناک سفر بارہ منزلوں سے کم نہ تھا لیکن قریشیوں کا یہ مستعد اور ہوشیار قافلہ رابغ اور ینبوع کے راستے یلغار کرتا آٹھویں دن ذوالحلیفہ جا پہنچا۔یہاں انہوں نے ایک دن قیام کیا۔سفر کی تھکاوٹ دور کی۔اور دوسرے روز دوپہر کے وقت گرمی کے حبس میں دس گھوڑوں اور دس شتر سواروں کا مختصر سا قافلہ ایک عظیم الشان محل کے دروازے پر کھڑا مالک کا انتظار کر رہا تھا۔

جناب وھب نے بڑھ کر ایک غلام سے کہا۔ اپنے آقا کو اطلاع دو کہ مکہ مکرمہ سے کعبہ کے متولی حضرت ہاشم آپ کو ملنے کے لئے تشریف لائے ہیں۔ غلام اندر چلا گیا۔ اور جناب ہاشم اور ان کے رفقاء محل کا جائزہ لینے لگے۔ یہ ایک رفیع الشان قصر تھا۔ جس کے ایک طرف وسیع اصطبل میں عربی اور شامی گھوڑے بندھے تھے۔ دوسری جانب خادموں اور غلاموں کے رہنے کے کمرے تھے درمیانی چبوترے پر مہمان خانہ تھا۔ برآمدے کے باہر شہ نشین پر خواجہ عمرو کی مسند لگی تھی۔ تھوڑی دیر میں ادھیڑ عمر کا ایک باوقار چہرہ محل کی ڈیوڑھی سے برآمد ہوا۔ یہی خواجہ عمرو تھے۔ دونو بازو پھیلا کر اَھْلًا وَّ سَھْلًا کہتے ہوئے حضرت ہاشم کی طرف بڑھے۔ آپ نے لپک کر خواجہ سے مصافحہ کرنا چاہا۔ مگر اس پیکرِ اخلاق نے آپ کو گلے سے چمٹا لیا۔ اسی طرح ایک ایک شخص سے تواضع اور مروّت کے ساتھ مصافحہ کیا۔ غلاموں کو اشارہ کیا۔ کہ جانور لے لو۔ چنانچہ اونٹ اور گھوڑے اصطبل میں بندھوا دیئے گئے۔ غلام غلاموں کے پاس جا بیٹھے اور اعیانِ قریش خواجہ عمرو کے ہمراہ بڑے کمرے میں تشریف لے گئے۔ اس میں ایک بڑا غالیچہ بچھ رہا تھا جس پر تھوڑے تھوڑے فاصلے سے بڑے بڑے تکیے رکھے تھے۔ سب حضرات سہارا لے کر بیٹھ گئے۔ غلاموں نے آبخوروں میں دودھ لا کر پیش کیا۔ جس میں شہد ملی تھی۔ سب نے مزے لے لے کر پیا۔

اس کے بعد خواجہ عمرو نے حضرت ہاشم سے تشریف آوری اور کرم فرمائی کا سبب دریافت کیا۔ آپ نے جناب وھب کی طرف دیکھا۔ وادی تنعیم میں حضرت ہاشم نے تمام رفیقوں کو سفر کے مقصد سے آگاہ کردیا تھا۔ اور وھب سے یہ بھی طے کرلیا تھا۔ کہ میری طرف سے رشتہ کی بات چیت آپ کو کرنی ہے۔ اس لئے انہوں نے حضرت ہاشم کا اشارہ پاکر اس طرح سلسلہ کلام شروع کیا۔

حضرت وہب کی تقریر

اے امیر! ہم لوگ ابراہیم اور اسمعیل علیہم السلام کی اولاد ہیں۔ خداوند کریم نے اپنے مقدس گھر کی تولیت کا شرف ہمیں عطا کیا ہے پہلے ہمارے دادا جناب قصی متولی تھے۔ ان کے بعد میرے چچا عبدالمناف متولی بنے۔ جب انہوں نے سفر آخرت اختیار فرمایا تو یہ سعادت میرے چچازاد بھائی جناب ہاشم کے حصہ میں آئی۔ جو اس وقت آپ کے آگے تشریف رکھتے ہیں

امیر عمرو نے مسکرا کر حضرت ہاشم کو دیکھا۔ اور کہا گذشتہ سال جب میں حج پر گیا تھا۔ تو آپ کے ہاں دعوت تریدمیں شریک ہوا تھا۔ آپ کی زیارت کا شرف حطیم کے پاس حاصل کیا تھا۔ امیر عبدالشمس کا تو غالباً انتقال ہو چکا ہے۔! امیر عمرو نے ذہن پر ذرا زور دیتے ہوئے کہا۔

"ہاں وہ کافی عرصہ سے فوت ہو چکے ہیں اور اُن کا صاحبزادہ اُمیہ شام میں رہتا ہے۔" جناب وہب نے جواب میں کہا۔

خواجہ عمرو نے دوبارہ حضرت ہاشم کے چہرے پر نظر ڈالی اور کہا آپ اور عبدالشمس دو نو جڑواں ہی پیدا ہوئے تھے نہ ۔۔۔! ہم نے سنا تھا۔ کہ آپ کے ماتھے آپس میں جڑے ہوئے تھے اور تلوار سے کاٹ کر آپ دونو کو جدا کیا گیا تھا" حارث بولے۔ صرف ماتھا نہیں۔ بلکہ پیٹ بھی جڑا ہوا تھا۔!

"کاش ان حضرات کے ماتھے تلوار سے جدا نہ کئے جاتے۔ اب ان کی اولاد کے درمیان ہمیشہ تلوار چلتی رہے گی"۔!!

حارث بولے آپ کا گمان درست ہے۔ اس قسم کی پیشین گوئی ایک کاہن بھی بیان کر چکا ہے۔ نیز ہمارے خاندان میں یہ یقین چلا آتا ہے کہ خداوند عالم نے اپنا آخری نبی اس خاندان میں پیدا کرنا ہے پشت بہ پشت ایک شخص ہم میں ایسا ضرور ہوتا ہے جس کے ماتھے سے نور کی تجلیاں اُٹھتی ہیں۔ چنانچہ چچا کے بعد یہ تجلی بھائی ہاشم کے ماتھے پر منتقل ہوئی آپ دیکھتے ہیں۔ ان کا چہرہ ہم سے کئی گنا روشن اور ان کے خدوخال بدرجہا بہتر ہیں۔ مزید برآں ان کے ماتھے سے رہ رہ کر "نور نبوت" چمک اُٹھتا ہے امیر عمرو نے نظر اُٹھا کر حضرت ہاشم کو دیکھا۔ ان کا ماتھا کندن کی طرح دمک رہا تھا۔ خواجہ عمرو کی زبان سے بے اختیار لعظمۃ للہ نکل گیا۔ اور پوچھا۔ کہ

ہاشم ہیں اس کے علاوہ کوئی اور خصوصیت بھی ہے۔
کہا" ہاں۔ یہ بتوں کے آگے نہیں جُھک سکتے۔ کئی بار انہوں نے لات و منات کے آگے سجدہ کرنے کی کوشش کی۔ مگر نورِ نبوت نے سر کو جھکنے نہ دیا۔ اس کے علاوہ حضرت آدم سے ان تک جتنے بزرگ اس "نور" کے امانت دار رہے ہیں۔ ان میں سے کسی کو حرام پر ازار کھولنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ اب چونکہ "نورِ نبوت" کے ظہور کا وقت آگیا ہے۔ اس لئے شادی بیاہ کے معاملے میں حد سے زیادہ احتیاط کی جاتی ہے ہمیں بشارت دی گئی ہے کہ مدینہ پہنچ کر آپ سے خواجہ ہاشم کو فرزندی میں لے لینے کی درخواست کریں۔ تاکہ دلی مراد حاصل ہو۔

یہ سُن کر خواجہ عمرو کی جبین پر شکن پڑ گئی۔ ہر طرف ایک گہرا سکوت طاری ہو گیا۔ کچھ دیر فکر مند رہنے کے بعد۔ خواجہ عمرو نے مہر خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔

"خواجہ ہاشم کعبہ کے متولی اور سیدنا ابراہیم کے ممتاز فرزند ہیں آپ سے رشتہ کرنا میرے لئے انتہائی اعزاز کا موجب تھا۔ مگر مشکل یہ ہے کہ میری لڑکی بیوہ ہو چکی ہے۔ اور اس نے مجھ سے یہ وعدہ لے لیا ہے کہ میں اس کی دوسری شادی کے معاملے میں دخل نہ دوں آج وہ شکار پر گئی ہے۔ جب واپس آئے گی میں خواجہ ہاشم کا معاملہ اس کے آگے رکھونگا

لیکن قبول کرنا نہ کرنا یہ اس کی مرضی پر منحصر ہے۔"

خواجہ وھب نے کہا۔ آپ کا ارشاد بجا ہے۔ یہ لڑکی کی زندگی بھر کا سودا ہے۔ اس کی مرضی کے خلاف کیسے طے پا سکتا ہے۔ ہم بدل وجان یہاں ٹھہرنے کو تیار ہیں۔ لیکن آپ کی تکلیف کا خیال مانع ہے۔

"نہیں خواجہ وھب"۔ خواجہ عمرو نے کہا۔ اگر آپ سال بھر بھی یہاں ٹھہرے رہیں۔ تو بھی مجھے قطعاً کوئی تکلیف نہ ہو گی۔ یہ آپ ہی کا گھر ہے۔ اطمینان سے تشریف رکھیے۔

ام سلیم سے ملاقات

بنو قینقاع سے مدینہ کی آبادی کوئی غیر متعارف نہ تھی۔ بنو نضیر بنو قریظہ اور اوس وخزرج کے قبائل سے ان کی گہری دوستی چلی آتی تھی جب انہیں علم ہوا۔ تو وہ انہیں اپنے ہاں لے گئے۔ ایک رات قبا میں ضیافت ہوئی۔ دوسرے دن جبل سلع کے پاس خوش گپیوں میں وقت گذرا خواجہ ہاشم نے اپنے غلام عامر کو ام سلیم کی تلاش میں بھیجا ہوا تھا۔ اس نے آکر بتایا کہ ام سلیم کا مکان یہیں جبل سلع کی دوسری جانب تلہٹی میں واقع ہے حضرت ہاشم اپنے تمام رفقاء اور غلاموں کو یہیں چھوڑ کر عامر کے ہمراہ سیر کے بہانہ سے ام سلیم کے گھر روانہ ہوئے اور کوئی نصف میل کا چکر کاٹ کر عامر

نے حضرت کو ام سلیم کے گھر لا کھڑا کیا۔

یہ ایک درمیانی درجے کا دو منزلہ مکان تھا۔ نچلے حصے میں ام سلیم کے بال بچے رہتے تھے۔ اوپر کے درجے میں وہ خود اپنا وقت عبادتِ الٰہی میں صرف کرتی تھی۔ پاس ہی ایک منزلہ مہمان خانہ تھا جس میں کاہنہ کے ملاقاتی آکر ٹھہرا کرتے تھے۔ عامر نے ام سلیم کو اطلاع کرائی۔ کاہنہ پہلے سے انتظار میں تھی اس نے لڑکے کے ہاتھ حضرت کی خدمت میں شہد آمیختہ دودھ بھجوایا اور اس کے بعد خود سفید لباس میں ملبوس الصباح بالخیر کہتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ کمرے میں چٹائی کا فرش بچھ رہا تھا۔ اس پر ایک جانب ام سلیم کی مسند تھی۔ پاس ہی بائیں جانب خوشنما غالیچہ پڑا تھا اور اس پر گاؤ تکیہ حضرت ہاشم کے لئے رکھ دیا گیا تھا۔ ام سلیم نے حضرت کو اس پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اور خود اپنی جگہ بیٹھ گئی۔

ام سلیم نے پوچھا "آپ کب تشریف لائے۔؟"

"ہم تین آدمی پرسوں سے آپ کے شہر میں مقیم ہیں"

"اس غادمر پہ کوئی ناراضی تھی۔ کہ یہاں تشریف آوری نہ ہوئی"

افسوس ہے ہم آپ کا مکان تلاش کرنے میں ناصر رہے۔ آپ نے بھی مکہ میں اپنے مکان کا پتہ نہ دیا تھا۔ ورنہ ہم سب سے پہلے یہاں حاضر ہوتے"

"خواجہ عمرو سے ملاقات ہوئی۔ اور انہوں نے کیا جواب دیا۔!"

"سلمیٰ شکار پر گئی ہوئی ہے۔ خواجہ عمرو نے ہماری ساری داستان سننے کے بعد فرمایا۔ کہ اس معاملے میں سلمیٰ خود مختار ہے۔ میں اس میں دخل دینے کے لئے تیار نہیں۔۔!"

"وہ ٹھیک کہتے ہیں۔ مگر سلمیٰ بھی اب مجھ سے بگڑ چکی ہے۔ وہ کہتی ہے۔ میں تین بیویوں والے شوہر سے شادی نہیں کر سکتی۔۔!"

"آپ نے بڑی غلطی کی۔ اُس سے پہلی بیویوں کا ذکر کرنا کیا ضرور تھا۔" حضرت ہاشم نے پژمردہ اور ملول ہو کر کہا۔

"اے رئیس عرب! فکر مند نہ ہوجیئے" کاہنہ مسکرا کر بولی۔ تقدیر تم دونو کا آپس میں ہونا جوڑ چکی ہے۔ سلمیٰ کی کیا مجال کہ انکار کرے۔ دیکھئے پردۂ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے۔ اُمید ہے آج سلمیٰ شکار سے واپس آجائیگی۔ اُس کے آنے سے پہلے آپ ان کے مہمان خانہ میں موجود رہیں۔ تاکہ رشتہ کی بات چیت ہونے سے پہلے وہ ایک نظر آپ کو دیکھ لے۔"

آپ درست فرماتی ہیں میں اپنے احباب اور رفقار کو لے کر ابھی خواجہ عمرو کے مکان پر چلتا ہوں۔ یہ کہہ کر حضرت ہاشم نے ام سلیم سے مصافحہ کیا۔ اور عامر کو ہمراہ لے کر واپس روانہ ہوئے۔

سلمیٰ کی آمد

حضرت ہاشم اپنے رفقار کو ساتھ لے کر پہر دن کے قریب خواجہ عمرو کے دولتکدہ پر پہنچ گئے۔ خواجہ عمرو گویا انتظار میں تھے۔ بڑے تپاک سے ملے۔ کہنے لگے۔ خلاف دستور سلمیٰ نے اس دفعہ شکار پر کافی دیر لگادی ہے دیکھئے شاید آج آجائے۔ ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ڈیوڑھی سے گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز سنائی دی اور ساتھ ہی چند خوبرو کمسن سوار گھوڑوں سمیت اندر داخل ہوئے۔ گھوڑے پسینے سے شرابور ہو رہے تھے اور انکے گلفام چہروں سے سرخی جھلک رہی تھی۔ حضرت ہاشم کو علم ہو چکا تھا۔ کہ سلمیٰ مردانہ لباس میں شکار کو جایا کرتی ہے۔ اس لئے وہ پہلی نظر میں ہی بھانپ گئے کہ ان میں سے گوہر مقصود کون ہے۔ سلمیٰ سرتاپا لوہے میں غرق ایک مضبوط عراقی گھوڑے پر سوار تھی۔ والد کو اجنبی مہمان کے ساتھ کھڑا دیکھ کر پھرتی سے نیچے اُتر آئی اور اس کے ساتھ دوسری لڑکیاں بھی اُتر پڑیں گھوڑے غلام اصطبل میں لے گئے اور سلمیٰ نے ادب سے آکر خواجہ عمرو کو سلام کیا کہا" اباجان! یہ صاحب کون ہیں۔؟"

خواجہ نے مسکرا کر کہا "بیٹا! یہ کعبہ کے متولی اور مکہ مکرمہ کے سردار حضرت ہاشم ہیں۔ اور تمہیں ملنے کے لئے یہاں تشریف لائے ہیں۔

سلمیٰ کا ذہن ام سلیم کے مطالعے کی طرف منتقل ہوا۔ اس نے تین بیویوں کے تخیل سے ایک جھرجھری سی لے کر اوپری نظر سے حضرت ہاشم کو دیکھنے کے لیے آنکھ اٹھائی۔ درمیانہ قد کا ایک حسین وجمیل نوجوان مسکراتا ہوا سامنے کھڑا تھا۔ وہ مردانہ حسن کا مکمل نمونہ تھا۔ بلند قامت، بھرا ہوا جثہ چوڑا سینہ۔ سرخ وسپید چہرہ، مسکراتی ہوئی چمکیلی آنکھوں نے سلمیٰ کے دل ودماغ میں اک آگ سی لگادی۔ رعب حسن سے وہ اس قدر مرعوب ہوئی کہ حضرت کے خدوخال کا دیرتک جائزہ نہ لے سکی۔ خواجہ عمرو سے بولی۔ اگر اجازت ہو۔ تو خادمہ اندر جاکر لباس بدل لے"۔

"ہاں بیٹا! جاؤناں۔ مگر یہ تو بتاؤ۔ کہ اس دفعہ کس کس چیز کا شکار ہوا!"

ابا جان اس علاقے میں ہرن اور خرگوش کے سوا کیا مل سکتا ہے ہر گھوڑے کے شکار بند کے ساتھ کچھ نہ کچھ شکار بندھا ہے۔ کھلوا لیجیے۔

یہ کہہ کر سلمیٰ اٹھلاتی ہوئی محل میں داخل ہوگئی۔

خواجہ عمرو نے حضرت ہاشم کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہا۔ یہ میری لاڈلی سلمیٰ ہے۔ مجھے بہت عزیز ہے۔ میرے دل کی کائنات اسی سے آباد ہے۔ ہم میاں بیوی اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں۔ آج اسے آنے میں ذرا دیر ہوگئی۔ تو ہمارا کھانا چھوٹ گیا۔ تو مکہ جیسے دور دراز مقام پر اسکی شادی کیسے ہوسکتی ہے۔ اگر ہو بھی جائے۔ تو ہمارا کیا حشر ہوگا ——— !

حضرت ہاشم کا دل مسرّت و انبساط سے لبریز تھا۔ آج ان کی رگ رگ سے خوشی کے نغمے پھوٹ رہے تھے۔ ان کے لبوں پر محبت پاش تبسم کھیل رہا تھا۔ اور ان کی سیاہ موٹی موٹی آنکھیں وفورِ مسرّت سے چمک رہی تھیں۔ ان میں سلمیٰ کا زہرہ شکن حسن سمو کر رہ گیا تھا۔ وہ اس کے متعلق جو تصور لے کر آئے تھے۔ یہ اس سے بھی کئی گنا زیادہ حسین ثابت ہوئی۔ انتہائی ادب اور احترام کے ساتھ خواجہ عمرو سے کہا۔ میں ہر قیمت پر آپ سب حضرات کو راضی رکھنے کی کوشش کروں گا۔ کسی قسم کے اندیشہ کو خاطر میں نہ لایئے۔

بہتر۔ میں اندر جا کر سلمیٰ سے بات چیت کرتا ہوں۔ آپ آرام کریں۔ یہ کہہ کر خواجہ عمرو زنان خانے میں تشریف لے گئے۔

شادی کی تحریک

سلمیٰ نہا دھو کر کنگھی شیشہ کر رہی تھی کہ خواجہ عمرو زور زور سے کھانستے ہوئے اس کے کمرے میں داخل ہوئے۔ سلمیٰ نے فوراً سر پہ دوپٹہ ڈال دیا۔ اور کنگھی کو طاقچے میں رکھ کر مؤدب ہو بیٹھی۔ اُسے معلوم تھا کہ ابا کس مقصد سے آئے ہیں۔ اس وقت اس کے دل میں دو متضاد قوتیں برسرِ پیکار تھیں حضرت ہاشم کا جمال بے مثال تقاضا کرتا تھا۔ کہ ان کے ساتھ محبت کا پیمان استوار کر لیا جائے۔ لیکن جب تین سوکنوں کا خیال آتا۔ تو اس کا نازک سا دل

سہم کر رہ جاتا۔ خواجہ عمرو نے پیار سے سلمیٰ کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا بیٹی! میں تیرے ساتھ اقرار کرتا ہوں۔ کہ شادی کے معاملے میں ہرگز ہرگز اپنی رائے کو دخل نہ دونگا۔ اپنے وعدہ کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے تمہیں صرف یہ اطلاع دیتا ہوں۔ کہ کعبہ کے متولی حضرت ہاشم جو باہر میرے ساتھ کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ کالے کوسوں کا سفر طے کر کے یہاں اس لئے آئے ہیں کہ تیرے ساتھ شادی کی بات چیت کریں۔ اپنے معاملے پر غور کر۔ اگر یہ رشتہ منظور ہو۔ تو ہم تیرا ان سے نکاح کر دیں۔ ورنہ معذرت کر کے انہیں رخصت کریں۔!"

سلمیٰ نے عرض کی۔ ابا جان۔ مجھے یہ رشتہ قبول کرنے میں کوئی عذر نہ تھا۔ لیکن اس میں دو قباحتیں ہیں۔ ایک یہ کہ سسرال اڑھائی سو میل دور ہے۔ اور میں آپ سے بچھڑ کر زندہ نہیں رہ سکتی۔ دوسرے یہ کہ جو صاحب شادی کے خواستگار ہو کر آئے تین جوان بیویاں پہلے سے ان کے گھر میں موجود ہیں اور خیر سے آپ تین صاحبزادوں کے باپ بھی ہیں۔

خواجہ عمرو نے حیران ہو کر کہا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

"آپ کی لونڈی صحیح عرض کر رہی ہے"

تمہیں کیسے معلوم ہوا ———؟

"ابا جان! مجھے ان کے آنے سے پہلے سب کچھ بتا دیا گیا تھا۔ آپ

دریافت کر کے تسلی کر سکتے ہیں ـــــ!"

خواجہ عمرو جھنجھلا کر باہر نکل آئے۔ حضرت ہاشم اپنے رفقا کے ساتھ جواب کے بارہ میں طرح طرح کے قیاس دوڑا رہے تھے کہ خواجہ عمرو تشہد کرتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔ اور برہم ہو کر بولے "واہ بھئی واہ آپ نے مجھے ناحق پریشان کیا۔ تین بال بچوں والی بیویاں گھر میں چھوڑ کر آپ میرے ہاں چڑھ دوڑے۔ اور اتنا بھی نہ سوچا کہ خواجہ عمرو کا گھرانا پہلے سے مصیبت زدہ ہے۔ اس سے مذاق اچھا نہیں۔!"

امیر وھب نے کہا "حضرت! خفگی نہ فرمایئے۔ اگر آپ رشتہ کرنا نہیں چاہتے تو نہ سہی۔ ہم چلے جاتے ہیں لیکن آپ کو بگڑ کر مہمان نوازی کے اصول کو فراموش کرنا نہیں چاہیئے۔ یہ مرضی کا سودا ہے۔ ہمیں یہ رشتہ مطلوب تھا۔ اڑھائی سو میل کا سفر آٹھ دن میں لپیٹ کر یہاں آ پہنچے آپ کو اگر منظور نہیں ہے تو انکار کر دیجیئے۔ اللہ اللہ! خیر سلا!!!

"امیر وھب کے بچے تلے جواب نے خواجہ عمرو کا پارہ ٹھنڈا کر دیا بولے میرا مقصد یہ تھا۔ کہ جب گھر میں تین جوان بیویاں موجود ہیں۔ چوتھی کو گھر لانے سے کیا فائدہ!"

صاحب من! میں نے یہ پہلے سے ہی آپ کے گوش گذار کر دیا تھا کہ عنقریب دنیا میں ایک نبی کو ظاہر ہونا ہے اور اس کے ظہور کے لئے

حضرت ہاشم کا آپ کی صاحبزادی کے ساتھ نکاح ہونا لازمی ہے۔ یہ امر مقدر ہے۔ اور ہو کر رہے گا۔ اس میں آپ کی یا ہماری رضامندی کوئی معنی نہیں رکھتی۔

خواجہ عمرو یہ سن کر کچھ سوچ میں پڑ گئے اور بغیر کچھ کہے سنے بیٹی کی طرف چل دیئے۔ سلمیٰ باپ کی آہٹ پا کر بستر پہ اٹھ بیٹھی۔ خواجہ نے کہا بیٹی یہ لوگ تو کچھ عجیب و غریب باتیں کرتے ہیں۔ کہتے ہیں۔ دنیا میں ایک نبی کی آمد آمد ہے جس کی ماں آپ کی صاحبزادی نے ہی بننا ہے۔ اور یہ ہو کر رہیگا۔

ابا جان! اس قسم کی باتیں مجھے بھی خالہ اماں نے سنائی تھیں۔ اگر وہ میری تین شرطیں مان لیں۔ تو میں ان کے عقد میں آنے کو تیار ہوں ایک یہ کہ میں والدین کے گھر کو چھوڑ کر مکہ نہیں جاؤنگی۔

دوسرے میری اولاد کو مکہ لے جانے کی اجازت نہیں ہو گی۔

تیسری شرط یہ ہے کہ وہ مدینہ میں گاہ بگاہ ضرور آیا کرینگے۔

ہاں۔ یہ تو واجبی شرائط ہیں۔ میں ابھی جا کر ان سے یہ معاملہ طے کرتا ہوں چنانچہ خواجہ عمرو نے آ کر یہ شرطیں حضرت ہاشم اور امیر وصب کو کہہ سنائیں۔ امیر وصب نے مستفسرانہ انداز میں حضرت ہاشم پر نظر کی۔ آپ نے فرمایا مجھے یہ تینوں شرطیں منظور ہیں۔ اس پر خواجہ عمرو کے چہرے مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ وہ شاداں و فرحاں اٹھے۔ بیٹی اور بیوی کو حضرت ہاشم کے

جواب سے اطلاع دی۔ اب معاملہ صاف تھا۔ خواجہ عمرو نے اسی وقت اعیان مدینہ کو طلب کر کے سلمیٰ کا نکاح حضرت ہاشم سے پڑھ دیا۔ زیورات اور عمدہ عمدہ لباس جو حضرت مکہ مکرمہ سے ساتھ لاتے تھے جب وہ خوانوں میں رکھ کر مجلس نشاط میں پیش کیے گئے۔ تو سب دنگ رہ گئے۔ اور وہ سمجھے کہ واقعی حضرت ہاشم اپنی قوم کے سردار اور مکہ مکرمہ کے رئیس ہیں۔ ہفتہ بھر خواجہ عمرو کے گھر میں سلمیٰ کی شادی خانہ آبادی کا ہنگامہ برپا رہا۔ اس کے بعد قریشی قافلہ تو بڑی شان شوکت کے ساتھ مکہ کو لوٹ گیا۔ اور حضرت ہاشم و سلمیٰ کی پیاسی روحیں آسودگی کے دامن میں راز و نیاز میں محو ہو گئیں۔

سلمیٰ مکہ مکرمہ میں

سلمیٰ حسن و جمال، شکل و صورت اور عقل و دانش کے لحاظ سے اپنا جواب نہیں رکھتی تھی اس نے حضرت کے دل کو فولادی زنجیروں سے جکڑ کر اپنا بنا لیا تھا۔ اور خود بھی حضرت کی محبت میں اس قدر کھوئی جا چکی تھی کہ جب انہوں نے مکہ جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ تو یہ بھی ساتھ چلنے کو تیار ہو گئیں خواجہ عمرو نے جب بیٹی کا رجحان اس طرف دیکھا۔ تو انہوں نے مکہ جانے کی اجازت دے دی۔ چنانچہ ایک ساعتِ سعید میں نورِ نبوت کے امانت دار مکہ مکرمہ کو روانہ ہوئے۔ چند غلام خیمے اور شامیانوں کے ساتھ آگے چل

رہے تھے جب آپ منزل پر پہنچتے۔ وہاں خیمہ نصب ہوتا اور خادم کھانا پکاتے ہیں مصروف نظر آتے۔ فرنیچر کا دوسرا سٹ منزل پہ پہنچتے ہی آگے روانہ کر دیا جاتا۔ میاں بیوی الگ الگ اپنے گھوڑوں پہ سوار تھے۔ آرام و اطمینان سے سفر طے ہو رہا تھا۔ کہیں کہیں شکار سے بھی دل کو بہلا لیتے تھے۔ چند دنوں میں بی بی سلمیٰ مکہ مکرمہ پہنچ گئی اور خدا کے باعظمت گھرانے کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔

یہاں آ کر حضرت ہاشمؓ نے نہایت وسیع پیمانے پر ولیمہ کی دعوت کی جس میں طائف۔ جدہ اور مکہ مکرمہ کی غالب آبادی شریک تھی۔ اس کے بعد اپنی رفیقۂ حیات کو جبل نور کی زیارت کرائی۔ جہاں آدم علیہ السلام عبادت کیا کرتے تھے۔ اور جس پہ ہابیل اور قابیل نے اپنی اپنی نذریں رکھی تھیں چند صفا۔ مروہ یعنی سیدہ ہاجرہ کی ابتلا کی یادگار۔ منیٰ جہاں سو برس کے پیرمرد حضرت ابراہیم نے اپنے لخت جگر کو لٹا کر اللہ کی راہ میں قربان کرنا چاہا تھا۔ مزدلفہ جہاں حضرت آدم اور بی بی حوا پہلی دفعہ ملے۔ عرفات میں جا کر رحمت کی وہ پہاڑی دکھائی۔ جہاں حضرت آدمؑ کی توبہ قبول ہوئی تھی سلمیٰ صرف بہادر ہی نہیں تھی۔ بلکہ اس کو علم و ادب سے بھی کافی لگاؤ تھا۔ وہ توریت اور انجیل کی عالمہ تھی۔ اسے تاریخی مقامات سے دلی وابستگی تھی مکہ مکرمہ کا ہر کنکر اور ہر ذرہ تاریخ کے ہزاروں واقعات کو اپنے دامن میں سمیٹے پڑا تھا

وہ اپنے دلنواز شوہر سے ان پہاڑوں اور چٹیل میدانوں کی بابت تاریخی حکایتیں سن کر لطف اندوز ہوتی تھی۔ اس نے مکہ کا مشہور قبرستان المعلاۃ بھی جا کر دیکھا جس میں خاندان قریش کے نامی گرامی سردار کل من علیہا فان کی چادر تانے محو خواب تھے۔ حضرت ہاشم اپنے والد ماجد حضرت عبدالمناف کی قبر پر کافی دیر تک کھڑے آنسو بہاتے رہے۔ انہوں نے واپسی پر حجون کی وہ پہاڑی بھی دکھائی۔ جہاں تک بی بی ہاجرہ حضرت ابراہیمؑ کے پیچھے دوڑتی چلی آئی تھی۔ اور جہاں حضرتؑ نے کعبہ کی طرف منہ کر کے حضرت اسمٰعیل اور اس کی اولاد کے لئے دعا فرمائی تھی۔ کچھ دن میاں بیوی نے طائف کی بینہ سواد بستی میں بسر کئے۔ سلمیٰ اس کی ہریالی اور شادابی کو دیکھ کر متعجب ہوئی۔ انہی ایام میں "نور نبوت" حضرت ہاشم کے ماتھے سے بی بی سلمیٰ کی کوکھ میں منتقل ہو آیا۔ جس پر حضرت نے سلمیٰ کو سیر و تفریح کے لئے باہر لے جانا ترک کر دیا۔ ایک رات بی بی نے خواب میں دیکھا کہ خواجہ عمرو کہہ رہے ہیں "واہ بیٹی! تو نے مکہ جا کر بوڑھے ماں باپ کو بھی بھلا دیا ——— !"

سلمیٰ کا دل والدین کے لئے بیتاب ہو گیا۔ حضرت ہاشم سے کہا کہ میرا دل ماں باپ کے لئے سخت اداس ہے اور زچگی کے ایام بھی قریب آ رہے ہیں۔ بہتر ہے کہ آپ مجھے بہت جلد مدینہ پہنچا دیں"۔ نازبردار شوہر مکہ میں ناساز کاروبار اپنے بھائی مطلب کے سپرد کر کے اسے لے کر مدینہ چل پڑا۔

واقعی خواجہ عمرو اور اس کی بیوی ریحانہ سلمٰی کے فراق میں ماہی بے آب کی طرح پڑے تڑپ رہے تھے۔ سلمٰی کو ہرا بھرا دیکھ کر بہت خوش ہوتے ام سلیم کو پتہ چلا تو وہ ملنے آئی۔ اور دیر تک سلمٰی سے رازدارانہ بات چیت کرتی رہی سلمٰی نے بتایا۔ کہ جب سے "نورِ نبوت" میرے ہاں منتقل ہوا ہے میرے کانوں میں عجیب و غریب آوازیں آتی ہیں۔ کبھی کبھی دائیں بائیں سے السلام علیک یا نبی اللہ سنائی دیتا ہے۔ ام سلیم نے کہا۔ کہ خدا کے مقرب فرشتے "نورِ نبوت" کو سلام کرتے ہیں۔ ابھی تم نے کیا دیکھا ہے آگے چل کر ایسے ایسے کرشمے دیکھو گی۔ کہ حیران رہ جاؤ گی۔

شیبۃ الحمد

نویں مہینے سلمٰی کے پیٹ سے ماہ چہاردہم سے بھی زیادہ خوبصورت بچہ پیدا ہوا۔ جس کا آدھے سے زیادہ سر سفید تھا جب دایہ نے ننھے کو نہلا دھلا کر حضرت ہاشم کے پیش کیا۔ تو آپ نے گود میں لے کر پیار کیا اور شیبۃ الحمد نام رکھا۔ حضرت بچے کو ہاتھوں پر اٹھائے غور سے دیکھ رہے تھے کہ اچانک اس کے ماتھے سے نور کی تجلی چمک اٹھی۔ حضرت نے خوشی سے نعرہ مارا فُزْتُ بِرَبِّ الکعبۃ (خدائے کعبہ کی قسم میں جیت گیا) اب انہیں یقین آیا کہ "نورِ نبوت" مجھ سے بحفاظت تمام اس مولودِ مسعود میں منتقل ہو چکا ہے۔ بچے کو دوبارہ پیار کیا

اور اپنے والد ماجد کے سلام پہنچائے۔ جو انہوں اپنے آخری لمحات میں کہے تھے۔ عالمِ غربت میں ہونے کے باوجود شیبہ کا عقیقہ اتنی دھوم دھام سے کیا گیا۔ کہ اہل مدینہ حیران رہ گئے۔ خواجہ عمرو اسے کو دایہ کے سپرد کرنا چاہتے تھے لیکن ان کی بیگم ریحانہ نے انکار کر دیا۔ کہ بچے کو میں خود پالوں گی۔ خواجہ عمرو نے ہنس کر کہا۔ کہ دودھ اسے کہاں سے لا کر پلاؤ گی۔ آخر ریحانہ بی بی نے ایک ایسی عورت کو شیبہ کی دایہ بننے پر رضامند کر لیا۔ جو اپنے قبیلہ میں دیانتداری اور خدا ترسی کے لحاظ سے اپنی مثال آپ تھی۔ اس نے خواجہ عمرو کے گھر میں رہ کر شیبہ کو دودھ پلانا منظور کر لیا۔ چھ سات ماہ اسی مسرت و شادمانی میں گذر گئے۔ لیکن عیش و عشرت کے لمحات سریع الزوال ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہاشم اور سلمیٰ کی روحوں کو بھی جلد ہی فردوسی ماحول سے اتر کر دکھ درد کی دنیا میں آجانا پڑا۔ صورت حال یہ ہوئی۔ کہ حضرت ہاشم نے تجارت کا ایک قافلہ مرتب کر کے شام کو جانے کا ارادہ کیا۔

شام کا سفر

خدا معلوم کیا وجہ تھی کہ سلمیٰ کا دل اپنے سرتاج کو اس سفر پر بھیجنے کیلئے آمادہ نہ تھا۔

"شیبہ کے ابا ـــــــ" وہ اپنی دلآویز آنکھوں سے بے اختیار نکلنے

ہوئے آنسوؤں کو روکتے ہوئے بولی "اے میری نسوانی کمزوری خیال فرمائیے یا محبت کی زیادتی کا نتیجہ تصوّر کیجئے۔ بہرکیف یہ امرِ واقعہ ہے کہ جب سے آپ نے سفر پر جانے کا ارادہ ظاہر کیا ہے۔ میرا عیش ختم ہو چکا ہے اور طبیعت میں غیر معمولی افسردگی پیدا ہوگئی ہے۔ اگر میرا کہا مانو۔ تو عامر کو قافلے کے ہمراہ بھیج دو۔ وہ دیانت دار ملازم ہے۔ کسی قسم کے نقصان کا خدشہ نہیں ہے آپ کسی حالت میں بھی اس سفر پر نہ جائیں ساتھ ہی اس نے شیبہ کو آگے بڑھایا اور کہا۔ دیکھئے ننھا بھی مچل رہا ہے۔ ہاشم نے اُسے گود میں لے لیا۔ وہ باپ کے چہرے کو گھورتے ہوئے غوں غوں کرنے لگا۔ گویا باپ کو اس ارادہ سے روک رہا تھا۔ ہاشم نے شیبہ کی روشن پیشانی پر بوسہ دے کر سلمٰی کو بغل میں لے لیا۔ کہا۔

لے راحتِ روح! اسبابِ معیشت کے بغیر آدمی بُرا لگتا ہے۔ تجارت ہمارا خاندانی شغل ہے۔ اس کسبِ عزیز کے سلسلہ میں ہر تاجر سفر پر جاتا ہے اگر میں گھر بیٹھا رہوں۔ تو لوگوں میں قسم قسم کی چہ میگوئیاں ہوں گی کہیں گے خواجہ عمرو نے ایک نکھٹو سے رشتہ کیا ہے۔ اور ہاشم کیسا آدمی ہے کہ خسر کے ٹکڑوں پر پل رہا ہے۔ اس لئے ہنسی ہنسی مجھے وداع کرو۔ دیکھو تمہارے چہرے پر افسردگی کی جھلک تک نظر نہ آئے۔ ورنہ میرا سارا سفر پریشانی میں گذرے گا سلمٰی نے ہنسنے کی ناکام کوشش کی۔ وہ ہنسی مگر آنکھوں سے آنسوؤں کی

چھڑی جاری رہی۔

ہاشم گھر والوں سے رخصت ہو کر دیوان خانے میں آئے۔ خواجہ عمرو کھڑے غلاموں کو راستہ کے لیے ہدایات دے رہے تھے۔ ہاشم کو آتا دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولے۔ میں نے زادِ سفر کا ایسا اچھا انتظام کیا ہے کہ فلسطین تک آپ کو کسی چیز کی ضرورت نہ پڑے گی۔ دونوں باتیں کرتے ہوئے محل سے باہر نکلے۔ محل کے پاس ایک صد اونٹ کھجوروں سے لدے بالکل تیار کھڑے تھے۔ پانچ اونٹوں پہ پانی کی مشکیں لدی تھیں۔ چار پہ چھولداریاں اور کھانے پینے کا سامان بندھا تھا۔ عامر، حارث اور زید اونٹوں پہ سوار ہو کر قافلے کے عقب میں اور تیس خدام دائیں بائیں اور آگے آگے چلنے پہ متعین تھے۔ حضرت ہاشم نے سرخ ڈھاٹا سر پہ باندھ رکھا تھا۔ دائیں ہاتھ میں نیزہ اور بائیں میں تیر کمان لے رکھی تھی۔ ترکش بائیں بازو سے لٹک رہا تھا۔ قافلہ آہستہ آہستہ روانہ ہوا۔ سلمٰی اپنے محل کے بلند ترین حصے پہ کھڑی دلنواز شوہر کو دیکھ رہی تھی۔ قافلہ چلتا رہا، چلتا رہا۔ یہاں تک کہ اُحد کی تلہٹی نے اُسے اپنے دامن میں چھپا لیا۔ سلمٰی یاس و حسرت، رنج و غم اور درد و کرب سے آلودہ نظروں کے ساتھ یہ سماں دیکھ رہی تھی۔ اس کا دل ڈوب گیا۔ وہیں منڈیر کے پاس جھکا کہ گر پڑی۔ قسیبہ جو حیرت سے ماں کا منہ تک رہا تھا۔ وہ بھی زمین پہ آ رہا۔ اس کی چیخوں سے ریحانہ کا ذہن سلمٰی

کی طرف منتقل ہوا۔ وہ گھبرا کر اُٹھی اور جلد جلد سیڑھیوں کو طے کرتی اوپر چڑھ آئی۔ دیکھا۔ کہ سلمیٰ چھت پر بے ہوش پڑی ہے اور شیبہ اس کے پہلو سے چمٹا چلّا رہا ہے اس نے بیٹی کو ہوش میں لانے کی ہر چند کوشش کی مگر اس نے آنکھ نہ کھولی۔ لونڈیوں نے دوڑ کر خواجہ عمرو کو اطلاع کی۔ وہ لخلخہ لے کر آئے سلمیٰ کو سنگھایا۔ تب جا کر اسے کچھ ہوش آیا۔

"بیٹا! یہ کیا۔ عرب عورتیں تو اتنی بزدل نہیں ہوا کرتیں۔ تو نے یہ کیا کیا ہمسایہ عورتیں سنیں گی تو کیا کہیں گی۔ خواجہ عمرو نے شفقت سے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ریحانہ نے اپنے نواسے کو گود میں لے رکھا تھا اور خواجہ عمرو اپنی غم نصیب صاحبزادی کو سہارا دے کر نیچے اُتار رہے تھے۔

ہاشم کا انتقال

ہاشم غزہ میں بیمار پڑے تھے۔ ان کا نمک حلال ملازم عامر خرید و فروخت کرتا پھرتا تھا۔ حضرت ہاشم جو سامان مدینہ سے لائے تھے وہ کافی منافع پر فروخت ہو چکا تھا۔ آج عامر نے آکر رپورٹ کی تھی کہ منڈی میں روز بروز گندم کا سٹاک بڑھ رہا ہے۔ اردن کی ترائی سے ابھی اور گندم کے آنے کی امید ہے۔ جناب ہاشم نے علاج میں تو کافی کوشش کی تھی۔ مگر پیچش کا مرض کچھ اس طرح بگڑا کہ کوئی صورت ہی نظر نہ آتی تھی۔ عامر نے سب بیوپاریوں

سے کہہ رکھا تھا۔ کہ جب میرے آقا شفایاب ہونگے تو اتنی گندم خریدیں گے کہ آپ کی منڈیاں خالی ہو جائیں گی۔ کاروباری لوگ روز آکر مزاج پرسی کرتے تھے۔ آپ کے دوست شیخ جعفر نے بھی آپ کی تیمارداری میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی تھی۔ غزا کے مشہور طبیب شیخ ناصر روزانہ آپ کو دیکھنے آتے تھے۔ لیکن مرض تھا کہ روز بروز بڑھتا جارہا تھا۔ جب مایوسی کے آثار ظاہر ہوئے تو عامر کو قریب بلا کر کہا۔

"عامر! معلوم ہوتا ہے۔ کہ میرا وقتِ آخر قریب آچکا ہے۔"

عامر غم سے ڈوب گیا۔ اور مہربان آقا کی زبان سے یہ الفاظ سن کر بے اختیار رو پڑا۔ گلوگیر ہو کر بولا:۔

"خداوند! آپ پردیس میں یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ خدا پر بھروسہ رکھئے جو درخشاں ستارہ آپ کے مطلع پر طلوع ہوا ہے۔ کیا قدرت اُسے نصف النہار پر چمکنے کا موقعہ نہ دیگی۔!"

حضرت ہاشم نے حسرت بھری نگاہوں سے عامر پر نظر کرتے ہوئے کہا

"عامر! جس دُرخشاں ستارے کا انتظار تھا۔ وہ حجاز کے مطلع پر طلوع کرچکا ہے۔ روز بروز اس کی تابندگی اور دُرخشانی میں اضافہ ہوتا رہیگا۔ میری کیا ضرورت ہے؟" حضرت کی زبان خشک ہو چکی تھی۔ پیڑیاں جم چکی تھیں۔ بولتے بولتے تھک گئے۔ عامر نے پانی کا پیالہ پیش کیا۔ ایک دو گھونٹ

پی کر آپ نے عامر کے کندھوں پہ ہاتھ رکھ کر فرمایا۔

عامر! طبیعت بگڑتی جا رہی ہے اور میں تجھ سے ایسے عالم میں خطاب کر رہا ہوں۔ جبکہ موت کا فرشتہ دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔ اس لئے جو کچھ میں کہوں۔ اُسے غور سے سن کر عمل کرنے کی کوشش کرنا۔

میری پہلی وصیت یہ ہے۔ کہ جب میں فوت ہو جاؤں۔ مجھے اسی شہر میں کسی موزوں مقام پر دفن کر دینا۔

دوسرے مکہ مکرمہ پہنچ کر حضرت نزار کا علم اور حضرت اسمٰعیل کی کمان میرے بھائی مطلب کے سپرد کرنا۔ اُسے کہنا کہ جب تک شیبہ جوان نہیں ہوتا آپ ہی کعبہ کے متولی ہیں۔ میری جائیداد منقولہ و غیر منقولہ سب یتیم کا مال ہے۔ اس کا خیال رکھئے گا۔ حج کے موقعہ پہ مجلس طعام ترتیب دینا کعبہ کے متولی کے لئے سب سے زیادہ ضروری ہے ——— !

یہاں پہنچ کر حضرت ہاشم نے پھر پانی مانگا اور ایک دو گھونٹ پی چکنے کے بعد پھر کہنا شروع کیا۔

عامر! یہاں سے جو غنیمت مل سکے۔ اسے واجبی نرخ پر خرید لینا۔ دس اونٹ کپڑوں کے بھی خرید لو۔ مدینہ میں مصری اور دمشقی کپڑا زیادہ پسند کیا جاتا ہے۔ اہل مدینہ کے مذاق سے تم بخوبی واقف ہو۔ جس کپڑے کی چلت زیادہ دیکھو وہی خریدو۔ میرا دماغ اب کام نہیں کر رہا ہے یہ کام تمہاری

مرضی پر چھوڑتا ہوں۔ یہ سب سامان مدینہ پہنچ کر سلمیٰ کے حوالے کرنا اور کہنا کہ تیرا شوہر عالمِ غربت میں جب اپنی جان "جان آفرین" کے سپرد کر رہا تھا اس وقت بھی اُسے تیرے خیال نے بے چین کر رکھا تھا۔ ہاں ——— اور اُسے کہنا شیبہ کی تعلیم و تربیت میں کسی قسم کا نقص نہ آنے پائے ——— بس عامر میری یہی وصیت ہے۔ اتنا کہہ کر ہاشم ہانپنے لگ گئے۔ تنفّس تیز ہونے لگا۔ ایک دفعہ پھر عامر کی طرف نگاہ کی۔ عامر سلمیٰ سے کہنا۔ افسوس ہے میں تیری کوئی خدمت نہیں کر سکا۔ اگر دل میں کوئی رنج ہو۔ تو خدا کے لئے معاف کرنا۔ اس کے بعد غلاموں کو طلب کر کے کافی انعام مرحمت کیا۔ اور پھر اللہ اللہ کرنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ عصر کے قریب طائرِ روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گیا۔ عامر نے عالمِ غربت کے باوجود اپنے مالک کا جنازہ بڑی شان سے اُٹھایا۔ شہر کے تمام بیوپاری اور دوسرا جنازے میں شریک تھے شہر کے باہر ایک مرتفع جگہ پر مکہ مکرمہ کے روحانی تاجدار کو سپردِ خاک کر دیا گیا۔

انتظار کی گھڑیاں

سلمیٰ اپنے محبوب شوہر کا شدت سے انتظار کر رہی تھی۔ روزانہ شیبہ کو لے کر محل پر چڑھ جاتی۔ اور شام کی راہ دیکھتے دیکھتے شام کر دیتی۔ خواجہ عمرو اپنی بچّی کی بے چینی کو دیکھ کر دل ہی دل میں کڑھتے اور اس کی ڈھارس

بندھاتے تھے۔ مگر سلمٰی کو صبر و قرار کہاں۔! کھانا پینا بند ہو چکا تھا یہ سرِ و شکار کا بھول کر بھی خیال نہ آتا تھا۔ رہ رہ کر والد سے پوچھتی۔

"ابا جان! شام کا سفر کتنے روز کا ہے؟"

سامانِ تجارت کی خرید و فروخت میں کتنا وقت لگنا چاہیئے۔!

وہ فرماتے "بیٹیا! فکر کی کوئی بات نہیں۔ اس سفر پہ چار یا پانچ ماہ بالعموم لگ جاتے ہیں۔ کیا تمہیں یاد نہیں۔ شیخ اسمٰعیل پورے چھ ماہ وہاں لگا کر آئے تھے۔ پھر شام کی سرسبزی اور دلفریبی بھی تو کچھ معنی رکھتی ہے۔ کیا تو نے نہیں سنا! ایک شاعر کہتا ہے ؎

وَاَمَّا دِمَشْقُ فَجَنَّۃٌ ۔۔۔ یُنْسِی بِھَا وَطَنُ الْغَرِیْبُ

یعنی دمشق کا کیا کہنا وہ تو جنت ہے۔ یہاں مسافر بھی آکر اپنے وطن کو بھول جاتا ہے۔

سلمٰی شرما کر کہتی۔

"ابا جان! مگر وہ جہاں کہیں بھی جائیں گے شیبہ کی محبت انہیں چین نہیں لینے دے گی۔!!"

خواجہ عمرو شیبہ کے گالوں کو تھپتھپاتے ہوئے کہتے۔

"کیوں شیبہ! سچ ہے؟"

بچہ شوخی سے ابّا ابّا کرنے لگتا اور وہ دونوں بے اختیار ہنس پڑتے۔

ایک رات سلمیٰ شبیبہ کو پہلو میں لئے پلنگ پر سو رہی تھی۔ کہ اچانک اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ خواجہ عمرو اور اس کی بیوی ریحانہ دونوں لپک کر پہنچے دیکھا کہ وہ دیوانہ وار کھڑی رو رہی ہے۔ ماں تا کی ماری ماں نے بغل میں لے کر کہا۔ بیٹی۔ تجھے یہ کیا ہو گیا!

سلمیٰ نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ماں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

ماں! کچھ نہ پوچھ!! میری بے تاب آنکھوں نے جو کچھ خواب میں دیکھا ہے۔ کاش ایسا دیکھنے سے پہلے ہی میری آنکھیں پھوٹ جائیں میری مضطر روح قفس عنصری سے پرواز کر جاتی۔

اے ماں! میرا دل پھٹا جا رہا ہے۔ میرا سر چکرا رہا ہے میری آنکھوں میں سرسوں پھول رہی ہے۔ دنیا میری نگاہوں میں تیرہ و تار ہو چکی ہے۔

اُف کتنا منحوس اور پریشان کن خواب تھا جس نے میرا صبر و قرار چھین لیا۔

خواجہ عمرو نے سلمیٰ کا دوپٹہ درست کرتے ہوئے کہا۔ بیٹی بدشگونیاں مت کرو انشاء اللہ کل پرسوں تک وہ مع سامانِ تجارت کے تشریف لے آئیں گے تمہارے لئے اطلس و حریر کے کپڑے اور شبیبہ کے واسطے اچھے اچھے کھلونے لائیں گے تمہیں منہ سے ایسی باتیں نہیں نکالنی چاہئیں۔ لو میں وعدہ کرتا ہوں کہ اب کی دفعہ ان کے قافلے کے ساتھ میں جاؤں گا۔ انہیں کہیں نہ جانے دونگا۔ چلو سو جاؤ۔

اسی اثنا میں ننھا جاگ پڑا اور رونے لگا۔ ریحانہ نے اٹھا کر سلمیٰ کی گود میں بٹھا دیا۔ اس کی دایہ بھی یہ شور سُن کر اٹھ بیٹھی تھی، وہ لے کر دودھ پلانے لگی اور سلمیٰ سسکیاں بھرتے بھرتے سو گئی۔

قافلے کی واپسی

ایک دن عصر کے وقت سلمیٰ محل پر سے شام کا راستہ دیکھ رہی تھی، کہ اُسے اُحد کے دامن سے اونٹوں کی قطار نظر آئی۔ وہ دیر تک کھڑی دیکھتی رہی قافلہ مدینہ کی جانب بڑھا چلا آرہا تھا۔ لیکن اس کے دیکھنے سے اسے کوئی فرحت محسوس نہ ہوئی۔ اس نے سوچا۔ کوئی اور قافلہ ہوگا۔ اگر ہمارا ہوتا۔ تو اس کے آگے وہ اونٹ پر سوار ہوتے۔ وہ کہہ کے گئے تھے۔ کہ میں آگے آگے ہونگا۔ اور سر پر سرخ رنگ کا دوپٹہ ہوگا۔ اور ہاں انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ دو یوم پہلے ایک قاصد بھیجوں گا۔ جو تمہیں ہمارے آنے کی اطلاع دیگا وہ اپنے دل میں اس قسم کے خیال باندھتی نیچے اُتر آئی۔

خواجہ عمرو اپنے تخت پوش پر بیٹھے دوکان کا حساب کتاب دیکھ رہے تھے۔ کہنے لگے۔ بیٹی! یوں سارا دن کھڑے رہنے سے تمہاری صحت خراب ہو جائے گی۔ بھلا کیا وہ یوں بغیر اطلاع کئے آجائیں گے۔ جب قاصد اُن کے آنے کی خبر دے گا۔ ہم ایک منزل استقبال کو جائینگے اور انہیں عزت سے

لے آئیں گے۔ کیوں ٹھیک ہے یا نہیں۔ ابھی آخری لفظ خواجہ عمر کے منہ میں تھا۔ کہ دیوان خانے سے اونٹ کے بلبلانے کی آواز آئی۔ خواجہ نے کان لگا کر آواز کو پہچانا۔ اور پھر لپک کر باہر نکل گیا۔

عامر اونٹ کو بٹھا رہا تھا۔ حال سے بے حال۔ حزن وملال اور مصائب و آلام کی کلفتیں اس کے چہرے سے ٹپکی پڑتی تھیں اسکی آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں اور منہ سے درد کے مارے کوئی لفظ نہیں نکل سکتا تھا۔ خواجہ عمرو کو دیکھ کر بولا۔

"آقا مجھے اترنے میں مدد دیجئے۔ میں درد سے مرا جا رہا ہوں"!

خواجہ نے نوکروں کو آواز دی۔ دو تین غلام دوڑ کر آ گئے۔ اور عامر کو اتارنے لگے۔

عامر اونٹ سے اترتے ہی خواجہ کے قدموں میں گر گیا۔ وہ رو رہا تھا۔ اور دیر تک روتا ہی رہا۔ خواجہ عمرو نے فکرمند ہو کر عامر کو اٹھایا۔ اور پوچھا خیریت تو ہے۔ اتنا کیوں روئے جاتے ہو! سلمیٰ بھی باپ کے پیچھے پیچھے دروازے تک چلی آئی تھی۔ اس نے یہ کیفیت دیکھی۔ تو اس کا دل بلیوں اچھلنے لگا اور مضطرب ہو کر باہر نکل آئی۔ پوچھا۔ ابا جان! ذرا پوچھئے تو شیبہ کے ابا کہاں ہیں؟ عامر نے خواجہ عمرو کو دیکھا۔ سلمیٰ پر درد انگیز نظر ڈالی اور پھر سلمیٰ کی گود میں ابا ابا پکارنے والے شیبہ پر نگاہیں گاڑ دیں۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ کہ آخر انہیں کیا بتائے۔ ہنستے بولتے گھرانے میں ماتم کی صف کیسے بچھائے خواجہ

عمرو اور سلمیٰ نے یکبارگی پھر سوال کیا۔

"عامر! تمہارے مالک کہاں ہیں؟"

"خواجہ ہاشم ———!" عامر نے آنکھیں پھاڑ کر ان کی طرف دیکھا، گویا صورتِ حال سے یہ کہتا تھا۔ کہ مجھے مار ڈالو۔ مگر مالک کی نسبت کوئی سوال نہ کرو۔ لکنت کے ساتھ بولا۔

"آپ میرے مالک کی بابت دریافت کرتے ہیں۔ وہ تو شام ہیں ہیں"!

سلمیٰ نے گھبرا کر کہا، شام ہیں ———!

کیا کر رہے ہیں وہ ———!

کب آنے کو کہا ہے ———!

ایک ہی سانس میں کئی سوال کر ڈالے۔

بس آہی رہے ہیں ———!

آہی جائینگے ———!

عامر کے منہ سے اس قسم کے بے ربط فقرے نکل رہے تھے۔ خواجہ عمرو اور سلمیٰ حیران تھے۔ کہ اسے کیا ہو گیا ہے۔

عامر ڈگمگاتا ہوا اپنے کمرے میں جا گرا۔ کہا۔ "طبیعت خراب ہے ذرا ہوش میں آ لینے دو۔ سارا حال سناتا ہوں"۔

سلمیٰ کی طبیعت ایک الجھن میں مبتلا تھی اس کا تڑپتا ہوا دل اور اکی

مضطرب رُوح اب مزید انتظار برداشت کرنے کو تیار نہ تھی، اس نے جی کڑا کر کے عامر سے دوبارہ دریافت کیا۔

"عامر! سچ سچ بتاؤ۔ قتیبہ کے ابّا کیوں نہیں آئے۔؟"

عامر نے سلمیٰ کی بات ان سنی کر کے خواجہ عمرو کو پکار کہا۔

"میرے آقا۔ قافلہ کے اونٹ باہر میدان میں آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ اُن پر گندم اور کپڑے لدے ہیں۔ آپ تشریف لے جا کر انہیں اُتروائیں۔ یا دس دس اونٹ یہاں بھجوائیں۔ تاکہ سامان گھر میں اُترنا جائے!"

سلمیٰ کو سامانِ تجارت سے کیا غرض وہ تو اپنے محبوب کی دیوانی تھی وہ بار بار عامر کی آنکھوں کو دیکھتی تھی۔ اور ان میں اپنے سرتاج کو ڈھونڈنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن عامر تھا۔ کہ کسی سے آنکھ ملاتا ہی نہ تھا۔ خواجہ عمرو الگ ذہنی کوفت کا شکار ہو رہے تھے۔ بڑی عمر کے بزرگ تھے۔ عامر کے انداز سے بھانپ گئے کہ ہاشم کی خیر نہیں ہے اس لئے وہ چاہتے تھے کہ سلمیٰ اندر جائے تو عامر سے حال دریافت کریں۔ مگر سلمیٰ عامر سے اس طرح چمٹی بیٹھی تھی کہ ہٹنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی ناچار خواجہ عمرو تو سامان اتروانے کے لئے باہر تشریف لے گئے۔ اور سلمیٰ نے کرید کرید کر پوچھنا شروع کیا۔

"اچھا یہ تو بتاؤ کہ وہ خیریت سے تو تھے؟"

"ہاں ہم سب خیریت سے شام پہنچے اور وہ بہت ہی خوش رہے آپ کو

اور شیبہ کو بہت یاد کرتے تھے۔!"

"ہاں پھر۔۔۔! تم کہتے ہی رہو۔ عامر! کہے چلے جاؤ۔ رک کیوں جاتے ہو۔ پہلتے بولتے تمہارا گلا خشک کیوں ہو جاتا ہے۔؟"

"۔۔۔۔بی بی جی۔! اس وقت میرا دل آرام کرنے کو چاہتا ہے خدا کے لئے آپ تشریف لے جائیں۔ تاکہ میں تھوڑا سا آرام کر لوں۔"

سلمٰی نے آبدیدہ ہو کر کہا۔ "عامر! میں کہاں جاؤں۔ میری مسرت اور شادمانی کا سارا سرمایہ تیرے پاس ہے۔ تم پانچ مہینے شیبہ کے ابا کے ہمراہ رہے ہو۔ میں تم سے ایک ایک دن کا حال تفصیل سے سنوں گی۔ عامر نے کہا۔ بی بی جی میں سب کچھ سنا دونگا۔ مگر اب ذرا آرام لینے دیجئے۔ سلمٰی بادلِ ناخواستہ اُٹھ کر اندر چلی گئی۔ اور عامر بستر پر لیٹ گیا۔

جناب عمروؓ نے قافلے میں جا کر ایک ایک غلام سے ہاشم کی بابت سوال کیا۔ سب نے یہی جواب دیا۔ کہ انہوں نے عامر کو ہی کچھ بتایا تھا۔ ان سے پوچھیئے۔ وہی ان کے بارے میں صحیح حال بیان کر سکتے ہیں۔ خواجہ عمروؓ نے بسرعت تمام سامان کو ٹھکانے لگوایا۔ غلاموں کو حکم دیا کہ وہ اونٹ سلع کے دامن میں چرنے کیلئے چھوڑ دیں اور خود جلد جلد عامر کے پاس پہنچے۔ عامر انہیں آتے دیکھ کر ادب سے اُٹھ بیٹھا۔

خواجہ نے عامر سے مخاطب ہو کر کہا۔

"عامر! ہمیں زیادہ پریشان نہ کرو۔ سچ سچ کہو۔ کیا ماجرا ہے؟"

اے آقا! اگر آپ سچ پوچھتے ہیں۔ تو حضرت ہاشم اس دنیا میں نہیں ہیں۔ ایک ماہ گزرا کہ وہ اعلٰی علیین کو سدھار چکے۔ عامر نے کرب آلود نظروں سے خواجہ عامر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

خواجہ عمرو کا چہرہ فق ہو گیا۔ ان کی زبان سے بے اختیار نکلا۔

ہائے سلمٰی! تیری تقدیر ——————— !

بیوگی کے بعد پھر بیوگی ——————— !

خواجہ عمرو کو معلوم تھا۔ کہ محل میں ایک مضطرب روح ہاشم کی یاد میں پھڑپھڑا رہی ہے۔ اگر اُسے یہ منحوس خبر پہنچ گئی۔ تو خدا معلوم کیا کر گزرے گی۔ فوراً رومال سے آنسو پونچھے۔ اور کہا۔ "عامر! خدا کے لئے اور کسی کو اس راز سے آگاہ نہ کرنا۔"

اس لئے تو میں ٹال رہا تھا آقا! ہائے افسوس!! بی بی سے یہ ناقابل برداشت صدمہ کیسے اُٹھایا جائے گا ———

"عامر چپ رہو ———"! خواجہ عمرو یہ کہہ کر محلسرائے میں داخل ہو گئے سلمٰی کے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ شیبہ تنگھوڑے میں سو رہا تھا اور سلمٰی گھر کے سامان کو ترتیب دے رہی تھی۔ ایک ایک چیز کو صاف کر کے قرینے سے رکھ رہی تھی۔ ایسے جیسا کہ سچ مچ اس کا شوہر آج ہی پردیس سے آ رہا ہو،

یہ دیکھ کر خواجہ عمرو آبدیدہ ہو گئے۔ مگر اس ڈر سے کہ کہیں راز فاش نہ ہو جائے فوراً باہر نکل آتے۔ دن کا پچھلا حصہ اسی کرب و بے چینی میں گزرا، شام کو کھانا چنا گیا۔ گھر والوں کا دستور تھا کہ جب تک خواجہ لقمہ نہ اُٹھاتے وہ ہاتھ نہیں بڑھاتے تھے۔ آج انہوں نے دیکھا۔ کہ جو سب سے پہلے کھانے کی طرف ہاتھ بڑھا کر اوروں کو صلائے عام دیا کرتے تھے۔ آج فکر میں کھویا بیٹھا ہے۔ بیگم نے کہا۔

سلمٰی کے ابّا! بیٹھے کیا سوچ رہے ہو۔ دیکھو تو سہی۔ تمہارے فکر نے سلمٰی کو بھی بے چین کر دیا ہے۔ تم کچھ کھاؤ گے تو اس کے حلق سے بھی اُترے گا۔

خواجہ عمرو نے سلمٰی کو بغل میں لے کر پیار کیا۔ اور سر پر بوسہ دیتے ہوئے کہا۔ بیٹی میری طبیعت اچھی نہیں ہے۔ تو اطمینان سے کھانا کھا لے اور ساتھ ہی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ سلمٰی نے محسوس کیا۔ کہ ابا حد سے زیادہ مغموم ہیں۔ ان کی آنکھیں آنسوؤں کے طوفان سے لبریز ہیں اور ان کا دل کسی زبردست بوجھ کے نیچے دبا جا رہا ہے۔ سلمٰی کسی نامعلوم خوف کے احساس سے کانپ اُٹھی۔ اس نے دل میں کہا۔ ہو نہ ہو۔ میرے سرتاج کی خیر نہیں اس خیال کے آتے ہی خواجہ کی آغوش میں سر ڈال کر بے اختیار رونے لگی۔ غم نصیب باپ کے منہ سے نکل گیا "بیٹی! صبر کرو ——————"!

یہ الفاظ سلمٰی کے قلب و دماغ پر بجلی بن کر گرے۔ اس کی چیخ نکل گئی۔

اور اس کے ساتھ ہی محلسرائے میں کہرام مچ گیا۔ دستر خوان اسی حالت میں اٹھا دیا گیا۔ سلمیٰ پر دیوانگی طاری ہو گئی۔ اس نے اٹھ کر اپنا سنگاردان کھولا۔ اور اس میں آرائش و زیبائش کا جو قیمتی سامان پڑا تھا۔ سب توڑ تاڑ کر زمین پر دے مارا۔ اطلس و حریر کے کپڑوں کو چیر پھاڑ کر آگ میں جھونک دیا۔ گھر کے آدمی یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ مگر دم بخود چپ تھے۔ خواجہ عمرو نے کہہ دیا تھا۔ کہ کوئی سلمیٰ کے مزاحم حال نہ ہو۔ وہ بپھری ہوئی شیرنی کی طرح باہر نکلی۔ اور جس گھوڑے پر ہاشم سواری کرتے تھے۔ اس کی کونچیں کٹوا ڈالیں جس تخت پوش پر مسند لگا کر وہ حساب کتاب فہمید کیا کرتے تھے۔ اسے تڑوا کر پھینکوا دیا۔ کمرے میں داخل ہو کر فرنیچر کو ٹھکانے لگایا چاہتی تھی کہ خواجہ عمرو شیبہ کو لے کر آڑے آ گئے۔ فرمایا "بیٹی! یہ یتیم کا مال ہے۔ اسے کیوں ضائع کرتی ہو۔" سلمیٰ دفعتہً چونک پڑی۔ اس نے شیبہ پر گہری نظر ڈالی اور اسے لے کر سینے سے چمٹا لیا۔

اچھا ــــــ یہ یتیم کا مال ہے ــــــ؟ ہاں یہ یتیم کا مال ہے!!
میرے یتیم شیبہ کا ــــــ!!!

ماں باپ کے چہرے پر نظریں گاڑ کر کہتی جاتی تھی۔ گویا وہ اس امر کی تصدیق کرا رہی تھی۔ کہ کیا واقعی شیبہ یتیم ہو چکا ہے۔
بچاری سہم کر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں سے سیلاب اشک جاری تھا

اور زبان سے اس قسم کے درد انگیز اشعار نکل رہے تھے۔

"اے ہاشم! اے وہ جس کی سخاوت پر عرب کو ناز تھا ——!!

اے کعبہ کے متولی! اے اقوام عرب کا سردار تو کہاں ہے ——!!

اے شیبہ کا ابا —! میں تجھے کہاں ڈھونڈوں ——!!

ہاں —— تو تو بہشت میں پہنچ چکا۔

تیری پاک روح فردوس کے سرسبز اور شاداب باغات کی گلگشت

میں مصروف ہے۔ تجھے کیا فکر ہو سکتی ہے۔!

لیکن تیرا شیبہ ——!

اب کس کو ابا کہہ کر پکارے گا ——!!

اس کے سر پر شفقت کا ہاتھ کون پھیرے گا ——!!!

آہ بچارا اللہ کا بچہ ——!!!!

اور یہ بدنصیب سلمٰی ——!

جس کا حسن و جمال تجھے اڑھائی سو میل سے کھینچ لایا تھا ——!!

جس کے لئے تو نے سخت سے سخت شرطیں گوارا کر لی تھیں ——!!!

وہ۔ جو تجھے جان و دل سے زیادہ عزیز تھی ——!!!!

آج ——!

وہ ایک بے بس اور بے کس بیوہ ہے ——!!

ایک یتیم کی ماں، جس کا سوائے خدا کے کوئی سہارا نہیں ——!!!
جس کی آنکھوں میں وفورِ مسرّت سے تو ہر وقت ایک غیر معمولی چمک
محسوس کیا کرتا تھا۔ اب اُن میں گرم گرم قطروں کے سوا کچھ نہیں رہا ——!!!!
جو دل کبھی مسرت و انبساط سے معمور تھا۔ اب تیری یاد میں سیماب وار
بے قرار ہے ——!
گلِ گلاب سے زیادہ احمریں ہونٹ جو تجھے دیکھ کر بے اختیار تبسم ہو
جاتے تھے۔ آج آہ و فغاں کے لئے وقف ہو چکے ہیں ——!!
اے سید البطحاء۔! اے عرب کے ماہِ کامل ——!!
تو اپنی خادمہ سے کیوں روٹھ گیا ——!!!
ایک بار پھر اپنی مصیبت زدہ لونڈی اور معصوم بچے کو اپنا آفتاب سے
زیادہ روشن چہرہ دکھائی دے۔
اگر تو ظاہر اور برملا نہیں آسکتا۔ تو نہ سہی۔
مگر تجھے خواب میں آنے سے کون روک سکتا ہے۔
خواب میں سہی۔
آ ——
اور ضرور آ
ورنہ میں تیری یاد میں

اور

تیرے فراق میں
گھل گھل کر

اور

رو رو کر

ختم ہو جاؤں گی

آ

اے شیبہ کے ابّا

آ

شیبہ کا عالمِ طفلی

دن گزرتے چلے گئے۔ سلمٰی کی طبیعت میں رفتہ رفتہ سکون کی علامتیں نظر آنے لگیں۔ خواجہ عمرو نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اور بڑے پیمانے پر خیرات کی اب شیبہ چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا تھا۔ اور نورِ نبوتؐ اس کے ماتھے پر جلوہ فگن تھا۔ کبھی کبھی ایسی تجلی اٹھتی تھی۔ کہ شیبہ کا چہرہ چاند کی طرح دمک اٹھتا۔ سلمٰی نے اسے ایک عالم کے پاس پڑھنے بٹھایا۔ اور حربی تربیت کیلئے ایک ماہر تیر انداز کی خدمات حاصل کیں۔ غم غلط کرنے کے لئے سلمٰی نے اپنا

وہی پرانا مشغلہ اختیار کر لیا تھا۔ صبح سویرے چست لباس زیب تن کر کے اپنی ہمجولیوں کے ہمراہ شکار کو روانہ ہو جاتی۔ دوپہر تک اُحد کی تلہٹی میں گھوڑے دوڑا دوڑا کر دن ڈھلے گھر کو لوٹ آتی۔ جونہی گھوڑا پھاٹک سے گذرتا سلمیٰ اپنے نور نظر کو آواز دیتی۔ میاں قتیبہ دوڑ کر حاضر ہو جاتے۔ اور ادب سے سلام کرتے۔ سلمیٰ گھوڑے سے اتر کر قتیبہ کے چاند سے چہرے پر پیار کرتی اور جو شکار مار کر لاتی۔ وہ اس کے حوالے کر دیتی۔

قتیبہ شکار لے کر اندر دوڑا دوڑا جاتا۔ اور خرگوش یا اس قسم کا جو ہلکا سا جانور اس کے ہاتھ میں ہوتا۔ لے جا کر نانی اماں کے آگے رکھ دیتا۔ جس پر وہ قتیبہ اور اس کی بہادر ماں کو دعائیں دینے لگ جاتیں۔ قتیبہ اور اس کی بیوہ ماں کے لیل و نہار اسی طرح بسر ہو رہے تھے

مکے کا مسافر

ایک دن قتیبہ مناخہ کے میدان میں تیر اندازی کی مشق کر رہا تھا لڑکے اپنے اپنے حسب نسب پر اترا رہے تھے۔ قتیبہ بھی اس بازی میں کسی سے پیچھے رہنے والا کہاں تھا۔ اس نے بھی کمان اُٹھا کر چلہ چڑھایا اور کہا۔

انا ابن ھاشم ارمی سھاما

اور جب تیر نشانے پر جا لگا۔

تو پھر بولا

اَنَا ابْنُ سَیِّدِ الْبَطْحَاءِ

ترکش سے اور تیر نکالا اور کمان پر چلّہ چڑھاتے ہوئے بولا

اَنَا سَیِّدِ مَکَّۃَ وَالْحِجَازِ

اور جب تیر نشانہ پر جا کر لگا۔ کہا

اَنَا ابْنُ رَئِیْسُ کُلَّ الْقُرَیْشِ

مکہ کا ایک رئیس اتفاق سے ان دنوں مدینہ میں مقیم تھا۔ اس نے جب ایک خوبصورت اور چلبلے بچے کے منہ سے یہ الفاظ سنے۔ تو وہ سخت حیران ہوا کہ یہاں ہاشم کی اولاد کیسے آگئی۔

قریب آکر پوچھا۔

"میاں صاحبزادے تم کون ہو؟"

"میں شیبہ بن ہاشم بن عبدالمناف ہوں۔" بچے نے معصومیت سے جواب دیا۔

"اپنے وطن چلو گے؟" حارث نے پھر سوال کیا۔

"کیوں نہیں۔ گلی کے لڑکے مجھے چھیڑتے ہیں۔ کہ اگر تم ہاشم کے لڑکے ہوتے۔ تو مکہ کے لوگ نہ لے جاتے ——— !"

اچھا تم تیار رہو۔ میں مکہ جا کر تمہارے چچا کو بھیجتا ہوں۔ وہ بہت جلد

آکر تمہیں لے جائینگے ــــــ!

"بہتر چچا جب کبھی آئینگے۔ مجھے اپنے ساتھ چلنے کو تیار پائینگے"۔

یہ کہہ کر حارث مدینہ سے روانہ ہو آیا۔ اور شیبہ نے دل میں پختہ ارادہ کر لیا۔ کہ اب ابا کے وطن میں ہی چل کر رہوں گا۔ دس برس کی عمر لیکن ذہن کی پختگی دیکھیے کہ والدہ سے ذکر تک نہ کیا۔

شیبہ کا فرار

غلام خواجہ عمرو سے رخصت لے کر مکہ چلا گیا تھا۔ اور اس نے حضرت مطلب سے اپنے آقا کی آخری وصیت حرف بحرف سنا دی تھی چنانچہ قریش نے انہیں کعبہ کا متولی تسلیم کر لیا تھا۔ شیبہ چونکہ کمسن تھے اس لئے مطلب لے یہ مناسب نہ سمجھا۔ کہ اُسے بیوہ ماں سے جدا کر کے اپنے ہاں لے آتے لیکن جب حارث نے انہیں شیبہ کا پیغام جا کر سنایا تو وہ فوراً اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اس وقت وہ حطیم میں تشریف رکھتے تھے۔ غلام کی طرف اشارہ کیا کہ فوراً تیز رو اونٹنی پر سفر کا سامان درست کر کے لے آ۔ خود جو تلوار لئے بیٹھے تھے۔ اُسی کے ساتھ مدینہ کو چل پڑے۔ غلام حرم کے دروازے پر اونٹنی لئے کھڑا تھا۔ مطلب اس پر سوار ہو کر کالے کوسوں کا سفر تن تنہا طے کرتے مدینہ جا پہنچے۔ شہر میں اونٹنی کالے جانا مناسب نہ سمجھا۔ اُسے باہر ایک یہودی کے

گھر میں بٹھا کر اور بھیس بدل کر شہر میں داخل ہوئے۔ اگرچہ حضرت مطلب نے شیبہ کو دیکھا ہوا نہیں تھا۔ لیکن جونہی یہ خواجہ عمرو کے محل کے قریب پہنچے۔ باہر گلی میں شیبہ کھیل رہا تھا۔ انہوں نے دیکھ کر پہچان لیا۔ کیونکہ نور نبوت کی جو تجلی ہاشم کے چہرے پر چمکا کرتی تھی۔ وہی اب اس بچے کی پیشانی سے ہویدا تھی۔ اور جب وہ ان کی طرف متوجہ ہوا تو مطلب نے انگلی سے اشارہ کیا شیبہ کو ان کا چہرہ پیارا معلوم ہوا۔ خون کی کشش سے کھچے چلے آئے۔ حضرت مطلب نے کہا۔ میاں شیبہ! میں تمہارا چچا ہوں۔ اور مکہ سے صرف تمہیں لینے کے لئے آیا ہوں۔ اگر ابّا کے وطن کو جانا چاہو۔ تو خاموشی سے میرے پیچھے چلے آؤ۔ شیبہ تو اسی دن کی آرزو میں تھے۔ چچا کو مل کر بہت خوش ہوئے اور چپکے سے ان کے پیچھے چلے آئے۔ حضرت مطلب شیبہ کو دم دلاسہ دے کر وہاں لے آئے جہاں اونٹنی کو بٹھا کر گئے تھے۔ آپ نے شیبہ کو اپنے پیچھے سوار کر لیا۔ اور اونٹنی مکے کا سفر لپیٹنے کے لئے لمبے لمبے ڈگ بھرنے لگی۔

تعاقب

سلمٰی کے لئے حضرت ہاشم کا انتقال کوئی معمولی صدمہ نہیں تھا، وہ غم ہلکا کرنے کے لئے احد کے سنگریزوں میں ماری ماری پھرتی تھی لیکن

اُسے یہ پتہ نہیں تھا۔ کہ ابھی فلک پیر کے ترکش میں ظلم کا ایک اور تیر باقی ہے۔ یہ سانحۂ جانگداز جگر گوشہ کا فراق تھا۔ ایک دن جو دوپہر کو گھر آئی شیبہ کو نہ پایا۔ خواجہ عمرو نے بتایا کہ پہر دن کو گلی میں کھیل رہا تھا۔ پھر نظر نہیں آیا۔ سلمیٰ نے ہر طرف اپنے نمازے دوڑ لیے۔ ظہر کے وقت پتہ چلا۔ کہ کوئی شخص اسے برق رفتار ناقہ پر سوار کیے مکہ کو اڑا چلا جاتا تھا یہ خبر سن کر سلمیٰ کے ہوش اڑ گئے۔ فوراً طویلہ سے گھوڑا کھولا اس پر سوار ہو شیبہ کے فراق میں بین کرتی مکہ کو روانہ ہوئی۔ خواجہ عمرو کو پتہ چلا۔ تو وہ بھی دو تین غلاموں کی معیت میں سوار ہو کر بگولے کی طرح عقب میں چڑھ دوڑا

حضرت مطلب اور شیبہ ذی الحلیفہ کے قریب پہنچے تھے کہ پیچھے سے گرد اُڑتی نظر آئی۔ مطلب نے کہا۔ بیٹیا معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں پکڑنے کے لیے کوئی بگولے کی طرح اُڑا چلا آتا ہے۔ شیبہ بولے "چچا جان آپ بیفکر رہیں۔ میں کوئی نادان تھوڑا ہوں۔ اپنی خوشی سے ابّا کے وطن کو جا رہا ہوں۔ مجھے کون روک سکتا ہے!"

مطلب اور شیبہ چند قدم چلے ہوں گے کہ پیچھے سے آواز آئی خبردار آگے نہ بڑھنا ورنہ تیر پھینک دوں گی مطلب نے اونٹنی روک لی۔ گرد پھٹی تو معلوم ہوا۔ حرف شیبہ کی ماں ہی تن تنہا لپکی آتی ہے۔ اس شیر نی نے آتے ہی نیزہ تان لیا۔ اور کہا۔

"اے جوان تو کون ہے۔ اور اس معصوم کو کہاں لئے جاتا ہے؟"
مطلب نے ڈھاٹا کھول دیا۔ کہا۔ یہ مجرم تیرے خاوند کا چھوٹا بھائی مطلب ہے
یہ سن کر سلمیٰ نے نیزہ پیچھے کر لیا۔ اور کہا۔
"دیور! تو نے اپنی دکھیا بھاوج پر یہ کیا ظلم کیا۔! شوہر تو تقدیر نے لے لیا تھا ایک بچہ تھا جس کے سہارے پر جی رہی تھی اُسے تم لے اُڑے! اور ظلم پر ظلم یہ کہ ملے تک نہیں ——— !
مطلب نے ندامت سے کہا بہن آپ جو کچھ فرماتی ہیں۔ بالکل بجا ہے لیکن اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ آپ کا بچہ موجود ہے۔ اس سے پوچھ لیجئے کہ اس نے مجھے پیغام بھیج کر بلایا ہے یا از خود میں آیا ہوں۔
دوسرا یہ کہ کعبہ کی تولیت اسی برخوردار کے نام ہے۔ میں بطور سربراہ کے غلامی کر رہا ہوں۔ بھائی صاحب کی وصیت تھی۔ کہ میرے بیٹے کو لے آنا اور کعبہ کی تولیت اس کے سپرد کر دینا۔
مجھے یقین تھا کہ اگر میں نے آپ سے اجازت چاہی۔ تو آپ کسی صورت اسے بھیجنے پر راضی نہ ہوں گی۔ اس لئے میں آپ کی اجازت اور رضامندی کے بغیر لے اُڑا۔
سلمیٰ کے چہرے پر حزن و ملال کے آثار ظاہر ہوئے۔ فکر مند ہو کر شیبہ سے پوچھا۔

"کیوں رے شیبہ! تو نے چچا کو کہلا بھیجا تھا کہ آ کر مجھے لے جاؤ۔!"

"جی ہاں! میں نے ہی کہلا بھیجا تھا۔"

سلمٰی نے حسرت و یاس کے ساتھ ایک نظر چاروں طرف ڈالی اور چاہا۔ کہ شیبہ کی توجہ مدینہ کی سرسبزی اور اس نواح کی دلفریبی و دلکشی کی طرف منعطف کرائے اور اس پر ثابت کرے۔ کہ اسے جو آرام ماں کی گود میں میسر ہے۔ وہ چچا کے ہاں کبھی نصیب نہیں ہو سکتا۔ نانا اور نانی کی محبت مکہ بھر میں اسے کسی قیمت پر نہیں مل سکتی چنانچہ سلمٰی نے کہنا شروع کیا۔

شیبہ! دیکھو۔ تم بیوہ ماں کو ایسے عالم میں تن تنہا چھوڑ کر جا رہے ہو جبکہ اُسے تمہاری سخت ضرورت ہے اور تم یہ بھی جانتے ہو کہ ماں کا پیار تمہیں دوسری کسی جگہ نہیں مل سکے گا۔ تیرا نانا تجھ سے کتنا پیار کرتا ہے۔ نانی تجھے کتنی محبت سے رکھتی ہے۔ مدینہ شہر کس قدر سرسبز اور شاداب ہے! اس جیسے باغات تجھے مکہ میں نہیں ملیں گے۔ کیا تو ان سب پر لات مار کر جا رہا ہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ شیبہ پتھر کی بے جان مورت ہے۔ اس پر کسی کشش کا مطلق اثر نہ ہوا۔ اس نے واشگاف الفاظ میں کہہ دیا۔

"اماں جان! تیری محبت اور ننھیال کی شفقت مجھے ابا کے گھر جانے سے نہیں روک سکتی۔ تو کب تک مجھے باندھ کے رکھے گی۔ آخر مجھے باپ کا ورثہ پانا اور اس کی مسند کو سنبھالنا ہے۔ تو میرے راستہ میں رکاوٹ کیوں

بنتی ہے۔؟"

قتیبہ کی یہ بات سُن کر سلمیٰ کی چھاتی بھر آئی۔ روتے روتے اس کی ہچکی بندھ گئی۔ کہا۔ اللہ رے قتیبہ! تیری ڈھٹائی۔ تو بڑا سنگدل نکلا۔ آخر ملی ہی بھانجی ——— کیا تجھے میرے آنکھوں میں چھلکتے ہوئے آنسوؤں اور میرے تھرتھراتے ہوتے ہونٹوں پر بھی ترس نہیں آیا۔!

مطلب بھائی! اگر یہ جانے پر مصر ہے۔ تو میں کیسے روک سکتی ہوں اسے لے جاؤ۔ مگر اسے پڑھانا، لکھانا، ادب سکھانا اور اس کی شادی اچھے گھرانے میں کرنا۔ کیونکہ میرے شوہر نے مجھ سے بارہا کہا تھا۔ کہ اب وہ زمانہ قریب آگیا ہے کہ نور نبوت اپنی اصلی شکل میں ظاہر ہو کر دنیا کو منور فرمائے۔ یہ ساری تیاریاں اس کی آمد کی ہو رہی ہیں۔ جاؤ۔ خدا حافظ۔"

مطلب اونٹنی پر سوار ہوا سلمیٰ نے لرزتے ہوتے ہاتھوں سے قتیبہ کو اُٹھا کر ان کے پیچھے سوار کر دیا۔ ناقہ پر چابک پڑنے کی دیر تھی کہ وہ بگولے کی طرح ہوا میں فراٹے لینے لگی۔ سلمیٰ کے پاؤں سیسہ کے کھم بن چکے تھے وہ پتھر کے بت کی طرح کھڑی قتیبہ کو دیکھ رہی تھی۔ جو چچا کے پیچھے کھڑی نشاد بجا بیٹھا تھا۔ وہ کھڑی دیکھتی رہی یہاں تک کہ پہاڑوں نے اونٹنی اور اس کے سواروں کو اپنے دامن میں چھپا لیا۔

خواجہ عمرو اپنے خادموں کو جلو میں لئے برق و باد کی طرح زمین کی

طنابوں کو لپیٹتے اڑے چلے آتے تھے۔ ذی الحلیفہ سے کوئی دو کوس آگے بڑھے ہوں گے کہ انہیں ایک ٹیلے پر سلمیٰ کھڑی نظر آئی۔ اس نے مکہ کی طرف منہ کر رکھا تھا۔ اس طرح دم بخود کھڑی تھی۔ جیسے کوئی پتھر کا بت نصب ہو۔ گھوڑا نیچے کیکر کے درخت سے بندھا کھڑا تھا۔ خواجہ عمرو چپ چاپ گھوڑے سے سے اتر کر قریب پہنچے۔ اور کندھے پر ہاتھ رکھ کر پیار سے کہا۔ بیٹیا۔ یہاں کیوں کھڑی ہو۔ دیکھو ہم بالکل تیار ہو کر آتے ہیں۔ شیبہ جہاں کہیں بھی ہوگا۔ ہم ڈھونڈھ نکالیں گے۔

سلمیٰ نے آنکھیں کھول کر خواجہ عمرو پر نظر کی۔ اس کی پیشانی تاریک ہوگئی۔ نتھنے پھڑکنے لگے۔ ٹھوڑی کپکپا اٹھی۔ بھویں سکڑ کر رہ گئیں اور آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑیاں برسنے لگیں۔ رو کر کہا۔ ابا کہاں جاتے ہو۔ وہ تو از خود اپنے چچا کے ہمراہ مکہ مکرمہ جا رہا ہے۔ چلو واپس چلیں۔

”چچا کے ہمراہ!“ خواجہ عمرو نے حیران ہو کر کہا۔

ہاں۔ اسے ”مطلب بن عبدالمناف“ لئے جا رہا ہے۔

یہ سن کر خواجہ عمرو پر اوس پڑ گئی اور سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ انہیں شیبہ سلمیٰ سے بھی زیادہ عزیز تھا۔ انہیں خواب میں بھی یہ امید نہ تھی۔ کہ سلمیٰ کا لال اس طرح بغیر ملے بغیر پوچھے ہم سے جدا ہو کر دور دراز علاقے میں چلا جائیگا انہوں نے آنسو پینے چاہے۔ مگر ضبط نہ ہو سکا۔ آنسو کے گرم گرم قطرے

داڑھی کو تر کر کے رب میں جذب ہونے لگے۔ یکایک انہیں سلمیٰ کا خیال آیا وہ اسی طرح سیسے کا کھمبا بنی کھڑی تھی۔ دنیا ومافیہا سے بے خبر۔ اسکی افسنک آلود آنکھیں تخیل کے عالم میں شیبہ کو ناقہ پر جاتا دیکھ رہی تھیں۔ بوڑھے عمرو نے کپکپاتے ہوتے ہاتھوں سے سلمیٰ کو تھاما اسے پکارا مگر وہ آنکھیں کھول کر حسین و جمیل نظارے سے محروم نہیں ہونا چاہتی تھی۔ کانپتی ہوئی آواز میں بولی "ابا۔ وہ دیکھو شیبہ اونٹنی پر چچا کے پیچھے دبکا بیٹھا ہے۔" مگر ایسے عالم میں شیبہ کہاں؟ تاریکی ہر طرف سرعت سے پھیلتی جا رہی تھی، پہاڑوں کا لا متناہی سلسلہ مہیب منظر پیش کر رہا تھا۔ اس کے کالے بھجنگے ٹیکروں سے وحشت ٹپکتی دکھائی دیتی تھی۔ خواجہ عمرو نے غمزدہ بیٹی کو سہارا دے کر گھوڑوں کی طرف بڑھنے کی کوشش کی۔ ایک دفعہ وہ جھجکی۔ اور پھر بھنور میں پھنسی ہوئی ناؤ کی طرح ڈگمگاتی ہوئی چل پڑی۔ ٹھیک اس وقت جبکہ سورج کی سنہری شعاعیں مقامِ وداع پر تاریکیوں سے مصافحہ کر رہی تھیں اور روشن دن لیلائے شام کی سیاہ پیشانی پر بوسہ دے کر رخصت ہو رہا تھا، چند حرماں نصیب سوار مدینہ کو واپس لوٹ رہے تھے۔

عشق کے آخری سانس

ماخذ

طارق سعادت

دورِ جاہلیت کا ایک نامور پہلوان اپنے اوقاتِ وفات میں

مرحب اور عنتر عرب کے دو نامی گرامی پہلوان ہو گزرے ہیں۔ مرحب خیبر کا رئیس تھا۔ جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ہاتھوں قتل ہوا۔ لیکن عنتر کو اسلام کا بابرکت زمانہ نصیب نہیں ہوا۔ حاتم کی طرح اس کا شمار دورِ جاہلیت کے اکابر میں ہوتا ہے اس کی زندگی کا جائزہ لینے سے پتہ چلتا ہے۔ کہ وہ صالح فطرت کا انسان تھا۔ اگر اُسے اسلام کا زمانہ نصیب ہوتا تو اسلام کی ایسی ایسی خدمات بجالاتا۔ کہ مسلمان رہتی دنیا تک اس پر فخر کرتے۔ علامہ اقبالؒ نے ایک موقعہ پر فرمایا تھا ؎

نہ ستیزہ گاہِ جہاں نئی نہ حریفِ پنجہ فگن نئے

وہی فطرتِ اسد اللّٰہی وہی مرحبی وہی عنتری

اس سے بعض حضرات نے عنتر کو بھی مرحب کے پہلو میں لا کھڑا کیا ہے۔ میرے خیال میں علامہ رحمۃ اللہ علیہ نے عنتر کا ذکر یہاں ارادۃً نہیں کیا شاید ضرورتِ شعری سے ایسا ہو گیا ہو۔ ہم یہاں عنتر کے آخری لمحات کا مجمل سا خاکہ پیش کرتے ہیں۔ جو اس امر کا واضح ثبوت ہے۔ کہ وہ اسلامی دور سے پہلے ہی بنی حارثہ سے لڑتا ہوا مارا گیا تھا۔ اگر ادب نواز حضرات علامہ کے محولہ بالا شعر میں غور و فکر کرنے کے بعد کسی اور نتیجہ پر پہنچ سکیں۔ تو نیاز مند کو ضرور اطلاع بخشیں ممنون ہوں گا۔

خاکسار۔ نور احمد خاں فریدی

(۱)

دورِ جاہلیت کے دو پہلوان عنتر اور داجی

عنتر اپنے قبیلہ کے دو سو پختہ کار جوان جلو میں لئے جبل احمر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کی حسین بیوی اس کے ہمراہ محمل میں سوار تھی۔ اونٹوں اور گھوڑوں کا یہ قافلہ سرعت سے فاصلہ طے کرنے میں مصروف تھا۔ عصر کے وقت عنتر نے ریت کے ایک تودہ پر کھڑے ہو کر مشرق کی طرف نظر دوڑائی اور للکار کر کہا۔ بہادرو! بڑھے چلو، منزلِ مقصود قریب ہے۔ وہ دیکھو بنی حارثہ پہاڑ کے دامن میں ڈیرے ڈالے پڑے ہیں۔

اس آواز نے جوانوں کے خون کو گرما دیا۔ شتر سواروں نے حدی پڑھنا شروع کی اور اونٹ لمبے لمبے ڈگ بھرنے لگے۔

عنتر کی طرح داجی بھی اپنے قبیلے کا سردار تھا۔ پچھلے دنوں اس سے کوئی ایسی غلطی سرزد ہو گئی تھی۔ جس نے عنتر کے خون کو کھولا دیا اور اس

نے طیش میں آ کر یہ حلف اُٹھایا کہ جب تک وہ داجی کو اس گستاخی کا مزہ نہیں چکھا لینا۔ اس کے لئے پلنگ پر سونا حرام ہے۔ اس ارادے کو اس نے اپنے تئیں بطور راز رکھنا جوانمردی سے بعید خیال کیا ——— بلا تامل ایک قاصد روانہ کر کے بنی حارثہ کو اپنے ارادے سے مطلع کر دیا ———

داجی کو اپنی بہادری پر گھمنڈ تھا۔ اور کسی کو اپنی خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ اس کا خیال تھا۔ کہ عنتر قوت میں اس سے زیادہ نہیں ہے۔ اس لئے اس پر عنتر کے اعلانِ جنگ سے کوئی گھبراہٹ طاری نہ ہوئی۔ بلکہ وہ اپنے قبیلے کے نوجوانوں کو جمع کر کے جبل احمر کے دامن میں آ پڑا اُسے خوشی تھی کہ عرصہ کے بعد ایسے نامی گرامی پہلوان سے زور آزمائی کا موقعہ ملا ہے۔ اگر اس معرکہ میں وہ جیت گیا۔ تو عرب میں اس کی دھاک بیٹھ جائے گی۔ چنانچہ وہ اپنے حریف کے ساتھ ٹکر لگانے کے لئے اس طرح دبکا بیٹھا تھا جیسے کوئی پختہ کار شکاری اپنے شکار کے لئے جال لگا کر بیٹھتا ہے۔

عنتر کو جبل احمر پہنچتے پہنچتے شام ہو گئی۔ ابھی اس نے اپنا سامان بھی نہ اتروایا تھا۔ کہ داجی کی طرف سے طاقت آزمائی کا دعوت نامہ پہنچ گیا ———

عنتر نے بڑی بے چینی سے رات کاٹی۔ صبح سویرے دونوں قبیلے آلات حرب سے مسلح ہو کر مقابلے کو نکلے، داجی نے خوبصورت لنگوٹ کس رکھا تھا۔ سر پر شتر مرغ کے پر لگائے، بڑے فخر کے ساتھ میدان جنگ میں چھلانگتا پھرتا تھا اسکی

جوان بہنیں اونٹوں پہ بیٹھی دف بجا رہی تھیں اور اس کی بوڑھی ماں بھی اپنے نامور بیٹے کی کشتی کا نظارہ دیکھنے آئی ہوئی تھی۔

(۲)

داجی کا قتل

عنتر اپنا وزنی اور طویل نیزہ ہاتھ میں تھامے اور مرصع شمشیر ہاتھ میں حمائل کئے میدان میں نکلا۔ دونوں پہلوان آمنے سامنے ہوئے داجی کو دیکھتے ہی عنتر کے آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ بولا۔

"کم بخت! تجھے ایک بڑھیا کی بے عزتی کرتے ہوئے شرم بھی نہ آئی تھی ——— !"

یہ کہہ کر قبل اس کے کہ وہ کوئی وار کرتا۔ اس کو لکڑی کے کندے کی طرح اُٹھا کر زمین پر دے مارا۔ جس سے اس کی گردن ٹوٹ گئی اور چشم زدن میں ہزاروں ارمان دل میں لئے ملک عدم کو رخصت ہو گیا ——— داجی کے مرتے ہی بنی حارثہ میں رنج والم کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اس کی بڑھی ماں اور جوان بہنوں نے رو رو کر آسمان سر پہ اٹھالیا۔

شیخ الشیوخ ابو عامر نے قبیلہ کے جوانوں سے چلا کر کہا۔ کھڑے کیا دیکھتے ہو۔ قاتل کی تکا بوٹی کر دو ——— اب عنتر اپنے مشکی گھوڑے پر

سوار ہو چکا تھا۔ اس نے بھی اپنے جوانوں کو آواز دی۔ آن کی آن میں گھمسان کا رن پڑا۔ عنتر بدمست ہاتھی کی طرح جدھر کا رخ کرتا صفوں کی صفیں الٹ کر رکھ دیتا۔ اس کے رفیقوں نے بھی خوب داد شجاعت دی۔

شیخ الشیوخ ابو عامر گرگ باراں دیدہ کی طرح مقام رفیع سے جنگ کا نظارہ کر رہا تھا جب اس نے اپنے قبیلے کے آدمی گاجر مولی کی طرح کٹتے دیکھے۔ تو اپنے غلام جوہر کو زہر آلود نیزہ دے کر کہا کہ چپ چاپ عنتر کے پیچھے لگا رہ اور جب موقع ملے اس کی پیٹھ میں چھبو دے چنانچہ جب عنتر شجاعت اور مردانگی کے نشہ میں اپنے رفیقوں کو پیچھے چھوڑ کر آگے نکل گیا۔ تو جوہر نے موقع پا کر زہر آلود نیزہ اس کی پیٹھ میں چبھو دیا۔ عنتر درد و کرب کے مارے بے چین ہو رہا تھا۔ مگر اس عالم میں بھی اس نے وضعداری کو ہاتھ سے نہ دیا۔ شیر کی طرح ڈکارتا گرجتا دشمنوں کو تلوار کے گھاٹ اتارتا آگے بڑھتا ہی گیا۔ یہاں تک کہ بنی حارثہ کے جوان مقابلے کی تاب نہ لا کر بھاگ گئے۔ شیخ الشیوخ نے پکار کر کہا۔ "بزدلو! جس شیر سے ڈر کر تم بھاگ رہے ہو۔ وہ اب چند ساعتوں کا مہمان ہے" مگر نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے۔ کسی نے مڑ کر بھی پیچھے نہ دیکھا۔ بھاگ کر جبل احمر کی اوٹ میں جا چھپے۔ ادھر جب عنتر کے بدن میں زہر سرایت کر گیا۔ تو اس نے گھوڑے کا رخ خیمہ کی طرف کر کے

باگ ڈھیلی چھوڑ دی۔ فحمت رفیق مبارک دینے کو آگے بڑھے مگر یہاں تو موت کا فرشتہ دستک دے رہا تھا۔ بولا "بھائیو! مجھے گھوڑے پر سے اتار دو۔ میرے سارے بدن میں زہر پھیل چکا ہے۔ اور اب میں چند لمحوں کا مہمان ہوں۔"

جان نثار ساتھیوں نے گھبرا کر اپنے سردار کو اتار دیا۔ زہر آلود نیزہ کو بڑی احتیاط سے نکال کر عنتر کو غالیچے پر جا لٹایا۔ اس کی محبوب بیوی چیختی چلاتی اس کے قریب آ گری۔ گھر کے آدمی بے تحاشا رونے لگے عنتر نے درد کو ضبط کرتے ہوئے بیوی سے کہا۔ نادان نہ بن دشمن کو میری حالت کا صحیح اندازہ ہو چکا ہے۔ اور اب وہ ہم پر شبخون مارنے کا منصوبہ سوچ رہا ہے۔ اٹھو وقت ضائع نہ کرو۔ اس مقام سے فوراً نکل چلو ورنہ صبح تک ہمارا نشان تک نہ رہے گا ــــــ!"

"اُف!" عنتر نے درد کی شدت کو ضبط کرتے ہوئے کہا اونہہ ــــ! اونہہ ــــــ!! اونہہ ــــــ!!!"

لمحہ بہ لمحہ بے چینی بڑھ رہی تھی۔ اور سورج سرعت کے ساتھ اُفق مغرب کی طرف جھکتا چلا جا رہا تھا۔ عنتر نے "اونہہ" کرتے ہوئے غالیچہ پر ہاتھ مارا۔

"اُف! یہ مجھے کیا ہو گیا! میں کراہ رہا ہوں ــــــ بہادر عرب

تو کبھی نہیں کراہتا ——— عرب کو دنیا کی کوئی طاقت کراہنے پر مجبور نہیں کر سکتی ——— !"

عنتر نے رفیقوں کو دیکھ کر کہا۔

کھڑے کیا دیکھتے ہو۔ جلدی کرو۔ یہاں سے نکل چلو۔ رفقار اپنی سواریوں کی طرف لپکے عنتر نے بیوی کو قریب بلا کر کہا۔

"نیک بخت! میں بہت کمزور ہو چکا ہوں۔ گھوڑے پر سواری نہیں کر سکتا۔ تم میرا لباس پہن کر گھوڑے پر سوار ہو جاؤ اور میں تمہاری جگہ محمل میں لیٹتا ہوں" یہ کہہ کر عنتر نے ملازم کو آواز دی۔ ایک سیاہ فام موٹا سا آدمی لپک کر اندر حاضر ہوا۔ اور جھک کر ادب سے بولا۔

"لبیک یا سیدی"

اسد! مجھے سہارا دو۔ عنتر نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ غلام عنتر کو محمل کے قریب لے گیا۔ اور آرام سے اس کے اندر لٹا دیا۔ عنتر کی حسین بیوی خاوند کا لباس زیب تن کر کے گھوڑے پر سوار ہوئی اور قافلہ بنی عبس کی طرف روانہ ہوا۔

(۳)

ابو عامر کی فراست

شیخ الشیوخ ابو عامر دوسری طرف پہاڑ کی اوٹ میں بنی حارثہ کے

نوجوانوں کو غیرت دلا رہا تھا۔ اس کا خیال تھا۔ کہ عنتر یا تو مر چکا ہو گا۔ یا مرنے کے قریب ہو گا۔ لیکن جوہر نے آکر ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ اس نے بتایا۔ کہ "میں عنتر کو بچشم خود گھوڑے پر سوار دیکھ کر آرہا ہوں۔ اس کے تمام رفقاء مسرت و شادمانی کے نعرے لگاتے اڑے جا رہے ہیں"
عام لوگوں نے بھی جوہر کے اس بیان کی تائید کی۔

بوڑھے شیخ نے اٹھ کر قافلہ کی طرف نظر دوڑائی۔ اس کی عقابی نگاہوں نے بھانپ لیا کہ قافلے میں فتحمندی کی اصلی روح نہیں ہے اس نے نام لے لے کر جوانوں کو پکارا اور کہا "دال میں کچھ کالا ضرور ہے" اگر عنتر خیریت سے ہوتا۔ تو لشکر واپس جانے کے لئے اتنا بے تاب نہ ہوتا۔ ذرا سوچو تو سہی۔ دنیا تمہارے متعلق کیا خیال کرے گی۔ آنے والی نسلیں تمہیں کس نام سے پکاریں گی۔ تمہارا سردار مر چکا ہے۔ مگر تم تو زندہ ہو۔ مجھے یقین ہے کہ عنتر خیریت سے نہیں ہے ——!"

بنی حادث کے تین سو نوجوان شیخ کے ہمراہ ہوتے ہر سب گھوڑوں کو دوڑا کر عنتر کے قافلہ سے ذرا آگے اس مقام پر جا کھڑے ہوئے۔ جہاں سے قافلے کا ہر شخص بخوبی نظر آسکتا تھا جب عنتر کی سواری قریب آئی تو شیخ پر مسرت طاری ہو گئی۔ مسکرا کر بولا۔

"بہادرو! میں نہ کہتا تھا۔ کہ گھوڑے پر عنتر سوار نہیں ہو سکتا۔ دیکھو!

یہ کوئی عورت ہے۔ اس کے چہرے پر تمہاری نگاہیں نہیں پڑیں۔ غور کرو اگر یہ سوار عنتر ہوتا۔ تو کیا وہ نیزہ نہ تھام سکتا۔ نیزے پر نظر ڈالو۔ کیا وہ آگے کو نہیں جھک رہا۔ یقیناً یہ کوئی عورت ہے جو زرہ کے بوجھ سے دبی جا رہی ہے۔ یہ اہل قافلہ کی چال ہے۔ عنتر مر چکا ہے۔ اور اس کی لاش محمل میں لدی ہے۔" بنی حارث کے جوانوں کو یہ فتح کے دلائل قرین قیاس نظر آتے اور وہ بے خوف ہو کر نیچے اُترے۔ اسی اثنا میں عنتر کی بیوی نے پسینہ پونچھنے کے لئے خود اُتارا۔ بنی حارثہ کے چند نوجوانوں نے اس کا چہرہ دیکھ لیا۔ اور انہوں نے اپنے قبیلے کے جوانوں کو پکار کر کہا۔

"بے خوف چلے آؤ۔ گھوڑے پر عنتر کی بیوی سوار ہے۔ اور وہ مر چکا ہے۔"

یہ آواز عنتر کے کانوں تک بھی جا پہنچی۔ اس نے محمل کا پردہ ہٹا کر دیکھا بنی حارثہ تلواریں علم کئے لپکے چلے آتے تھے۔ عنتر کی خوابیدہ صلاحتیں پھر عود کر آئیں۔ حمیت خاندانی نے اس میں ایک دفعہ بجلی جیسی قوت بھر دی شیر کی طرح ڈکرایا۔ اس کی گرج پہاڑ سے جا ٹکرائی اور وادی اسکی پرہیبت آواز سے دہل اُٹھی۔ بنی حارث کے نوجوان عنتر سے اس قدر خائف تھے کہ اس للکار کی تاب نہ لا سکے۔ اور گھوڑوں کو بھگا کر پیچھے ہٹ گئے۔ ابو عامر پکڑا ہلا ہلا کر بلاتا رہا۔ مگر سوائے تینتیس ۳۳ بہادروں کے کسی نے اس کا ساتھ نہ

دیا ـــــ اور بھاگ کر اپنے گھروں کو چلے گئے۔

(۴)

عنتر کا عجیب و غریب عزم

اب عنتر نے اونٹ کو بٹھا کر گھوڑا طلب کیا۔ جان نثار رفیقوں نے ہزار منع کیا۔ کہ آپ کی حالت گھوڑے کی سواری کے قابل نہیں۔ مگر وہ جو المزد باز نہ آیا۔ بیوی کو محمل میں بٹھا کر خود اپنے وفادار مشکی گھوڑے پر سوار ہوا اور کارواں آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ کچھ دور تو عنتر اپنی بیوی کے اونٹ کے ساتھ ساتھ چلتا رہا مگر اس کی حالت لحظہ بہ لحظہ متغیر ہو رہی تھی۔ ضعف دمبادم بڑھتا جا رہا تھا۔ شام کے قریب یہ قافلہ وادی غزالہ میں جا پہنچا۔ یہاں سے قبیلہ بنی عبس تھوڑی دور واقع تھا۔ جس راستے سے قافلے کو گزرنا تھا۔ وہ دو نو طرف پہاڑوں سے گھرا ہوا تھا۔ اور درمیانی راستہ اس قدر تنگ تھا کہ ایک وقت میں تین سواروں سے زیادہ نہیں گزر سکتے تھے۔ عنتر نے بیوی کا محمل روک دیا۔ کہا۔ "اے محرم راز! اب ہم ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں۔ اگر میرے طرز عمل سے تجھے کبھی تکلیف پہنچی ہو۔ تو خدا کے لئے معاف کر دو۔" اس کی بیوی رونے لگی۔

عنتر نے آبدیدہ ہو کر کہا۔ "اے نیک بخت تو ایک بہادر عرب کی بیوی ہے ذرا طبیعت پر زور دے۔ خدا معلوم تجھے کن کن مصائب سے دوچار ہونا ہے اچھا الوداع!"

عنتر نے درہ کے دہانے پر اپنا گھوڑا روک لیا اور رفیقوں سے پکار کر کہا کہ اب تم بے خوف ہو کر اس وادی میں بڑھتے چلے جاؤ۔ اس کے خاتمے پر بنی عبس کا قبیلہ آباد ہے۔ جہاں تمہارے لئے ہر طرح کا آرام موجود ہے میں یہاں دہانے پر کھڑا ہو دشمنوں کو روکے رکھونگا۔"

عنتر کے رفقاء بڑے رنج اور افسوس کے ساتھ اپنے سردار سے رخصت ہوئے۔ جان نثار غلام اسد قدموں پر لوٹ کر بولا "آقا ساری عمر آپ کی خدمتگذاری میں کٹی ہے۔ آخری وقت میں اپنے قدموں سے دور نہ کیجئے۔

عنتر نے شفقت سے سر پر ہاتھ پھیرا۔ کہا "میرے دکھ درد کے ساتھی! میں تو ختم ہو چکا ہوں۔ چند لمحوں کا مہمان ہوں۔ لیکن میرے بال بچوں کو تجھ جیسے وفادار ملازم کی ضرورت ہے میرے مرنے سے ان پر مصیبتوں اور آفتوں کے جو بادل ٹوٹیں گے۔ اس وقت تم ان کے کام آؤ گے۔ چلو خدا حافظ!"

مالک کے آخری حکم پر سر تسلیم خم کر کے اسد رخصت ہوا۔

اب عنتر اکیلا رہ گیا۔ اس نے اپنا طولانی نیزہ زمین میں گاڑ دیا اور

خود اس کے سہارے نیچے اُترا۔ گھوڑے کو تھپتھپایا اور اس کے منہ کو پکڑ کر پیار کیا ـــــ اب تارے چھٹک آئے تھے۔ عنتر نے ایک دفعہ پھر قافلے کی طرف نظر دوڑائی۔ مگر تاریکی میں کچھ نظر نہ آیا۔ عنتر کو یقین تھا۔ کہ دشمن اس وادی سے فائدہ اُٹھانے کے لیے ضرور تعاقب کریگا۔ اس کا یہ خیال صحیح نکلا ـــــ ابوعامر تیس سرباز جان نثاروں کے ساتھ ساتھ کارواں کے پیچھے لگا چلا آتا تھا۔ جب وہ وادی غزالہ کے دہانے پر پہنچے۔ تو انہیں عنتر گھوڑے کے آگے کھڑا دکھائی دیا۔ ابوعامر کے آدمی عنتر کو زندہ و سلامت دیکھ کر خوفزدہ ہو گئے بھاگنے کو ہی تھے۔ کہ ابوعامر نے روک لیا۔ کہا "ڈرو نہیں عنتر قریب الموت ہے۔ یہ دیر تک زندہ نہیں رہ سکے گا۔ اسے دیکھتے رہو کہ کب تک زندہ رہتا ہے" عنتر کا آخری وقت قریب آچکا تھا۔ اُسے یقین تھا کہ اگر میں گر پڑا تو دشمن میری لاش کو روندتے ہوئے وادی میں گھس جائینگے۔ اور اہل قافلہ کی تکابوٹی کر لیں گے۔ اس لیے اس نے فیصلہ کر لیا۔ کہ خواہ میں مر جاؤں۔ لیکن میری لاش کو اس وقت تک نہیں گرنا چاہیئے جب تک کہ قافلہ وادی سے صحیح سالم نکل نہیں جاتا ـــــ! چنانچہ اس نے گھوڑے کا سہارا لے کر نیزے کو بالکل آگے گاڑ دیا۔ زہر اپنا کام کر چکا تھا۔ موت کا فرشتہ اس کی روح قبض کرنے کے لیے پر تول رہا تھا۔ سکرات کا عالم طاری

ہو گیا۔ ایسی حالت میں بھی وہ جوانمرد سیسے کے کھم کی طرح ڈٹا کھڑا رہا۔ یہاں تک کہ اس کا طائر روح قفس عنصری سے پرواز کر گیا۔ مرنے والے نے عالم ہوش میں اپنے آپ کو گھوڑے اور نیزے کے درمیان کچھ اس طرح پھنسا دیا تھا۔ کہ مرنے کے بعد بھی اس کی لاش نیچے نہ گر سکی۔ دور سے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا عنتر زندہ کھڑا دشمن کی راہ تکتا ہے ——

ابو عامر رات بھر پہاڑی کے ایک ٹیکرے پر بیٹھا عنتر کو دیکھتا رہا۔ اس کے رفقا بھی دم بخود پاس کھڑے تھے۔ مگر عنتر کے خوف سے انہوں نے اپنے گھوڑوں کے منہ باندھ رکھے تھے۔ اور بولتے اتنی آہستگی سے تھے کہ تیسرے شخص تک آواز نہ پہنچ سکتی تھی ——

خوف اور اضطراب کے اسی عالم میں رات ختم ہوئی۔ افق مشرق سے صبح صادق نے طلوع کیا۔ صبح کے دھندلکے میں عنتر نمایاں طور پر نظر آرہا تھا۔ ابو عامر نے کہا۔ "اگر عنتر زندہ ہے۔ تو وہ بے کار یہاں کیوں کھڑا ہے میں تو یہی کہوں گا۔ کہ عنتر ختم ہو چکا ہے"!

یہ کہہ کر اس نے اپنے گھوڑے کو نیزہ مار کر دلدے کی طرف دوڑایا۔ عنتر کے گھوڑے نے جب اُسے اپنی طرف آتے دیکھا تو چیخ کر کے زقند بھری۔ جس سے عنتر کی لاش نیچے آپڑی۔

ابو عامر نے کہا۔ میں نہ کہتا تھا۔ کہ عنتر مر چکا ہے۔ چلو اب جا کر

اس کی لاش دیکھیں۔ ابو عامر اور اُس کے رفیق سوار ہو کر درّہ پر آئے۔ عنتر کی لاش ریت پر اس طرح پڑی تھی۔ جیسے کوئی بہادر فیصلہ کن جنگ لڑ چکنے کے بعد سستانے کی غرض سے لیٹ گیا ہو۔ ابو عامر دشمن ہونے کے باوجود ایک قدردان عرب تھا۔ عنتر کی بے مثل بہادری اس پر اثر کئے بغیر نہ رہ سکی۔ لاش کے دیکھتے ہی پکار اُٹھا۔

"مُبارک ہے وہ ماں جس نے عنتر جیسا شیر جنا"

زرہ اور ہتھیار الگ کر کے عنتر کی لاش کو اسی مقام پر دفن کر دیا۔ جہاں وہ مرنے کے بعد بھی دشمنوں کے لئے سدِ سکندری بن کر ڈٹا رہا تھا۔ جب قبر بن چکی تو اس کے سرہانے کھڑے ہو کر کہا:۔

"اے شیرِ عرب! تیرا نام اس دنیا میں آفتاب عالمتاب کی طرح چمکتا رہے گا۔ تو اپنی قوم کے لئے سپر تھا۔ تیرے مرنے کے بعد بھی تیری قوم نے تجھ سے فائدہ اٹھایا اور تیرے دشمن تیری لاش سے اس طرح ڈرتے رہے جیسے تیری زندگی میں تجھ سے خوف کھاتے تھے۔ اے جنگ آزما پہلوان! دعا ہے۔ کہ خدا تیرے نام کو شہرتِ دوام عطا کرے۔ اور تجھے جنت الفردوس میں اعلیٰ مرتب سے سرفراز فرمائے"

ابو عامر کے رفیقوں نے عنتر کے گھوڑے کو پکڑنا چاہا۔ مگر وہ طراتے بھرتا ہوا صحرا کی طرف نکل گیا۔ پھر کسی نے اس کی شکل تک نہ دیکھی ؛

ابوشحمہ

مآخذ

۱۔ الفاروق ــــــــــــــــ

۲۔ معارف ابن قتیبہ ــــــــــــ

۳۔ قندیل لاہور ــــــــــــ

"قضا ایک ضروری فرض ہے۔ لوگوں کو اپنی مجلس میں اپنے برابر رکھو۔ تاکہ کمزور انصاف سے مایوس نہ ہو۔ اور زور آور کو تمہاری رعایت کی اُمید نہ پیدا ہو۔
جس مسئلہ میں شبہ ہو۔ اور قرآن و حدیث میں اس کا ذکر نہ ہو تو اس میں غور کرو۔ اور پھر غور کرو۔ جو شخص بحث کرنا چاہے۔ اس کے لئے ایک میعاد مقرر کرو۔ اگر وہ ثبوت دے تو اس کا حق دو۔ ورنہ مقدمہ خارج ——— !
مسلمان سب ثقہ ہیں۔ سوائے ان آدمیوں کے جن کو حد کی سزا میں درّے لگائے گئے ہیں۔ یا جنہوں نے جھوٹی گواہی دی ہو۔ یا ولادت اور وراثت میں مشکوک ہوں۔"
"فاروق اعظم"

(۱)

ایک سائلہ

"کیا ہے بیٹی ــــــ ؟" امیر المومنین عمرؓ نے اپنی عقابی نگاہوں سے لڑکی کو گھورتے ہوئے کہا۔

سائلہ نے اپنے آپ کو لمبی چادر میں لپیٹ رکھا تھا۔ ایک ستون کے سہارے کھڑی کچھ سوچ رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ جو کچھ کہنا چاہتی ہے۔ شرم وحیا اس کے اظہار کی اجازت نہیں دیتا۔

عمر فاروق نے دوبارہ فرمایا "بیٹی! کیا کہنا چاہتی ہے"!

لڑکی سمٹتی ہوئی آگے بڑھی اور اپنی طویل وعریض چادر سے ایک شیر خوار بچے کو نکال کر سنگریزہ ہائے مسجد پر لٹا دیا اور کہا "حضرت! یہ آپ کے صاحبزادے ابو شحمہ کا بچہ ہے!"

اس کے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکی۔

اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

(۲)

سنگین الزام ——

امیر المومنین دم بخود بیٹھے بچے کو دیکھ رہے تھے۔ حاضرین بھی فرطِ حیرت سے بُت بنے بیٹھے تھے۔ ہر طرف سکوت طاری تھا۔ مسجد نبوی میں آج تک ایسا کوئی واقعہ رونما نہیں ہوا تھا۔ یہ اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ تھا کہ خلیفۂ اسلام کے محبوب ترین فرزند پر یہ الزام لگایا گیا جس کی ادنیٰ سے ادنیٰ سزا اُس کی ہلاکت کا موجب بن سکتی تھی۔

امیر المومنین نے بڑے حوصلے سے کہا۔ اے لڑکی! تیرا ذہن غلطی تو نہیں کرتا ——!

"اے نائب رسول! عورت اپنے بچے کے باپ کو کیونکر بھول سکتی ہے یقین فرمایئے کہ یہ ابو شحمہ کا ہی بچہ ہے۔"

خلیفۂ اسلام نے پھر سوال کیا۔ "کیا یہ بچہ حلال کا ہے یا حرام کا۔!"

"اے امت کے نگہبان —— میری جانب سے تو یہ بچہ حلال کا ہے لیکن ابو شحمہ کی طرف سے حلال کا نہیں ہے میں کمزور اور بے بس تھی۔ اپنے آپ کو ابو شحمہ کی گرفت سے بچا نہ سکی۔ اے کشتی اُمت کے ناخدا —! میں کہاں جاؤں اور کہاں سے کھاؤں، نہ میں عزیزوں کو منہ دکھانے کے قابل رہی ہوں۔ اور نہ ہی اس ذلت کے بعد غیروں میں

سما سکتی ہوں ——— !"

خلیفۂ رسول کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں اور فرمایا "بیٹی! واقعی تو ستائی گئی ہے۔ اگر ابو شحمہ نے ایسا کیا ہے۔ تو اسے دنیا کی کوئی طاقت شرعی احتساب سے نہیں بچا سکتی ——— !" یہ کہہ کر حضرت کھڑے ہو گئے حاضرین پر پھر سری نظر ڈالی حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔ اور لمبے لمبے ڈگ بھرتے گھر جا پہنچے ———

(۳)

اعترافِ جرم ———

امیر المومنین نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اور پوچھا "میرا بیٹا ابو شحمہ اندر ہے؟"

آپ کی اہلیہ محترمہ نے جواب دیا۔

ہاں وہ اندر ہے اور کھانا کھاتا ہے ——— !

"اُسے کہہ دیجئے کہ خوب جی بھر کر کھا لے۔ ممکن ہے کہ یہ اس کی زندگی کا آخری کھانا ہو ———"

یہ سن کر ابو شحمہ کے ہاتھ سے لقمہ گر پڑا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اِدھر دیکھنے لگے۔ حضرت عمرؓ قریب پہنچ چکے تھے۔ فرمایا

"ابو شحمہ! جانتے ہو میں کون ہوں ——— ؟"

ابوشحمہ۔ اَنْتَ اَبِیْ وَاَمِیْرُ الْمُؤْمِنِیْن ۔آپ میرے والد مہربان اور خلیفۂ اسلام ہیں۔

حضرت عمرؓ۔ کیا تجھ پہ کوئی میرا حق اطاعت واجب ہے؟

ابوشحمہ (لرزتی ہوئی آواز میں) ہاں مجھ پہ آپ کے دو حق ہیں۔

حضرت عمرؓ۔ تو میں اپنے حقوق کو درمیان میں لاکر پوچھتا ہوں۔ کیا تم نے سال بھر پہلے ایک یہودی کے ہاں شراب پی تھی۔

ابوشحمہ۔ جی ہاں۔! مجھے پلائی گئی تھی۔ اور جب مجھے ہوش آیا۔ تو میں نے توبہ کر لی۔ خدا شاہد ہے۔ کہ اس روز سے آج تک پھر کبھی شراب پینے کا اتفاق نہیں ہوا۔

حضرت عمرؓ۔ کیا یہ درست ہے کہ پھر تم بنی نجار کے باغ میں گئے، اور وہاں ایک عورت سے جبراً زنا کیا۔

ابوشحمہ شرم و ندامت سے پانی پانی ہو رہے تھے۔ شدت خوف سے ان کا رواں رواں کانپ رہا تھا۔ اعتراف جرم کا نتیجہ معلوم تھا۔ اسلئے چپ ہو رہے۔

امیر المومنین نے ذرا زور دے کر پوچھا۔ ابوشحمہ۔! جواب دو۔!! میں کیا پوچھ رہا ہوں ——————؟؟

"—— ہاں! جب میں یہودی کے گھر سے روانہ ہوا۔ تو

شراب کے نشہ میں بدمست ہو رہا تھا۔ نشّہ کے اسی عالم میں ہی اس لڑکی سے جبر ہوا۔ کاش! میں اُس یہودی کے ہاں جا کر مہمان نہ بنتا۔ ابو شحمہ اتنا کچھ کہنے پائے تھے۔ کہ امیر المومنین نے لپک کر اس کی کلائی کو اپنی آہنی گرفت میں لے لیا۔ اور مسجد نبوی کی طرف گھسیٹنے لگے۔

ابو شحمہ رو پڑے۔ کہا۔

"اے میرے باپ! مجھے لوگوں کے سامنے رسوا نہ کیجئے جو سزا دینی ہے۔ یہاں دے ڈالیے۔"

فرمایا "اے ابو شحمہ! کیا تو نے قرآن میں نہیں پڑھا وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَائِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ پھر تجھے درپردہ سزا کیسے دی جا سکتی ہے!

ابو شحمہ یہ سن کر بالکل مایوس ہو گئے۔ حضرت عمرؓ کشاں کشاں مسجد میں لے آئے۔ نقیب کو حکم ہوا شہر میں منادی کر دو کہ مسلمان ابھی مسجد نبوی میں حاضر ہوں۔ تاکہ مجرم پر حد قائم کی جائے۔

(۴)

یا افلح ———— !

نقیب روزانہ گرج گرج کر خلیفہ وقت کا حکم لوگوں کو سنایا کرتا تھا۔ لیکن آج اس کی آواز دبی دبی اور گھٹی گھٹی سی تھی۔ ایک ایک لفظ اس کے

حلق سے رُک رُک کر نکلتا تھا۔ اور آنکھیں وفورِ غم سے ڈبڈبا جاتی تھیں۔
لوگ گروہ در گروہ مسجد کی طرف آنے شروع ہوئے جب انبوہ کثیر جمع ہو گیا۔
تو امیر المومنین نے کھڑے ہو کر حمد و ثنا اللہ پر فصیح و بلیغ خطبہ دیا۔ اور فرمایا۔
خدا کی قسم! اس لڑکی نے سچ کہا تھا۔ ابوشحمہ نے اعتراف کر لیا ہے۔ کہ
واقعی اس نے بنی نجار کے باغ میں اس لڑکی کو بے عزت کیا تھا اسلئے
میں نے ابوشحمہ پر حدیں قائم کر دی ہیں۔ اسے آپ حضرات کی موجودگی
میں سو درے لگائے جائینگے۔ یہ کہہ کر امیر المومنین نے اپنے غلام کی طرف
دیکھا۔ اور اُسے پکار کر کہا۔

یا افلح! یا افلح!!

غلام نے چونک کر کہا۔

"لبیک یا امیر المومنین۔!"

مسجد نبوی کے صحن میں ایک دفعہ پھر گونج سنائی دی۔ "اپنا دُرّہ
سنبھال اور ابوشحمہ کو پاک کر!"

"افلح یہ حکم سن کر کانپ اُٹھا۔ اور روتے ہوئے کہا۔ اے میرے آقا!
یہ مجھ سے کیسے ہو سکتا ہے کہ میں اپنے آقازادے کے کوڑے لگاؤں میرے
حواس مختل اور با زو شل ہو چکے ہیں۔ خدا کے لئے مجھے معاف فرمائیں، اور
یہ کام کسی دوسرے کے سپرد کر دیں ——————

امیرالمومنین نے غضب ناک ہو کر کہا۔

"اے افلح! تجھے معلوم نہیں۔ کہ میری اطاعت خدا اور رسول کی اطاعت ہے۔ تو خدا اور رسول کے حکم سے گریز کرتا ہے؟ تجھے حدیں مارتا ہوں گی۔ اگر تو نے ارادتًا اس میں کوئی کوتاہی کی۔ تو اسے خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔"

افلح نے سہمی ہوئی نظروں سے فاروق اعظم پر نگاہ ڈال دیکھا۔ کہ قہر اور جلال سے امیرالمومنین کی آنکھیں شعلہ سجوالہ بن رہی ہیں۔ اور بدن غصّہ سے کانپ رہا ہے۔ سوچا کہ جو اپنے جگر گوشہ کے معاملہ میں اتنا سخت ہے، وہ میری کب پرواہ کریگا۔ ایسا نہ ہو۔ کہ نافرمانی کے جرم میں وہ میری کھال بھی ادھیڑ دے۔ لرزتا کانپتا ابوشحمہ کے پاس پہنچا۔ اور اس کے نازنین بدن سے لباس اُتارنے لگا۔ صحابہ اس رقت خیز منظر کی تاب نہ لاسکے ہر طرف سے صدائے گریہ بلند ہوئی۔ اس وقت امیرالمومنین کے پہلو میں بھی ایک درد سا پیدا ہوا۔ فولادی دل موم بن کر پگھلا۔ اور حق بین حق شناس نگاہوں سے آنسو کے چند قطرے ٹپک پڑے۔ گلوگیر ہو کر کہا۔

"اے نورچشم! اللہ تجھ پر رحم فرمائے۔ یہ سب کچھ میں اس لئے کر رہا ہوں کہ ہم دونوں قیامت کی رسوائی سے بچ جائیں۔"

پھر افلح کی طرف توجہ کی اور فرمایا۔

ہاں اِضرِب! مارے جا۔ خبردار رعایت نہ ہو۔

ابو شحمہ باپ کی طرف سے مایوس ہو گیا۔ اس نے آخری بار حاضرین پر نظر ڈالی۔ اس بڑے مجمع میں رشتہ دار بزرگ دوست سب کھڑے تھے مگر اپنی جگہ بے بس نظر آتے تھے۔ کہیں سے امید کی کرن دکھائی نہ دی تو نظریں زمین کی جانب جھک گئیں۔

(۵)

اِضرِب ــــــــــ!

افلح نے درہ سنبھال کر ابو شحمہ کے برہنہ جسم پر حدیں مارنا شروع کیں نتز درسے لگے تھے۔ کہ ابو شحمہ نے دردناک آواز میں چلا کر کہا "اے باپ! تھوڑا سا پانی پلا دیجئے!"

امیر المومنین نے بھرائی ہوئی آواز میں فرمایا۔

"بیٹا! صبر کر۔ خدا تیرے قصور معاف کرے۔ اب تو آبِ کوثر ہی تیری پیاس بجھائے گا ــــــــ!"

ساتھ ہی افلح سے کہا "اِضرِب جلدی جلدی تمام کوڑے ختم کر ڈال" اسّی کوڑے لگے تھے۔ کہ ابو شحمہ نڈھال ہو کر گر پڑے اور امیر المومنین کو الوداعی سلام کیا۔

حضرت عمرؓ روتے ہوتے بولے۔

وعلیکم السلام۔ اگر حضور رسالت پناہی میں پہنچنے کا شرف حاصل ہو۔ تو میرا سلام عرض کرنا۔ اور کہنا۔ کہ اے اللہ کے سچے نبی! تیرے خادم عمرؓ کو اس حالت میں چھوڑ آیا ہوں کہ قرآن پڑھتا تھا۔ اور اس کے مطابق احکام جاری کرتا تھا۔

افلح سے کہا اِضرِب

ابوشحمہ شدت کرب سے چلا رہا تھا۔ اور آپ فرماتے جاتے تھے

اے افلح! ذرا زور سے۔ ہاں زور سے ——— !!

۹۰ نوّے درے لگے تھے۔ کہ ابوشحمہ بے ہوش ہو گئے۔

صحابی یہ حالت دیکھ کر آگے بڑھے۔ اور عرض کی۔

اے امیر المومنین! ذرا ٹھہر جایئے۔ ابوشحمہ کی آواز سنائی نہیں دیتی۔ دیکھیں زندہ بھی ہے یا نہیں ——— !"

فرمایا۔ کہ جب گناہ میں تاخیر نہیں ہوئی تو سزا میں کیسے ہو سکتی ہے؟!

یہ سُن کر صحابی رونے لگے۔

(۶)

موت ———

امیر المومنین یہ فرما رہے تھے۔ کہ ابوشحمہ کی والدہ بیٹے کی فلک شگاف چیخیں سن کر باہر نکل آئی۔ چلا کر کہا۔

اے امیر المومنین! ابو شحمہ پر رحم فرمایئے۔ اور اسے چھوڑ دیجئے میں اس کے ہر بقایا درّے کے بدلے ایک پا پیادہ حج کروں گی اور زر کثیر صدقہ کے طور پر ادا کروں گی ——— !"

فاروق اعظم نے فرمایا" حج اور صدقہ سے حد پوری نہیں ہوتی افلح کو حکم ملا۔

"حد پوری کرو ——— !"

غلام نے درہ اُٹھایا! اور ابو شحمہ کی لہولہان کمر پر مارنا شروع کیا۔ جونہی آخری کوڑا پڑا۔ کابل سے مصر تک کی بڑی مملکت کے فرمانروا نے لپک کر اپنے دلبند کو اُٹھانے کی کوشش کی۔ مگر اس کا طائر روح قفسِ عنصری سے پرواز کر چکا تھا۔

سر زانو پر رکھ لیا۔ اور آسمان کی جانب دیکھ کر کہا۔

"اے باری تعالیٰ لاکھ لاکھ شکر ہے کہ بیٹے کے معاملے میں اپنے احکام پہ ثابت قدم رہنے کی توفیق عطا فرمائی ۔"

(۷)

خواب ———

ابو شحمہ کی لاش جنت البقیع میں دفن کر دی گئی۔ چالیس دن کے بعد حذیفہ یمانی نے حاضر ہو کر امیر المومنین عمرؓ نے عرض کی۔ کہ آج رات میں نے سرکار دو عالم

صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا۔ ابوشحمہ بھی ہمراہ تھا اور سبز رنگ کا لباس پہنے ہوئے تھا۔ حضور نے مجھے فرمایا:۔

اے حذیفہؓ! عمرؓ سے میرا سلام کہنا۔ واقعی اس نے قرآن پڑھا اور اللہ کے احکام کی تعمیل کا حق ادا کر دیا۔ حضرت عمرؓ یہ سن کر بیتاب ہو گئے اور آپ کی آنکھوں سے آنسو چھلکنے لگے۔

حذیفہؓ نے دوبارہ عرض کی۔

اس کے بعد میں نے ابوشحمہ کی طرف دیکھا۔ تو اس نے کہا۔

"اے حذیفہؓ! میرے باپ کو سلام کہنا۔ اور عرض کرنا کہ آپ نے حد جاری کر کے مجھے گناہوں سے پاک کر دیا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اجر عظیم عطا فرمائے ⁂

خلافت

بظاہر پھولوں کی سیج معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقت میں کانٹوں سے بھری ہوئی ایک خوفناک وادی ہے۔

امیرالمومنین عمرؓ

اُمُّ المومنین

مآخذ

۱۔ ابن خلدون
۲۔ تذکرۂ عالم
۳۔ سیّرِ معاویہ از شریف احمد زبیری
مطبوعہ حمیدیہ پریس دہلی

"اے عبداللہ! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ازواج مطہرات سے ہمیشہ انصاف کیا کرتے تھے۔ اس لئے جب میں مر جاؤں مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں ہرگز دفن نہ کرنا۔ ایسا نہ ہو کہ مخالفوں کو محض میری وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انصاف پر انگشت نمائی کا موقع مل جائے۔ مجھے بقیع میں میری سہیلیوں کے پاس ہی دفن کر دینا۔"

اور ——— ہاں ——— میں اس وجہ سے بھی روضہ اقدس میں دفن ہونا نہیں چاہتی۔ کہ اس میں حضرت عمرؓ دفن ہیں اور ان سے میں زندگی بھر پردہ کرتی رہی ہوں۔ ان سے مرنے کے بعد بھی حجاب لازم ہے۔!"

"ام المومنین عائشہؓ"

(۱)

امیر معاویہ مدینہ میں

۵۹ھ میں تقریباً سارا ملک یزید کی بیعت قبول کر چکا تھا۔ اب مدینہ ہی رہ گیا تھا جس کے باشندے یزید کی بیعت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر رہے تھے۔ اس لئے یہاں امیر معاویہ کو خود آنا پڑا۔ حج کے موقع پر ہزار سوار ہمرکاب لے مدینہ کو روانہ ہوئے۔ جب شہر کے قریب پہنچے۔ لوگ استقبال کو نکلے اور سب سے پہلے جن بزرگوں نے ملاقات کی۔ وہ سیدنا امام حسینؓ وابن عباسؓ تھے۔ امیر معاویہ دور سے دیکھتے ہی بڑے اشتیاق سے پکار اُٹھا۔ مرحبا یا ابن بنت رسول اللہ! اسی طرح ابن عباس کو بھی خوش آمدید کہی۔ پھر لوگوں کے ہجوم کی طرف متوجہ ہوئے۔

امیر معاویہؓ گو طویل سفر سے آرہے تھے۔ اور آپ پر بڑھاپا بھی چھا چکا تھا۔ لیکن اس کے باوجود آپ کے چہرے پر تھکاوٹ کا نشان تک نہ تھا۔ ہنس ہنس کر باتیں کرتے چلے آتے تھے۔ کبھی امام حسینؓ سے متوجہ ہوتے

اور کبھی ابن عباسؓ سے۔ خوش طبعی اور شگفتہ مزاجی پر شائستگی قربان ہوتی جاتی تھی۔ تینوں عرب سردار اپنی اپنی سواریوں پر مدینہ کو آ رہے تھے۔ دائیں بائیں اور پیچھے عورتوں بچوں اور مردوں کی بھیڑ تھی۔ جب دارالامارۃ قریب آیا امیر معاویہ اتر پڑے۔ اور امام حسین علیہ السلام رخصت ہو کر اپنے دولتکدہ کو تشریف لے گئے۔

کچھ دیر سستانے کے بعد امیر معاویہ امرائے مدینہ کو جلو میں لئے مسجد نبوی میں حاضر ہوئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور شیخین پر فاتحہ پڑھنے کے بعد منبر پر چڑھ بیٹھے اور اپنے بیٹے یزید کی تعریف کرنی شروع کی۔ کہا:

"میں نہیں جانتا کہ آج میرے بیٹے سے زیادہ کوئی خلافت کے اہل ہو اس میں جو خوبیاں ہیں وہ دوسروں میں نہیں ہیں۔ وہ السنہ شرفیہ کا عالم اور قرآن کا بہترین قاری ہے۔ وہ حلم اور حوصلہ میں بھی نظیر نہیں رکھتا چند مخالف لوگ اس سے ایسی باتیں منسوب کر رہے ہیں جن سے وہ آشنا تک نہیں جب تک میں انہیں عقوبت نہ کرونگا۔ یہ لوگ ایسی حرکتوں سے باز نہیں آئینگے۔ اگر حسین ابن علیؓ، عبداللہ بن عمرؓ، عبدالرحمٰن بن ابوبکرؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ نے یزید کی خلافت پر بیعت نہ کی تو میں ان سے وہ سلوک کروں گا کہ دنیا

لہ ما اعیانی شلہ عند کما عند غیرکما، مع علمہ بالسنۃ وقراءۃ القران والحلم

(الامامۃ والسیاسۃ)

عبرت پکڑے گی ------!

منبر سے اُتر کر ام المومنین کے دروازے پر آیا۔ اور حاضر ہونے کی اجازت طلب کی۔ اُم المومنین نے کہلا بھیجا۔ کہ "وہ تنہا آسکتے ہیں"۔ چنانچہ امیر معاویہ بھیڑ بھاڑ کو باہر چھوڑ کر اندر داخل ہوئے۔ اس وقت مخدومہ کا آزاد غلام ذکوان جنابہ کے پاس موجود تھا۔

اُم المومنین کو امیر شام کی تازہ تقریر کی اطلاع ہو چکی تھیں۔ اس وقت آپ پر غضب کا عالم طاری تھا۔ خشمناک ہو کر فرمایا۔

"اے معاویہ! تو نے میرے بھائی محمد کو مصر میں ذبح کر کے آگ میں جلایا اور آج مدینہ میں آکر میرے دوسرے بھائی کو ایذا دینا چاہتا ہے۔ نیز فرزند رسول حسینؑ، ابن عمرؓ اور ابن زبیرؓ کو تو نے حبس اور قتل کی دھمکیاں دی ہیں کیا تو نہیں جانتا۔ کہ تو طلقا سے ہے اور طلقا کو خلافت کا دعویٰ زیب نہیں دیتا ------

ہاں یہ بھی سن کہ تیرا باپ احزاب کے لشکریوں میں سے تھا۔ اور اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی، میں نہیں سمجھتی کہ تجھے مجھ سے ملاقات کی جرأت کیسے ہوئی ------!

اگر میں تجھے اپنے بھائی کے قصاص میں قتل کرا دوں۔ تو تجھے کون روک سکتا ہے۔؟

ام المومنین بڑے جوش سے تقریر فرما رہی تھیں۔ معاویہ کا رنگ فق تھا اور ندامت سے پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔ انتہائی لجاجت سے بولا۔
"اے ام المومنین! نرمی سے گفتگو کیجئے۔ میں نے نہ آپ کے بھائی کو قتل کیا ہے اور نہ قتل کرنے کا حکم دیا ہے۔ میں ان کے قتل پر رضامند بھی نہیں تھا۔ اور آپ نے جو مجھے قصاص میں قتل کرنے کی دھمکی دی ہے اس وقت میں رسول اللہ کے شہر میں ہوں۔ اور یہ مکان دارالامن ہے۔!"
مخدومہ نے فرمایا" لئے معاویہ! یہ درست ہے۔ کہ مدینہ دارالامن ہے۔ لیکن پھر تو نے فرزند رسول حسین رض، میرے بھائی عبدالرحمٰن، میرے بیٹے عبداللہ اور ابن عمر رض کو دھمکیاں کیوں دی ہیں۔ تجھے اور تجھ جیسے آدمیوں کو یہ حق کب پہنچتا ہے کہ ان صاحبزادوں کے بارہ میں ایسے نا ملائم الفاظ استعمال کرے ———!"
معاویہ بولا۔ معاذ اللہ میں آپ کی مرضی کے خلاف کیسے چل سکتا ہوں یہ لوگ مجھے اپنی آنکھوں سے بھی زیادہ عزیز ہیں ان کا دوست میرا دوست ان کا دشمن میرا دشمن ہے۔ اگر کوئی ان سے متعرض ہو۔ تو میں اسکے ٹکڑے اُڑا دوں ———!"
ان باتوں سے ام المومنین کا غصہ فرو ہو گیا۔ آپ نے اللہ اور اس کے رسول کی تعریف کی ابوبکر رض اور عمر رض کا ذکر کیا۔ اور فرمایا۔ اے معاویہ! ان لوگوں

کا عمل تمہارے لئے مشعل راہ ہے۔ تجھے ہر حالت میں ان کی پیروی کرنی چاہیئے ——

"اے معاویہ! خدا کو حاضر ناظر جان اور تنگ قبر اور اس دنیا کی مفارقت سے ڈر۔ ایسا کام نہ کر جس سے تجھے پشیمان ہونا پڑے۔"

امیر معاویہ بولا۔

"اے ام المومنین! خدا کی قسم!! آپ اللہ اور رسول کے احکام کی عالمہ ہیں۔ اور اس امر کا حق رکھتی ہیں کہ آپ کے احکام کی تعمیل کی جائے اور آپ کے ارشادات کو دل میں جگہ دی جائے۔ آپ ہی انصاف فرمائیں کہ اسلامی دنیا یزید کی خلافت پر بیعت کر چکی ہے۔ صرف یہی چار صاحبزادے اپنی ضد پر اڑے ہوئے ہیں۔ کیا آپ یہ جائز سمجھتی ہیں۔ کہ میں مسلمانوں سے کیے ہوئے مواعید ترک کر دوں ——!

"اے معاویہ! میں یزید کی بیعت سے کچھ واسطہ نہیں رکھتی۔ لیکن یہ ضرور کہوں گی۔ کہ ان چاروں جوانان عرب سے نرمی کا سلوک کر اور ان کے معاملے میں جلد بازی سے کام نہ لے۔!"

معاویہ کھڑے ہو گئے۔ ام المومنین نے ٹوک کر کہا۔

"اے معاویہ! ذرا یہ تو بتا۔ کہ جب تو نے حجر بن عدی اور دوسرے زاہد عابد صحابہ کو قتل کر دینے کا حکم دیا تھا۔ تیرا حلم اس وقت کہاں گیا تھا ——؟"

کہا "اے ماں! ان باتوں کو چھوڑیئے۔ ہاں! آپ مجھے یہ بتایئے کہ کیا آپ کو وظیفہ باقاعدہ مل رہا ہے۔ اور آپ کی گذر اوقات کے لئے کافی ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی تکلیف ہو۔ تو بیان فرمایئے۔

"مجھے اپنی ذات کے لئے کچھ نہیں چاہیئے معاویہ! جو کچھ مل رہا ہے۔ وہ میری گذر اوقات کے لئے بہت کافی ہے۔" اُم المومنین نے متانت سے جواب دیا۔

"تو پھر ان لوگوں کے اور ہمارے معاملے کو خدا پر چھوڑ دیئے" معاویہ یہ کہہ کر اُم المومنین کے گھر سے باہر نکلا۔ ذکوان اس کے ساتھ تھا۔ اور امیر معاویہ نے اس کے ہاتھ کا سہارا لے رکھا تھا۔

وہ چل رہا تھا۔ اور کہتا جا رہا تھا۔

"خدا کی قسم! میں نے رسُول اللہ کے بعد عائشہؓ سے زیادہ کسی کو فصیح نہیں دیکھا۔"

(۲)

اُم المومنین کے قتل کا منصوبہ

امیر معاویہ واپس جا چکے تھے اور یزید کی بیعت کا فتنہ روز بروز شدت

تاللہ ما رایت کالیوم قط خطیبًا ابلغ من عائشۃ بعد رسول اللہ ﷺ الا انہ والسیاستہ

اختیار کرتا جا رہا تھا۔ بنو امیہ کے باقی افراد کی نسبت مروان کو اس امر کی زیادہ فکر تھی۔ کیونکہ اس کی بحالی یزید کی بیعت سے مشروط ہو چکی تھی۔ گو ولید بن عتبہ یزید کا چچا زاد بھائی تھا۔ مگر اس معاملے میں وہ بھی اس قدر تشدد نہیں تھا۔ اسے حکومت سے گراں قدر وظیفہ مل رہا تھا۔ جس سے اس کا نہایت ٹھاٹھ سے گزارہ ہو رہا تھا تاہم حاکمانہ اقتدار کی ہوس اُسے چین سے نہ بیٹھنے دیتی تھی۔ اگرچہ سیدنا امام حسنؓ کو ان کی اہلیہ نے زہر دی تھی لیکن بعد میں یہ راز از خود فاش ہو گیا تھا۔ کہ زہر دلانے کا ناپاک منصوبہ اسی بدبخت کا سوچا ہوا تھا۔ اس کی توجہات مدینہ کے ان بزرگوں پر مرتکز ہو چکی تھیں۔ جو یزید کو خلافت کا اہل نہیں سمجھتے تھے۔ لیکن چونکہ اُمّ المومنین کی موجودگی میں ان بزرگوں سے متصادم ہونے کی ہمّت نہیں پڑتی تھی۔ اسلئے یہ لعین ام المومنین کی شمعِ حیات گُل کرنے پر آمادہ ہو گیا۔

۳

قصرِ ابیض

مروان کا محل اپنی خوبصورتی اور دلفریبی کے سبب مدینہ کی عمارات میں خاص امتیاز رکھتا تھا۔ عین الازرق کے پانی نے اسے "فردوس بر روئے زمین بنا دیا تھا۔ پچھلے دنوں جب امیر شام مدینہ تشریف لائے تھے، تو مروان نے اسی محل میں ان کی ضیافت کی تھی۔ معاویہ نے جب اس کے

ہرے بھرے باغ اور سنگین قصر کو دیکھا۔ تو وہ حیران رہ گیا۔ اور کہا مروان! تو نے تو مدینہ میں دمشق کا سا ماحول پیدا کر لیا ہے۔ آج کل مروان نے اسے سازشوں کے لئے وقف کر رکھا تھا۔ چونکہ ام المومنین نے امیر معاویہ کو سخت الفاظ میں زجر و توبیخ فرمائی تھی۔ اور اس کے ناشائستہ اعمال پر بھی کئی دفعہ ٹوک چکی تھیں اس لئے مروان نے سب سے پہلے انہیں ٹھکانے لگانے کا منصوبہ سوچا۔

حارث اس کا سادہ لوح غلام تھا۔ وہ صرف کام کرنا جانتا تھا۔ اس کے عواقب اور نتائج پر غور کرنا اس کے مقاصد میں داخل نہیں تھا۔ مروان بالعموم اس کی سادہ لوحی سے فائدہ اُٹھایا کرتا تھا۔ اس نے کئی دنوں کی مسلسل سوچ وبچار کے بعد یہ فیصلہ کیا۔ کہ ام المومنین کو دعوت کے بہانے گھر بلایا جائے۔ ایک گڑھا پہلے سے تیار رہو۔ جس میں زہر آلود چھریاں تلوا دیں پڑی ہوں۔ ام المومنین کو اس میں گرا کر ختم کر دیا جائے لیکن اس منصوبے میں شریک کرنے کے لئے اسے کوئی راز دار نہیں ملتا تھا عبدالملک[1] اکثر وقت مسجد نبوی میں بسر ہوتا تھا۔ اس لئے لوگ اسے حمامتہ المسجد (مسجد کی کبوتری) کہنے لگے تھے۔ عبدالعزیز بھی خاصہ متدین تھا۔ لڑکی عاتکہ بھی بڑی نیک بخت تھی اس لئے وہ ان کو اپنے مشوروں میں داخل کرنے سے گھبراتا تھا چنانچہ اُس نے اپنے پرانے رفیقوں ہشام اور صفوان کی طرف رجوع کیا۔

[1] مروان کا بڑا بیٹا

یہ دونو شیطان مروان کی طرح انتہا پسند اور شقی القلب واقع ہوئے تھے وہ اس کی امداد پر تیار ہو گئے۔ صفوان کی بیوی نارغہ بھی اس غرض کیلئے بلائی گئی۔ حارث کو پہرے پر مقرر کیا۔ اور یہ سب مل کر قصر ابیض کے جنوبی کمرے میں گڑھا کھودنے لگے۔ جب کافی گہرا کھد چکا۔ تو اس میں نیزے چھریاں اور تلواریں وغیرہ چھپا دیں۔ اور اوپر خوبصورت فرش سا بچھا دیا۔

طے پایا۔ کہ دعوت کے دن نارغہ اُم المومنین کو اپنے کندھے کا سہارا دیتی مسند تک لائے گی۔ ان کے گڑھے میں گرتے ہی نارغہ اپنی سہیلی ہندہ کی مدد سے ام المومنین کو باہر نکالے گی۔ صفوان اور ہشام طرفۃ اللعین میں گڑھے کو مٹی سے پُر کر دیں گے اور کسی کو معلوم بھی نہیں ہو سکے گا۔ کہ ام المومنین کیونکر زخمی ہوئی ہیں۔

(۴)

دعوت ———

"بیٹا اُم المومنین عائشہؓ کافی عرصہ سے مجھ پر ناراض چلی آتی ہیں تم اپنی بہن کے ہمراہ ان کی خدمت میں حاضر ہو کر میری طرف سے سلام عرض کرو۔ اور گھر پر مدعو کر کے لے آؤ ———!"

یہ کہہ کر مروان نے انتہائی مکاری سے اپنے جواں سال فرزند عبدالملک پر نظر ڈالی۔

آپ کا خیال مبارک ہے لیکن آپ خود کیوں نہیں چلتے؟" عبدالملک نے باپ کو گھورتے ہوئے کہا۔

آہ۔ کیا کروں۔ مجھ سے اس قدر غلطیاں سرزد ہوئی ہیں۔ کہ ان کی خدمت میں حاضر ہونے سے شرماتا ہوں۔ تم دونوں سے ام المومنین کا گہرا رابطہ ہے۔ اُنہیں کسی نہ کسی طرح یہاں لے آؤ۔ اس جگہ میں ان سے معافی مانگ لونگا۔ امید ہے وہ دریا دل خاتون ضرور معاف کر دے گی۔"

"بہتر! میں آج ہی اس اَمر کی کوشش کرونگا۔" عبدالملک نے جواب دیا۔

دوسرے دن عبدالملک اپنی چھوٹی بہن عاتکہ کو ہمراہ لے کر اُم المومنین کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور انتہائی لجاجت سے اپنے گھر آنے کی دعوت کی عاتکہ بے حد عابدہ اور صالحہ لڑکی تھی۔ وہ گاہے گاہے ام المومنین کی خدمت میں حاضر ہوا کرتی تھی۔ اس نے مسجد نبوی کا ایک دروازہ بھی اپنے خرچ سے بنوا دیا تھا۔ جو بعد میں باب عاتکہ سے مشہور ہوگیا۔ اُم المومنین اسے بہت عزیز رکھتی تھیں۔ اس لئے جب اس نے بہت اصرار کیا۔ تو ام المومنین انکار نہ کر سکیں۔ لیکن چونکہ رمضان شریف کے ایام تھے۔ اس لئے طے یہ ہوا۔ کہ ۵ اکی شام کو عبدالملک عاتکہ سمیت آئے گا اور محبوب ربِّ کائنات کی اہلیہ محترمہ کو سوار کر کے لے جائیگا۔ اور افطاری وہیں ہوگی۔

۵

رمضان ۵۸ھ کی ایک شام

ام المومنین کا سن شریف ۶۶ سال سے متجاوز ہو چکا تھا۔ اور ان دنوں طبع مبارک بھی قدرے ناساز رہتی تھی۔ اس لئے کہیں آنا جانا نہیں ہوتا تھا۔ آپ نے عاتکہ کی منت سماجت سے مروان کے گھر جانا منظور تو کر لیا لیکن جب آلِ صدیق کو علم ہوا۔ تو ان سب نے اس امر کی مخالفت کی۔ عبداللہ بن زبیر اور قاسم بن محمدؒ نے تو صاف الفاظ میں کہہ دیا۔ کہ آپ کا مروان کے گھر جانا خطرے سے خالی نہیں ——— !

اُم المومنین کی ذات خانگی تنازعات سے بالاتر تھی۔ فرمایا "میری سرکار نے تو یہودیوں کی دعوت کو بھی رد نہیں کیا تھا۔ میں ایک مسلمان کی درخواست کو کیسے ٹھکراؤں ——— ! مروان کے مکار و عیار ہونے میں شبہ نہیں۔ لیکن اس کا لڑکا عبدالملک اور اس کی لڑکی عاتکہ ایسے نہیں ہیں ——— !!" ۱۵ رمضان کو عصر کے وقت عبدالملک اور عاتکہ سواری لے کر آ پہنچے۔ جب اُم المومنین اوراد و اذکار سے فارغ ہو گئیں تو عاتکہ نے سہارا دے کر آپ کو خچر پہ سوار کیا۔ عبدالملک نے لگام پکڑی۔ اور یہ مختصر سا قافلہ قصرِ مروان کو روانہ ہوا۔

(۶)

مروان کی شیطانی تدبیریں ——— !

دھوپ زرد ہو چکی تھی اور جبل سلع پر سورج کے انعکاسی عمل سے عجیب کیفیت منعکس ہو رہی تھی۔ مضافات کے جفاکش بدو دن بھر کی محنت مزدوری کے بعد اپنے خچروں اور گدھوں کو ہانکے گھروں کو واپس لوٹ رہے تھے اسی عالم میں مدینہ کا سابق گورنر مروان لمبی چادر میں لپٹا پلے پہ پلے چمن کی روشوں پر چکر کاٹ رہا تھا۔ اس کے بشرے سے ظاہر ہوتا تھا۔ کہ وہ کسی خاص ذہنی کوفت میں مبتلا ہے۔ صفوان اور ہشام بنو امیہ کے دو شیطان بھی اس کے پاس کھڑے تھے۔ فارعہ اور ہندہ قصر کے صحن میں بیٹھی کھسر پھسر کر رہی تھیں۔ اتنے میں اس کا غلام حارث داخل ہوا۔

"کیوں ؟ کیا خبر ہے ؟؟" مروان نے ڈانٹ کر کہا۔

"ام المومنین تشریف لا رہی ہیں"۔ حارث نے سہم کر جواب دیا۔

"خوب !" آخر شکار دام میں پھنس ہی گیا ——— !!" بنو امیہ کے شیطان نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"یہ اُم المومنین کا آخری دن ہے اس کے بعد جیت ہماری ہے —!"

مروان نکروہ ہنسی ہنستا اپنے رفیقوں کی طرف بڑھا۔ اور کہا اپنے کام کی فکر کرو۔!

حارث کو دروازے پر کھڑا کر کے تاکید کی کہ میری اجازت کے بغیر

کسی کو اندر مت گھسنے دینا۔ سمجھے ـــــــ!! حارث کے لئے اتنا کافی تھا۔ مروان نے قہر بار نظروں سے گھورتے ہوئے دوبارہ کہا "خواہ عبدالملک اور عاتکہ کیوں نہ ہوں ـــــــ!!"

مروان کی اپنی رہائش اس محل کے دوسرے حصے میں تھی جس کو سرخ رنگ کی مناسبت سے قصرِ احمر کہہ کر پکارتا تھا۔ اس میں خادمائیں روٹیاں پکانے اور باورچی گوشت بھوننے[1] میں مصروف تھے۔ بنو امیہ کے اکثر زن و مرد اس تقریب پر مدعو تھے۔ مگر وہ سب اسی حصے میں فروکش تھے بنو امیہ کی لڑکیاں اُمّ المومنین کو ملنے کے لئے دروازے پر جمع ہو گئی تھیں۔ مروان نے ان سب کو یہ کہہ کر ٹال دیا۔ کہ جب تک اُمّ المومنین افطار نہ کرلیں۔ تمہارا اندر آنا اور ان سے ملنا اُمّ المومنین کے لئے تکلیف کا باعث ہوگا۔ اسلئے وہ سب لوٹ گئیں۔

(۷)

ہلاکت ـــــــ

اُمّ المومنین خچر سے اُتر کر عاتکہ کی راہنمائی میں دروازے کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ جونہی مخدومہ کونین نے قصرِ ابیض کی دہلیز پر قدم رکھا۔ مروان انتہائی مکاری سے آگے بڑھا اور سرنگوں ہو کر جواہرات کا تھال نذر میں پیش

[1] عہدِ صحابہ میں گوشت بھون کر کھانے کا زیادہ رواج تھا۔

کیا۔ اُمّ المومنین نے بے پروائی سے، اچٹتی ہوئی نظر ڈال کر فرمایا:۔

"مروان! ہمارے لئے ان پتھروں میں دلکشی کا کوئی سامان نہیں ہے۔ اگر نیت صالح ہے تو مدینہ کے محتاجوں اور درویشوں میں بانٹ دے!"

عبدالملک نے ـــــ ہاتھ بڑھا کر باپ سے تھال لے لیا۔ اور چھوٹے بھائی عبدالعزیز سے کہا۔ کہ اسی وقت مسجد نبوی میں جا۔ وہاں جو فقراء ملیں۔ یہ جواہرات ان میں تقسیم کر دے۔

مروان کا اشارہ پا کر فارغہ آگے بڑھی۔ اور ام المومنین کو کندھے کا سہارا دے کر مسند کی طرف چلنے لگی۔ عاتکہ کو مروان نے گھر میں بھیج دیا۔ کہ مخدومۂ کائنات کے لئے افطار کا سامان کرے۔ عبدالملک کو مردانے میں کھانا بھجوانے پر مقرر کیا۔ تمام لوگ افطاری کے انتظامات میں لگ گئے۔ بھیڑ چھٹ چکی تھی۔ حارث ننگی تلوار لئے دروازے پر پہرہ دے رہا تھا۔ صفوان اور ہشام قصر ابیض کے ایک جانب دبکے بیٹھے تھے۔ ام المومنین لحظہ بہ لحظہ ہلاکت کے گڑھے کے قریب تر ہوتی جا رہی تھیں۔ مروان گریہ مسکین بنا مخدومہ کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ اور جنابہ اسے مخاطب کر کے کہتی جا رہی تھیں:۔

"اے مروان! ہم سب ملک عدم کے مسافر ہیں ہمیں ایسا کوئی کام نہیں کرنا چاہیئے۔ جس سے خدا اور رسول ـــــــــــ

اتنا کچھ کہنے پائی تھیں۔ کہ دھڑام سے گڑھے میں جا پڑیں۔ اور شدت درد سے کراہتے ہوئے فرمایا۔

"اے بدبخت! تو نے یہ کیا کیا ــــــــــــ!"

زہر میں بجھے ہوئے نیزے، سم آلود تلواریں اور چھریاں وجود مقدس میں کھب گئیں۔ زہر آہستہ آہستہ بدن میں سرایت کرنے لگا۔

سورج غروب ہو چکا تھا۔ مسلمان مسجدوں میں روزہ افطار کر رہے تھے۔ لیکن شہنشاہ کونین کی محبوب ترین رفیقۂ حیات گڑھے میں پڑی کراہ رہی تھی۔

فارغہ اور ہندہ نے لپک کر اُمّ المومنین کو گڑھے سے نکالا۔ صفوان اور ہشام نے بیک جنبش نظر گڑھے کو مٹی سے پُر کر کے اس طرح سے فرش بچھا دیا کہ گویا یہاں کوئی گڑھا تھا ہی نہیں۔ فارغہ اور ہندہ اُمّ المومنین کو بستر پر لٹا کر مرہم پٹی میں لگ گئیں۔ جب ادھر سے دلجمعی ہو گئی۔ تو مروان دروازے پر پہنچا۔ اور عبدالملک کو پکار کر کہا۔

"اُمّ المومنین دفعتہً سخت بیمار پڑ گئی ہیں۔ ان کے بھائی عبدالرحمٰن کو اطلاع کرو۔

عبدالملک باپ کی سرشت سے بخوبی واقف تھا۔ اس خبر سے اس کا ماتھا ٹھنکا۔ اس نے کہا۔ ہو نہو۔ یہاں بھی باپ کی شقاوت کام کر گئی۔

قہر وعتاب کی نظر سے مردود باپ پر نگاہ کی وہ اس طرح کھڑا باتیں بنا رہا تھا، گویا اُمّ المومنین کی ناسازیٔ طبع میں اس کا کچھ دخل ہی نہیں۔ یا تو فنی کی زبان قینچی کی طرح چل رہی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

معلوم ہوتا ہے۔ اُمّ المومنین روزہ کی سختی کو نہیں سہار سکیں۔ مسند پر پہنچتے ہی بے ہوش ہو کر گر پڑیں۔ شکر ہے۔ کہ انہوں نے ابھی یہاں کھانا نہیں کھایا ورنہ خدا معلوم مخالف کیا گل کھلاتے ——— !"

عبد الملک نے عاتکہ کو بلا کر اُمّ المومنین کی خدمت میں روانہ کیا اور خود بسرعت سے مسجد نبوی میں جا پہنچا۔ ابن زبیرؓ نماز سے فارغ ہو کر قبر شریف پر فاتحہ پڑھ رہے تھے۔ عبد الملک نے قریب پہنچ کر آہستگی سے کہا۔

ام المومنین ہمارے گھر بیہوش پڑی ہیں۔ جلد پہنچیے۔

ابن زبیرؓ ام المومنین کے متبنّٰی تھے۔ اِن کے نام کی رعایت سے جناب کی کنیت اُمّ عبد اللہ مشہور تھی۔ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹے۔ اور کہا "کمبخت! کیا کہتے ہو ——— ؟"

عبد الملک نے دوبارہ جی کڑا کر کے کہا۔ میں نے کہا ہے ام المومنین ہمارے گھر میں بیہوش پڑی ہیں۔ جلد پہنچیے۔

"لعنت بہ کار شیطان ———" ابن زبیرؓ نے جھنجلا کر کہا۔ مجھے پہلے سے خدشہ تھا۔ کہ تم لوگ ام المومنین سے یقیناً کوئی فریب

کھیل رہے ہو ———!"

عبدالملک ندامت سے چپ ہو رہا۔

ابن زبیرؓ لمبے ڈگ بھرتا ہوا عبدالرحمن کے مکان پر پہنچا۔ آواز دیکر اُم المومنین کے حادثۂ فاجعہ کی اطلاع دی اور ان کی انتظار کئے بغیر قصر مروان کو چل دیا۔

(۸)

ابن زبیرؓ ———

اُم المومنین پر بدستور غشی طاری تھی۔ ابن زبیرؓ نے یا اُمیّ! یا اُمی!! کہہ کر آواز دی۔ مگر مخدومہ نے آنکھ نہ کھولی۔ عبداللہ نے مروان پر غضب آلود نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"ظالم! تیرے لئے باقی یہی کام رہ گیا تھا۔ اب خوش ہو کہ تجھے ٹوکنے والی زبان خاموش ہو گئی"۔

مروان نے کھسیانا ہو کر کہا۔

"برادرِ من! آپ کو غلط فہمی ہو رہی ہے۔ اُم المومنین نقاہت کے سبب روزہ کی متحمل نہیں ہو سکیں۔ سوائے اس کے اور کوئی بات نہیں —!"

اُم المومنین کی چادر پر خون کے دھبے دیکھ کر ابن زبیرؓ کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ اتنے میں ابوبکر صدیق کے اور بیٹے پوتے بھی آ گئے۔ سب

جوش سے بپھر رہے تھے۔ مروان اور اس کی اولاد موقع کی نزاکت کو دیکھ کر قصرِ ابیض سے باہر نکل گئی۔ یہاں تک کہ عاتکہ کو بھی عبدالملک دھکیل کر لے گیا۔ صفوان اور ہشام تو پہلے سے ہی فرار ہو چکے تھے۔ ام المومنین کی حالت لحظہ بہ لحظہ خطرناک ہوتی چلی جا رہی تھی۔ اس لئے آل صدیق کے نوجوان ام المومنین کی چارپائی اٹھا چپ چاپ واپس لوٹ آئے۔

۹

اُم المومنین کا سفرِ آخرت

مدینہ منورہ میں اُم عاصم ایک پختہ کار خاتون رہتی تھی۔ اسے فن جراحت میں کامل دستگاہ حاصل تھی۔ اُس نے اُم المومنین کے زخم سے اور زہر زائل کرنے کی کوشش کی۔ اُم عاصم کی جد و جہد سے اتنا فائدہ ہوا کہ اُمّ المومنین پر جو غشی طاری تھی۔ وہ ہٹ گئی۔ ۱۶ رمضان کو ظہر کے وقت ابن زبیرؓ نے قریب ہو کر سنا۔ تو آپ کہہ رہی تھیں:۔

وَآخَرُونَ اعْتَرَفُوا بِذُنُوبِهِمْ خَلَطُوا عَمَلًا صَالِحًا وَآخَرَ سَيِّئًا

لرزتی ہوئی آواز میں فرمایا۔

"آہ میں بھی اسی زمرہ میں ہوں ———"

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ قاسم بن محمد باہر گئے۔ دیکھا کہ عبداللہ بن عباس کھڑے ہیں۔

واپس آکر اُم المومنین سے عرض کی ابن عباسؓ تشریف لائے ہیں اگر اجازت ہو تو اندر لے آؤں۔

فرمایا۔ "ہاں ضرور لے آؤ ——— !"

ابن عباس اندر داخل ہوئے۔ اُم المومنین حجرہ شریف کے قرب کی وجہ سے چٹائی پر لیٹ رہی تھیں۔ ابن عباسؓ نے سلام کہہ کر مزاج پرسی کی۔

فرمایا۔

"اے کاش! میں درخت کیوں نہ ہوئی۔ کہ لوگ مجھے کاٹ ڈالتے۔!"

"اے کاش میں مٹی ہوتی ——— !"

"اے کاش میں دنیا میں پیدا ہی نہ ہوتی ——— !"

ابن عباسؓ قریب بیٹھ گئے۔ انہوں نے محسوس کیا۔ کہ مخدومہ پر موت کی ہیبت طاری ہے۔ فرمایا۔

"اے اُم المومنین! آپ خوف و ہراس کو بالکل دور کر دیں کیونکہ آپ بخشش اور رزق کریم کے وعدہ پر جا رہی ہیں۔"

اُمّ المومنین کے چہرے پر مسکراہٹ کے آثار نمایاں ہوئے ابن عباسؓ نے سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا۔

اسے مادرِ مومناں! یہ آیت آپ کے حق میں آئی ہے۔

"اَلطَّیِّبَاتُ لِلطَّیِّبِیْنَ وَالطَّیِّبُوْنَ لِلطَّیِّبَاتِ" یہ آیت سُن کر فرطِ مسرت

سے آپ بے ہوش ہو گئیں جب ذرا سکون ہوا۔ تو فرمایا۔

اے ابن عباس! خداوند کریم نے مجھے نو چیزیں ایسی عطا فرمائی ہیں جو رسول اللہ کی اور کسی بیوی کو نہیں ہیں ــــــــ

۱۔ جبرائیل علیہ السلام نکاح سے پہلے میری تصویر لے کر حضور کے پاس آئے۔

۲۔ رسول اللہ نے مجھ سے اس حال میں شادی کی کہ میں کنواری تھی۔

۳۔ رسول اللہ کا وصال میرے ہی آغوش میں ہوا۔

۴۔ آپ کی قبر میرے ہی مکان میں بنی۔

۵۔ میرے پاس رسول اللہ پر وحی نازل ہوا کرتی تھی۔

۶۔ میں رسول اللہ کے یار غار صدیق اکبر کی بیٹی ہوں۔

۷۔ جب منافقوں نے مجھ پر تہمت لگائی۔ تو میری برات وعصمت کی شہادت خود خدا تعالے نے دی۔

۸۔ میں خود پاک ہوں۔ اور پاک بندے کیلئے پیدا ہوئی ہوں۔

۹۔ خدا نے میرے لئے بخشش و رزق کریم کا وعدہ فرمایا۔

ابن عباس نے فرمایا۔

"اے اُمّ المومنین! آپ سچ فرماتی ہیں۔"

اس کے بعد کافی دیر تک جنابہ کو ڈھارس دیتے رہے جب وہ تشریف

سے گئے۔ تو مخدومہ نے عبداللہ بن زبیرؓ کا ہاتھ تھام کر فرمایا:۔
"اے بیٹا۔ میرا سفرِ آخرت قریب ہے۔ میری وصیت کو ذرا غور سے سن۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ازواج مطہرات سے ہمیشہ انصاف کیا کرتے تھے۔ اس لئے جب میں مرجاؤں۔ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں ہرگز دفن نہ کرنا۔ ایسا نہ ہو کہ مخالفوں کو محض میری وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انصاف پر انگشت نمائی کا موقع مل جائے۔ مجھے بقیع میں اپنی سہیلیوں کے پاس ہی دفن کر دینا۔"
ہاں ——— ! میں اس وجہ سے بھی روضہ اقدس میں دفن ہونا نہیں چاہتی۔ کہ اس میں حضرت عمرؓ دفن ہیں۔ اور ان سے میں زندگی بھر پردہ کرتی رہی ہوں۔ ان سے مرنے کے بعد بھی حجاب لازم ہے۔"
اس کے بعد ام المومنین ذکرِ الٰہی میں مصروف ہو گئیں۔
بیماری کے ایام میں یہ کیفیت رہی کہ آپ پر مستقل طور پر غشی سی طاری رہتی۔ جب اذان کی آواز سماعت علیا میں پہنچتی۔ طبیعت ذرا سنبھل جاتی آلِ صدیق کی بہو بیٹیاں سہارا دے کر وضو کراتیں۔ لیکن نماز کے بعد وہی غشی طاری ہو جاتی۔ ۱۷ رمضان ۵۸ھ کو ام المومنین کی حالت زیادہ مخدوش ہو گئی۔ ضعف لمحہ بہ لمحہ بڑھنے لگا۔ مخدومہ نے دایاں ہاتھ سینے پر رکھا ہوا تھا اور پے بہ پے اسم ذات کا ورد فرما رہی تھیں۔ سرعت تنفس کی اسی حالت کا

احساس کر کے بی بی اسماء اور دوسری خواتین رو رہی تھیں۔ دوپہر کو مایوسی کے آثار ظاہر ہوتے اور ظہر کے وقت محرم اسرار نبوت کی روح اعلیٰ علیین کو پرواز کر گئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

مدینہ میں ایک کہرام سا برپا ہو گیا مضافات میں بھی یہ خبر سرعت سے پھیل گئی۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگ جمع ہو گئے۔ اور ام المومنین کے جنازہ کو لپٹ لپٹ کر رونے لگے۔ ہر شخص مروان پر لعنت بھیج رہا تھا۔ شام کے وقت لاکھوں میں ام المومنین کا جنازہ بڑے تزک اور احتشام سے اٹھایا گیا۔ مروانیوں کے سوا سارا شہر ہمراہ تھا۔ سب پر حزن وملال طاری تھا۔ مدینہ کے در و دیوار بھی سوگوار نظر آتے تھے۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے آپ کا جنازہ پڑھا۔ اور ٹھیک اس وقت جبکہ مسجد نبوی کے مأذنہ سے اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہ کی صدا بلند ہو رہی تھی۔ ام المومنین کے جسد اطہر کو صاحب لولاک کی دوسری بیویوں کے پہلو میں دفن کیا جا رہا تھا۔

ابوحازمؓ

ماخذ

الامامتہ والسیاستہ

آج کل نظام عالم میں کچھ ایسا فتور پیدا ہو گیا ہے کہ راستی اور راست روی قابل اعتراض خیال کی جاتی ہے۔ زمیندار کے سامنے مزارعہ، سرمایہ دار کے آگے مزدور افسر کے آگے ماتحت کو سچ کہنے کا کوئی حق نہیں ——————

—————— ہر جگہ کبائر اور فواحش کا بازار گرم ہے۔ کسی کو ٹوکنے کی جرأت تک نہیں ہوتی۔ ایک معمولی زمیندار علی الاعلان خدا کی غیرت کو چیلنج کرتا ہے۔ لیکن اللہ کے بندوں میں سے کسی کو اس سے ٹکرانے کی ہمت نہیں ہوتی۔" اگر خواہی سلامت برکنار است" ہر شخص کا زاویہ حیات بن چکا ہے ——————

لیکن

ایک ایسا زمانہ بھی گذر چکا ہے۔ جبکہ حق کہنے کیلئے ہر کس وناکس کی زبان بے نیام رہتی تھی۔ سلطانؒ وزیر کا رعب آڑے نہیں آسکتا تھا۔ ایک بوریہ نشین درویش حجرے سے نکل کر دربار شاہی تک پہنچتا اور قہرمان تاجداروں کو وہ جلی کٹی سناتا کہ ان کی خون آشام تلواریں ہاتھوں سے چھوٹ کر نیچے آپڑتی تھیں ——————

سلیمان بن عبدالملک ——— بنوامیہ کا خونریز خلیفہ! جس کی سلطنت لاہور سے اندلس تک پھیلی ہوئی تھی ——— جس کے حکم سے فاتح سندھ محمد بن قاسمؒ کی شمع حیات گل کر دی گئی ——— جس کے ادنیٰ اشارۂ ابرو سے موسیٰ بن نصیر جیسے فتحمند اور بہادر سپہ سالار کو ٹھکانے لگا دیا گیا ۹۸ھ میں مناسک حج ادا کرنے کے بعد مدینۃ الرسول کو اڑا چلا آتا تھا اس کا خاص رخت سفر سینکڑوں اونٹوں پر بار تھا۔ خچر اور گھوڑے جو خلیفہ کی محافظ فوج کا اسباب اور زاد راہ لے کر خلیفہ کے عقب میں چلے آتے تھے۔ ان کا تو شمار ہی نہ تھا اس تمام لاؤ لشکر سے گرد و غبار کا جو طوفان اٹھ رہا تھا۔ اس کا پاٹ ایک میل سے کم نہ تھا۔ احمر بن پہاڑیوں کی چوٹیاں مٹی سے اٹ رہی تھیں سلیمان اپنے چیدہ چیدہ امراء کو ہمرکاب لئے کچھ فاصلہ آگے چل رہا تھا۔ تاکہ لشکر کی خاک دھول اس پر نہ پڑ سکے جب اس کی آمد کی خبر مدینہ پہنچی۔ تو شہر کے اکابر پیشوائی کی غرض سے ذوالحلیفہ تک چل کر آئے۔

خلیفہ نے مدینہ پہنچ کر سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اقدس پر حاضری دی۔ شہر کے علماء مشائخ اور زہاد سے خوب تبادلہ خیال کیا۔ تین دن تک علم و ادب کی مجلسیں گرم رہیں۔ مگر سلیمان کی طبیعت سیر نہ ہوتی اس کے کان خوشامدانہ الفاظ سنتے سنتے پک گئے۔ اب وہ ایسے آدمی کی تلاش میں تھا۔ جو اس کے دل کی کائنات میں تہلکہ برپا کر دے۔ اس نے لوگوں سے پوچھا۔ یہاں کوئی ایسا شخص ہے جس نے اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ دیکھا ہو؟

لوگوں نے کہا۔ ہاں۔۔! یہاں ایک بزرگ رہتے ہیں۔ جو ابو حازمؓ کے نام سے مشہور ہیں۔

خلیفہ کی آنکھیں وفورِ شوق سے چمکنے لگیں۔ اس نے اپنے خاص غلام کو اشارہ کیا۔ کہ جا کر ابو حازمؓ کو لے آئے۔

ابو حازمؓ لنگڑے آدمی تھے جب سلیمان کے پاس تشریف لائے تو کچھ دیر اجازت کی انتظار میں کھڑے رہے۔ مگر جب خلیفہ کی طرف سے کوئی توجہ نہ ہوئی۔ تو آپ عصا کو زمین پر رکھ کر بیٹھ گئے۔

خلیفہ نے خشم آلود نگاہوں سے گھورتے ہوئے کہا۔ اے ابو حازمؓ! تو نے تابعی اور دیندار ہونے کے باوجود یہ کیا ظلم کیا؟

آپ نے نہایت بے پرواہی سے کہا۔ اے امیر المومنین! مجھ سے ایسی

کون سی حرکت سرزد ہوئی ہے۔ جسے آپ ظلم سے تعبیر فرماتے ہیں؟"

کیا یہ ظلم نہیں کہ مدینہ کے تمام ارباب کمال علماء اور صلحاء میرے ملنے کے لئے آئے ہیں۔ مگر آپ نہیں آئے۔ یہ ظلم نہیں تو کیا ہے؟

ابوحازمؒ اگر میرا آپ سے تعارف ہوتا۔ تو ضرور حاضر ہوتا ——— !

سلیمان نے حاضرین کی طرف متوجہ ہو کر کہا "شیخ درست کہتے ہیں"!

کچھ دیر مجلس پر سکوت طاری رہا۔ اس کے بعد خلیفہ نے پھر شیخ کو متوجہ کیا۔ کہا "اے پیر مرد کیا وجہ ہے کہ موت سے ہم کو ڈر لگتا ہے"؟

ابوحازمؒ نے سر اٹھا کر سادگی سے جواب دیا۔

اے خلیفہ اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ تو نے اپنی آخرت برباد کر لی ہے۔ مگر تیری دنیا آباد ہے۔ اس لئے آبادی سے خرابے کی طرف جاتے ہوتے تمہیں خوف محسوس ہوتا ہے۔

سلیمان نے اعتراف کے طور پر سر ہلاتے ہوئے کہا۔ آپ سچ کہتے ہیں لیکن یہ تو فرمایئے۔ کہ آخر ہم دربار الٰہی میں کیسے پیش ہوں گے؟"

دربار الٰہی میں داخلہ کی کیفیت جاننا چاہتے ہو سلیمان ——— !

بوڑھے تابعی نے ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔

خدا کے نیک بندے تو آخرت کو اس طرح جائینگے۔ جیسے ایک مسافر لمبے سفر کے بعد گھر کو لوٹتا ہے۔ لیکن بدکاروں کی حالت ایسی ہوگی۔

جیسے ایک مفرور غلام کو گرفتار کر کے سخت گیر آقا کے روبرو پیش کیا جاتا ہے یہ مالک کی مرضی ہے۔ چاہے اُسے بخش دے۔ چاہے سزا دے۔ یہ سن کر سلیمان رو پڑا۔ اور اہل دربار پر بھی بڑا اثر پڑا۔ جب ذرا سکون ہوا تو بنو امیہ کے قہرمان تاجدار نے پھر سوال کیا۔

"اے پیر مرد دانشور! کسی طرح یہ بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ اللہ جل جلالہ قیامت کے دن میرے ساتھ کیا سلوک فرمائینگے؟"

"امیر المومنین! اپنے آپ کو کتاب اللہ کے سامنے پیش کیجئے۔ اس سے آپ کو معلوم ہو جائے گا۔ کہ مالک یوم الدین کے ہاں تمہارے لئے کیا رکھا ہے۔!"

قرآن حکیم میں یہ معرفت کس مقام سے حاصل کی جا سکتی ہے۔؟ سلیمان نے فکرمند ہو کر پوچھا۔

کیا اللہ تعالیٰ نے نہیں فرمایا اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ وَاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِیْ جَحِیْمٍ (ترجمہ) خدا کے نیک بندے جنت النعیم میں مزے لوٹیں گے اور بدکار دوزخ کے دھکتے ہوئے تنور کا ایندھن بنیں گے۔

"اللہ کی رحمت کہاں ہے؟"

"رَحْمَةُ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ"

"زیادہ عقلمند کون ہے ——؟"

"جس نے علم و حکمت کی باتیں خود بھی سیکھیں اور دوسروں کو بھی سکھائیں"
"مقبول الدعا" کی تعریف کیجئے۔؟"
"متواضع اور خائف ——— !"
"اللہ کے ہاں پاکیزہ صدقہ کون سا ہے؟"
"درویش کا محنت سے کمایا ہوا سرمایہ!"

ابو حازمؒ کے چہرے پر سکون و اطمینان برس رہا تھا۔ وہ خوش تھا۔ کہ خداوند کریم نے اُسے ایک جابر سلطان کو بر سر دربار حق کہنے کی توفیق عنایت فرمائی۔ اس کا ایمان تھا۔ کہ خدا کے حکم کے بغیر درخت کا پتہ بھی حرکت نہیں کر سکتا۔ وہ اپنے نفع نقصان کا مالک صرف اپنے ربِ قدیر کو ہی سمجھتا تھا۔ اس لئے اُسے مطلقاً احساس تک نہ تھا۔ کہ وہ کہاں بیٹھا ہے۔ اور کس سے مخاطب ہے سلیمان اعظم کی آواز سے یزید بن سعید کا محل ایک دفعہ پھر گونج اُٹھا

"اے خدا کے مقبول انسان! کوئی اور نصیحت کیجئے!"
"نصیحت۔ ! ابو حازمؒ نے چونک کر کہا۔

"میں ایسے شخص کے بارے میں کیا کہوں جو مومنوں کے مشورہ کے بغیر ہی قہر او رجبر سے بادشاہ بن بیٹھا ہے اور جس نے ہزاروں بے گناہوں کا خون کیا ہے جس کے عہد میں قطع رحمی ہوئی جس کے زمانے میں حدود اللہ معطل ہوئے جس نے ذلیل دنیا کی خاطر عہد و پیمان کو بالائے طاق رکھ دیا۔

لیکن اس کے باوجود ——— دنیا اور اس کی تمام چیزیں رہنے والی نہیں ہیں۔ ایک دن تمہیں ان سب چیزوں سے ہاتھ دھونے پڑینگے۔ کاش! تجھے معلوم ہوتا۔ کہ قیامت کے روز تجھ سے کیا سوال ہوگا۔ اور تم کیا جواب دو گے ———!!

ایک مصاحب نے بات کاٹ کر کہا۔ اے درویش! تو نے یہ کیا کہا؛ کیا امیر المومنین سے ان چیزوں کے بارہ میں سوال ہوگا۔؟؟

ابو حازمؒ نے غضب آلود نگاہوں سے گھورتے ہوئے کہا۔ اے جھوٹے آدمی! چپ رہ ———!! فرعون اور ہامان تجھ جیسے مصاحبوں کی وجہ سے ہلاک ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے علماء سے عہد لیا ہے کہ وہ حق بات کو لوگوں پر بے کم و کاست ظاہر کر دیں اور کچھ چھپائیں نہیں۔"

"اے نیک آدمی! تو ہمارا اصلاح کار بن جا اور ہمارے ساتھ چل۔؟" خلیفہ نے لجاجت آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"تیری رفاقت اور مصاحبت سے خدا کی پناہ چاہتا ہوں۔!"

"کیوں ———؟"

"مجھے اندیشہ ہے کہ تمہاری صحبت میں آکر جادۂ انصاف سے نہ بھٹک جاؤں اور خداوند کریم اس کی پاداش میں مجھے زندگی اور موت کے عذاب میں مبتلا نہ کر دیں۔!"

اچھا۔۔۔! اسی طرح گاہے گاہے ملاقات تو کرتے رہا کیجئے۔"

"زمانے کی بھلائی اسی میں ہے کہ بادشاہ علماء کے پاس آئیں لیکن علماء بادشاہوں کے پاس نہ جائیں۔ مگر فی زمانہ یہ حالت ہوگئی ہے۔ کہ علماء بادشاہوں کے پاس جاتے ہیں لیکن سلاطین علماء کے پاس نہیں جاتے اسی واسطے دونوں فریق خرابی میں پھنس کر رہ گئے ہیں۔"

"اے ابوحازمؒ! مجھے مختصر سی نصیحت کر۔۔۔۔!"

"اللہ سے ڈر۔ اس طرح کہ اوامر سے غافل نہ ہو۔ اور نواہی کے قریب نہ جائے"

"نیک دعا فرمایئے۔۔۔۔!"

"اے اللہ! اگر سلیمان تیرا دوست ہے تو اسے دینی دنیاوی سعادتوں سے مالا مال کر اور اگر تیرا دشمن ہے تو اسے پیشانی سے پکڑ کر نیکی کی طرف لے آ۔"

"کچھ اور فرمایئے۔"

"اے سلیمان! میں نے مختصراً کہہ دیا اگر تو اس کا دوست ہے تو خوش ہو جا اور اگر دشمن ہے تو نصیحت حاصل کر۔ کیونکہ اس کی رحمت دنیا میں تو عام ہے لیکن آخرت میں صرف نیکوکاروں کے لئے مخصوص ہوگی۔

سلیمان نے غلام کو حکم دیا۔ کہ ایک ہزار اشرفی لا کر ابوحازم کے حوالے کر۔ جب وہ لے آیا۔ تو سلیمان نے کہا۔ "اے ابوحازم! یہ اشرفیاں قبول کر۔۔۔!"

آپ نے فرمایا۔ اے امیر المومنین! میں انہیں کیسے قبول کر سکتا ہوں

کیونکہ تمام مسلمان اس مال میں برابر کے شریک ہیں۔ ہاں اگر تو سب کو اس قدر اشرفیاں دلاتے۔ تو پھر میں لے سکتا ہوں۔ کیونکہ ہو سکتا ہے۔ کہ یہ اشرفیاں میری ان باتوں کا معاوضہ ہو جاتے۔ جو میں نے از راہِ نصیحت تم سے کہی ہیں۔ اور اس امر سے میں بہت ڈرتا ہوں۔

نصائح کی قیمت لینے سے مُردار اور خون کا کھا لینا بہتر ہے

ابو حازمؒ یا تو لاٹھی اُٹھا کر چلنے کو تھا۔ یا پھر دھرنا مار کر بیٹھ گیا۔ علمائے دربار پر ایک نظر ڈالی۔ اور پھر سلیمان سے مخاطب ہو کر کہا۔ اے امیر المومنین تمہیں ایک قصہ سناؤں۔

موسیٰ علیہ السلام جب فرعون سے بھاگ کر مدین کے کنویں پر پہنچے وہاں دو لڑکیاں نظر پڑیں۔ جو اپنی بکریوں کو پانی پلانے کے لئے راہ روکے کھڑی تھیں۔ آپ نے فرمایا۔ "کیا تمہارا کوئی مددگار نہیں ——— ؟"

انہوں نے جواب دیا "نہیں ——— !"

موسیٰ علیہ السلام نے ڈول کھینچ کر ان کی بکریوں کو پانی پلا دیا۔ پھر درخت کے سایہ میں جا بیٹھے۔ اور دُعا فرمائی کہ

"اے میرے رب! اس وقت جو نعمت بھی آپ بھیج دیں۔ میں اس کا سخت حاجتمند ہوں۔"

یعنی اللہ سے اجر نہ مانگا۔

جب وہ لڑکیاں گھر پہنچیں۔ تو ان کے بوڑھے باپ نے کہا "آج تم جلدی کیسے آ گئیں ——— ؟"

انہوں نے عرض کی "اے والد مہربان! آج ہمیں ایک صالح انسان مل گیا تھا۔ اس نے ڈول کھینچ کر بکریوں کو پانی پلا دیا!"

پیر مرد نے کہا "تم نے اس کی زبان سے بھی کچھ سنا تھا۔؟"

لڑکیاں بولیں۔ سایہ میں بیٹھا یہ دعا مانگ رہا تھا۔

"رَبِّ اِنِّیْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ"

اس پر باپ نے کہا "وہ کوئی بھوکا معلوم ہوتا ہے"

ایک لڑکی کو یہ سمجھا کر روانہ کیا۔ کہ تو اسے جا کر کہہ کہ میرا باپ تجھے بلاتا ہے "تاکہ پانی پلانے کا تجھے کچھ اجر دے۔

موسیٰ علیہ السلام "اجر" کا لفظ سن کر گھبرا گئے۔ فرمایا

"اپنے باپ سے کہہ دو۔ کہ پانی پلانے والا اپنے احسان پر کسی قسم کا اجر قبول کرنے کو تیار نہیں ——— !"

وہ معصومہ لوٹ گئی۔ اور اپنے باپ سے یہ ماجرا کہہ سنایا۔ باپ نے کہا "تو پھر جا اور جا کر کہہ، کہ یہ تیری مرضی پر موقوف ہے۔ کہ جو کچھ میرا باپ دے۔ چاہے اُسے قبول کرے یا نہ کرے۔ لیکن میرا باپ تجھے ملنے کا مشتاق ہے۔ اس لئے گھر تک چلنے کی تکلیف ضرور گوارا کر لیجئے ——— !"

موسیٰ علیہ السلام اُٹھ کھڑے ہوئے وہ لڑکی آگے آگے چل رہی تھی۔ اتفاق سے تیز جھونکے آنے لگے تھے اور اس وجہ سے اس معصومہ کے کپڑے اُڑنے لگے۔ اس لئے موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا۔ تو ذرا پیچھے پیچھے چل۔ اور مجھے راستہ بتاتی آ۔

جب آپ دروازے پر پہنچے۔ تو فرمایا۔

"اندر جا کر میرے لئے اذن طلب کر۔!"

اس لڑکی نے اندر جا کر باپ سے کہا۔ کہ وہ شخص طاقتور ہونے کے ساتھ ساتھ امین بھی ہے۔

پیر مرد نے فرمایا۔ "تجھے کس طرح معلوم ہوا ——— ؟"

لڑکی نے سارا واقعہ کہہ سنایا۔ اس کے بعد اذن ملا۔ موسیٰ علیہ السلام اندر داخل ہوئے کھانا چنا ہوا تھا۔ آپ نے سلام کہا۔ تو انہوں نے مرحبا کہہ کر جواب دیا۔ اور کہا:۔

"اے جوان ——— ! ہمارا ماحضر تناول کر ——— !!"

موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا۔ خدا بچائے ——— !"

پیر مرد نے کہا۔ "کیوں ——— ؟"

فرمایا۔ "میں ایسے خاندان سے تعلق رکھتا ہوں۔ جو اپنے دین کو زمین بھر سونے کے عوض بھی فروخت کرنے کو تیار نہیں۔

پیر مرد بولا:۔

"اے عزیز! میں شعیب ہوں۔ مہمانوں کی خاطر داری میرے معمول میں داخل ہے۔ میں نے خدانخواستہ خدمت کا معاوضہ پیش نہیں کیا۔"

یہ سن کر موسیٰ علیہ السلام کھانا کھانے کیلئے دستر خوان پر جا بیٹھے۔

"ابو حازمؒ جب یہ سارا قصہ سنا چکے۔ تو فرمایا۔

"اے امیر المومنین! اگر یہ اشرفیاں ان نصائح کی قیمت ہیں جو میں نے تجھے کی ہیں۔ تو ان کے لینے سے مردار اور خون کا کھا لینا زیادہ اچھا ہے۔"

ابو حازمؒ کی تقریر نے سلیمان کو تعجب میں ڈال دیا۔ ایک مصاحب نے کہا۔

"اے امیر المومنین۔ کیا مدینہ کے سب لوگ اسی طرح متوکل اور صابر ہیں؟"

کہا "نہیں ——— !"

"زہریؒ[1]" جو علامۂ روزگار اور محدثِ دہر تھے۔ بولے :-

"یہ شخص تیس سال سے میرا ہمسایہ چلا آتا ہے۔ مگر مجھے کبھی اس سے ملنے اور بات چیت کرنے کا اتفاق نہیں ہوا۔"

ابو حازم معاً کہہ اُٹھے "آپ سچ کہتے ہیں۔ کیونکہ آپ اللہ کو بھول

---

[1] ابن شہاب الزہری

چکے ہیں۔ اگر آپ کو خدا یاد ہوتا۔ تو مجھے ضرور یاد کرتے۔ کیونکہ خدا پرست لوگ اللہ والوں کو نہیں بھلایا کرتے۔

زہری نے کہا "آپ تو مجھے گالیاں دینے لگے ہیں"

سلیمان نے مسکرا کر امام زہری کی طرف دیکھا۔ اور کہا۔

"اے زہری! تو خود اپنے نفس کو گالیاں دے رہا ہے کیا تجھے علم نہیں کہ ہمسایہ کا ہمسایہ پر حق ہوتا ہے۔

ابو حازمؒ نے کہا کہ "بنی اسرائیل جب تک راہ راست پر رہے۔ تو ان کے امراء علماء کے محتاج رہے۔ اور علماء اپنے دامنوں کو امراء سے بچاتے تھے۔ مگر جب رذیل لوگوں نے علم سیکھ کر امراء کی ملازمت اختیار کر لی۔ تو امراء علماء سے بے نیاز ہو گئے۔ اور علماء کی تمام جماعت مصیبت میں گرفتار ہو گئی۔ اگر علماء اپنے علوم کو محفوظ رکھتے۔ تو امراء ہمیشہ اُن کی تعظیم کیا کرتے۔

زہری نے کہا گویا آپ کا اشارہ میری طرف ہی ہے۔

ابو حازم بولے۔ میرے الفاظ عام ہیں۔ لیکن اگر آپ میں یہ خصوصیات ہیں۔ تو پھر آپ پر بھی چسپاں ہو سکتے ہیں۔

سلیمان نے کہا ابو حازمؒ! کچھ اور مختصر سی نصیحت کیجئے۔

فرمایا "حلال دنیا کافی ہے یعنی اللہ کی خوشنودی کے لئے بہت

ہے۔ حرام دنیا عذاب الٰہی کی موجب ہے۔ اور ہم سب نے اللہ کے پاس لوٹ کر جانا ہے۔ اس لئے ہمیں اس کے عذاب سے خائف رہنا چاہیئے۔

سلیمان بولا۔ تیرا سرمایہ کس قدر ہے؟

فرمایا

(۱) عدلِ خداوندی پر بھروسہ رکھنا۔

(۲) اس کی بخشش پر توکل کرنا۔

(۳) اس کے ساتھ اچھا گمان کرنا۔

(۴) اپنی موت تک صابر رہنا۔

(۵) دوسرے لوگوں کی معلومات سے مایوس ہو جانا۔

سلیمان نے کہا۔ اگر کوئی ضرورت لاحق ہو۔ تو مجھ سے کہا کیجئے۔

فرمایا "میں اپنی ضروریات تو خدا کے پاس لے جایا کرتا ہوں۔ اور وہ ذات جو مجھے عطا کرتی ہے۔ اسی پر قناعت کر لیتا ہوں اور جس سے روک دیتی ہے اس سے رک جاتا ہوں۔ اس کے علاوہ جہاں تک غور کرتا ہوں جہاں کی ہر چیز دو باتوں میں محصور نظر آتی ہے۔ یا تو وہ میری ہے۔ یا وہ میری نہیں۔ اگر وہ میری ہے۔ تو خواہ میں کتنی تدبیر کیوں نہ کروں۔ وقت سے پہلے اسے حاصل نہیں کر سکتا۔ اگر وہ میری نہیں ہے۔ تو میں خواہ کتنی کوشش کیوں نہ کروں۔ وہ مجھے نہیں مل سکتی جس طرح مجھے دوسروں

کے رزق سے روک دیا گیا ہے۔ اسی طرح دوسروں کو بھی میرے رزق سے روک دیا گیا ہے۔ پھر مجھے اقبال وادبار کے گرداب میں پھنسنے کی کیا ضرورت ہے۔؟

سلیمان ابوحازمؒ کی شانِ استغنائی سے بہت خفیف ہوا۔ اور بقصد ہوکر کہا۔

ابوحازمؒ ایسی کوئی ضرورت پیش کیجئے۔ جسے میں پورا کرسکوں۔

فرمایا۔ کیا تو میری خواہش کو پورا کرے گا ——— !

کہا

"ہاں"

فرمایا

میری خواہش یہ ہے کہ میرے سوال کے بغیر مجھے کچھ نہ دے اور جب تک تیرے پاس چل کر نہ آؤں۔ مجھے ملنے کی کوشش نہ کر۔ اگر بیمار ہو جاؤں تو میری عیادت کو نہ آ۔ اور مر جاؤں تو جنازے پر آنے کی تکلیف نہ کر ——— !

سلیمان نے افسوس سے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

اے ابوحازم! تو نے تو بالکل انکار ہی کر دیا۔

مدینہ کا لنگڑا درویش ایشیا کے سب سے جابر اور مقتدر شہنشاہ کو

حیرت و استعجاب کے بحر عمیق میں غرق چھوڑ عجب بے نیازی سے لاٹھی ٹیکتا چلا جا رہا تھا۔ اور حاضرین کی اشکبار نگاہیں حق و صداقت کے اس پیکرِ جمیل پر مرتکز ہو رہی تھیں۔ افسوس ابوحازم اور ان جیسے ہزاروں مردانِ خدا جو چمنستانِ حق و صداقت کے بلبل ہزار داستان تھے۔ ایک ایک کر کے عالمِ آخرت کو سدھار گئے۔ آج عرب کی سرزمین ان کی قبروں کے نشان دکھانے سے بھی قاصر ہے ؎

تا سحر تو نے نہ چھوڑی وہ بھی اے بادِ صبا
یادگارِ رونقِ محفل تھی پروانے کی خاک

مسلمان

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی آن نئی شان
گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان
قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

علامہ محمد اقبال رحمتہ اللہ علیہ

الماس

ماخذ

حضرت مولانا خواجہ نور احمدؒ صاحب فریدیؒ ناز کی رحمۃ اللہ علیہ

فرید آباد شریف ریاست بہاولپور

"اے بدبخت خاتون! تجھ سے وہ سیاہ فام لونڈی بدرجہا بہتر ہے۔ جو اپنے مالک کی غلامی کرتی ہے اور اُسی سے جنسی تعلقات استوار رکھتی ہے۔
تو حسین ناگن ہے۔ کہ ہر ایک کو ڈستی پھرتی ہے۔ یا شہد کی مکھی ہے۔ کہ ایک ایک پھول کا رس چوس کر اُسے پژمردہ کر دیتی ہے۔"

"جعفر"

(۱)

اس کا نام المناس تھا۔ فرغانہ کی حسین ترین ساحرہ۔ وہ اپنی کافر نگاہوں کے بے خطا تیروں سے ہزاروں نوجوانوں کے دل چھید چکی تھی۔ اس کے مختصر سے مکان پر ہر وقت اشرفیوں کی بارش ہوتی رہتی تھی۔ لیکن اس کے باوجود اس کی لالچی ماں کی آنکھیں سیر نہ ہوتی تھیں۔ اس نے بغداد کے محلوں اور دجلہ کی الف لیلہ کے ہزاروں ہوشربا افسانے سُن رکھے تھے اس لئے اس نے المناس کو عربی ادب کی اعلیٰ تعلیم دلائی تھی۔ پختہ کار اساتذہ کی تربیت سے اس ہونہار دوشیزہ کو متنبیؔ، امراء القیس، ابوفراس اور لبید کے سینکڑوں اشعار یاد ہو گئے تھے۔ حسان بن ثابتؓ، حضرت علیؓ اور فرزدق کے دواوین کا حصہ اُسے ازبر تھا۔ یہی سبب تھا کہ اُس کی جہاندیدہ ماں کو اس سے بہت سی توقعات ہو چکی تھیں۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کی المناس بغداد جا کر ایسی شہرت اور قبولیت حاصل کرے کہ اس کی زندگی کے حسین لمحات سے ایک اور الف لیلہ مرتب ہو جاتے۔ چنانچہ وہ اس قسم کے خوش کن خواب دیکھتی مع سازوسامان بغداد کو روانہ ہو گئی۔

(۲)

رشید اعظم کا زمانہ تھا۔ عباسیوں کی شبانہ روز ان تھک مساعی بغداد کو دُنیا کا عظیم الشان شہر بنانے میں کامیاب ہو چکی تھی۔ دجلہ کے دونو کناروں پر کئی میلوں تک عباسی اور برامکی امراء کے حسین و جمیل محلات کا سلسلہ چلا گیا تھا۔ دریا پر صبح شام شہر کے خوش فکروں کا ہجوم رہتا تھا۔ الماس کی ماں بڑی موقع شناس تھی اس نے سلطانی پل کے پاس ہی برامکیوں کی وسیع سرائے کے بالمقابل ایک خوبصورت مکان کرایہ پر لے لیا۔ اس کی دوسری جانب سنگِ احمر کا گھاٹ تھا۔ جس پر دجلہ کی سیمابی لہریں مچلا کرتی تھیں الماس کی ماں نے ایک خوبصورت بجرہ خرید لیا۔ وہ ہر وقت گھاٹ کے پاس کھجور سے بندھا رہتا۔ صبح کو جب نیرِ اعظم اُفقِ مشرق سے طلوع کرتا الماس اس پر سوار ہو کر سیر کے لئے دور تک دریا میں چلی جاتی کبھی کبھی چاندنی رات میں بھی الماس کا بجرہ دریا کی بل کھاتی ہوئی لہروں پر رقص کرتا نظر آتا۔ دستورِ اعظم جعفر برمکی کا محل بلے حد قریب تھا۔ بجرے کے پروگرام سے مقصود یہ تھا کہ کسی طرح سلطنت عباسیہ کے سیاہ و سفید کے مختار تک اس کی رسائی ہو جائے اس لئے جب بجرا محل کے مقابل پہنچتا تو عمداً فرزدق کے اشعار گانا شروع کر دیتی۔ کیونکہ اُسے علم ہو چکا تھا کہ وزیر اعظم کو اس زندہ جاوید شاعر کا کلام بہت پسند ہے۔ چند دنوں تک الماس کا یہ معمول رہا۔ آخر اس کے گانوں کی بھنک

جعفر کے کانوں تک جا پہنچی۔ اس وقت وہ بھی بجرے پر سوار ہو کر دن بھر کی تھکاوٹ دُور کرتا پھرتا تھا۔ مخملی پلنگ پر نیم خوابی کی حالت میں لیٹا ہوا تھا۔ المّاس کی رسیلی آواز سن کر چونکا۔ اپنے خادم محمود سے کہا۔

"محمود اس آواز کو پہچانتے ہو؟"

"ہاں قبلۂ عالم! یہ المّاس کی آواز ہے۔ اور وہ روزانہ اسی وقت اس طرف سیر کو آیا کرتی ہے۔"

"المّاس"! جعفر نے تعجب سے پوچھا "کون ہے یہ؟"

"خداوند! یہ فرغانہ کی مغنیّہ ہے۔ نہایت قبول صورت کنول جیسا سفید رنگ جس میں جوانی کی ہلکی سُرخی کی جھلک نمایاں ہے۔ موٹی موٹی سیاہ آنکھیں کمان کی طرح تنی ہوئی بھویں لمبی پلکیں، کمر تک لہراتی ہوئی عنبریں زلفیں، موزوں ناک، پتلے پتلے یاقوتی ہونٹ، سفید موتیوں ایسے ننھے ننھے دانت یوں معلوم ہوتا ہے گویا زہرہ ہے یا مشتری۔ بغداد کے نوجوان ہر وقت اُس کے گھر کا طواف کرتے رہتے ہیں۔ شہر کی دولت، عزت اور صحت سب اُس کے ہاتھوں تباہ ہو رہی ہے۔"

"محمود! یہ تو فرزدق کا کلام گا رہی ہے کیا اُسے معلوم نہیں کہ سیاسی مصلحتیں اس قسم کے کلام کو نشر کرنے کی اجازت نہیں دیتیں۔!"

"میرے خیال میں وہ حکومت کے نظریّے سے بے خبر نہیں ہے۔"

"محمود! الماس کی زبان ہی سحر ہے اس کا ایک ایک لفظ دل کی گہرائیوں میں اُترا چلا جا رہا ہے۔ میں اس عورت کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ تم یہاں رہو اور اپنے کپڑے مجھے دیدو"

جعفر کا یہ آئے دن کا معمول تھا۔ وہ اپنے حکمران کی طرح بھیس بدل کر رعایا کے حالات معلوم کرنے چلا جایا کرتا تھا۔ محمود نے فوراً اپنا لباس اُتار دیا، جعفر نے غلام سے کپڑے لے کر ایک رومال میں باندھ لئے اور لنگوٹ کس کر دریا میں کود پڑا۔

(۳)

جعفر برمکی اعلیٰ درجے کا تیراک تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے الماس کے بجرے کے قریب جا پہنچا۔ انتہائی خاموشی سے اُس نے رسی تھام لی اور کشتی کے ایک کونے میں دبک کر بیٹھ گیا۔ الماس ابھی تک گا رہی تھی۔ مگر یہ اشعار موسیٰ بن ابراہیم کے تھے جعفر نے بجرے کے موجودات کا جائزہ لینے کے لئے سر اُوپر اُٹھایا۔ دیکھا کہ ایک ماہوش نازنین چاندی کے پلنگ پر ستار لئے انتہائی محبت سے گا رہی ہے اس کے پہلو میں بغداد کے ملک التجار کا لڑکا صالح بیٹھا شراب کے جام پر جام چڑھا رہا ہے ان سے ذرا دُور ایک خادم اپنا سر گھٹنوں میں دبائے بیٹھا اونگھ رہا ہے۔ دو ملاح خاموشی سے بجرے کے چپو چلانے میں مصروف ہیں جعفر نے چستی سے محمود کا لباس زیب تن کیا اور اعرابی کی ہیئت

بنا کر الماس سے مخاطب ہوا۔

"اے حسینہ! اگر اجازت ہو تو دجلہ کا یہ مہمان اوپر آجائے؟"

الماس نے گانا بند کر دیا۔ سوداگر زادے نے شراب کا پیالہ تپائی پر رکھ دیا۔ دونوں حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔

جعفر نے پھر کہا۔

"صاحبو! اگر اجازت ہو تو یہ پردیسی اُوپر آجائے؟"

"ہاں ضرور!" الماس نے متفکر ہو کر جواب دیا۔

جعفر لپک کر اُوپر چڑھ آیا۔ اب خادم بھی چوکنا ہو گیا تھا ـــــــ اور ملاح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اجنبی کو دیکھ رہا تھا۔

الماس نے ظاہری چال ڈھال سے یہ اندازہ لگایا۔ کہ کوئی بڑا رئیس ہے مگر اتنی رات گئے دریا کے عین وسط میں اس کا کیا کام؟ یہ راز اس پر نہ کھلتا تھا۔

جعفر نے تکلفی سے خادم کے ساتھ مصروفِ گفتگو تھا ـــــــ الماس نے اپنی رسیلی آواز میں پوچھا۔

"اے اجنبی۔ تم کون ہو؟ اور اس وقت دریا میں کیسے آدھمکے؟"

جعفر نے کہا۔" اے خاتون! میں کوفہ کے نواح کا باشندہ ہوں۔ میرے اونٹ سرکاری آدمی پکڑ لائے ہیں۔ انہیں چھڑانے کے لئے کل سے بغداد آیا

ہوں۔ ہزار کوشش کی مگر وزیر سے رسائی نہ ہوسکی۔ مغرب کے وقت معلوم ہوا کہ وزیر صاحب بجرے پر سوار ہو کر ادھر کو نکل آئے ہیں۔ مجبوراً تیر کر یہاں آنا پڑا۔ آپ کے خادم سے وزیر صاحب کی بابت پوچھ رہا تھا کہ آپ نے مخاطب کر دیا۔"

"خوب! گویا تم اس وقت دجلہ کی لہروں میں وزیر صاحب کو ہی ڈھونڈ رہے تھے۔"

"ہاں خاتون!"

"تو پھر تمہیں کیا معلوم ہوا؟"

"مجھے معلوم ہوا کہ یہ کشتی وزیر صاحب کی نہیں بلکہ کسی اور صاحب کی ہے۔ لیکن یہ اب تک معلوم نہیں ہوا کہ یہ صاحب کون ہیں اور آپ ان کی کیا لگتی ہیں؟"

الماس نے گھبرا کر کہا۔ "تمہیں یہ معلوم کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ تمہارے لئے اتنا کافی ہے کہ آج رات کو ایک شخص اور ایک خاتون نے تمہیں غرق ہونے سے بچا لیا ——"

جعفر کھل کھلا کر ہنسا "غرق ہونے سے! کس کو!! مجھے!!!؟ —— اری نیک بخت جب تک خدا کا حکم نہ ہو۔ یہ دجلہ کیا چیز ہے عمان کا بحرِ عمیق بھی مجھے غرق نہیں کر سکتا۔ لیکن چونکہ قدرت نے اتفاق سے ہمیں یکجا کر دیا ہے

اس لئے ہمیں ایک دوسرے کی بابت صحیح واقفیت کا حاصل کرنا ضروری ہے جس طرح آپ کو مجھ پر سوال کرلے کا حق حاصل تھا اسی طرح میں بھی آپ سے پوچھنے کا حق رکھتا ہوں کہ آپ کون ہیں اور یہ صاحب آپ سے کیا رشتہ رکھتے ہیں۔"

سوداگرزادہ نے تنہائی سے شراب کا جام لیا اور اس میں شراب انڈیلتے ہوئے کہا۔"بھائی میں بغداد کا ایک امیر ہوں اور یہ اس شہر کی نامی گرامی مغنیہ الماس ہے۔"

"کیا یہ آپ کی لونڈی ہے؟"

"نہیں۔ یہ خاتون لونڈی نہیں ہے۔"

"تو کیا آپ کی بیوی ہے؟"

"بیوی بھی نہیں۔"

"تو پھر یہ آپ سے علی الاعلان بے حجاب کیوں ہے؟"

سوداگرزادے نے ہنس کر کہا۔ مجھ پر کیا موقوف ہے۔ یہ سب سے بے حجاب ہے۔ اس لئے آپ سے کہاں حجاب کیا ہے؟ روزانہ سینکڑوں آدمی آتے ہیں اور اسے بے حجاب ملتے ہیں۔"

تو کیا اسلام میں یہ کوئی نیا فرقہ پیدا ہوا ہے؟" جعفر نے صراحی سے پانی پیتے ہوئے کہا۔

سوداگر زادہ نے کہا نہیں۔ اسلام میں عورتوں کی دو قسمیں ہیں ایک حُرّہ اور دوسری جاریہ۔ یہ نہ حُرّہ ہے اور نہ جاریہ۔ عورتوں کا ایک آزاد طبقہ ہے، جنسی تعلقات استوار کرنے میں ہر طرح سے آزاد۔ دن میں پیلیوں سے جنسی تعلقات رکھتی اور توڑتی ہیں نکاح طلاق کی محتاج نہیں۔"

جعفر کے چہرے پر تکدّر کے آثار ظاہر ہوئے اس نے کہا "اے بدبخت خاتون تجھ سے تو وہ سیاہ فام لونڈی بدرجہا بہتر ہے جو اپنے مالک کی غلامی کرتی اور اُسی سے جنسی تعلقات استوار رکھتی ہے۔ تو حسین ناگن ہے کہ ہر ایک کو ڈستی پھرتی ہے۔ یا شہد کی مکھی ہے کہ ایک ایک پھول کا رس چوس کر اُسے پژمردہ کر دیتی ہے۔"

الماس کچھ کہنا چاہتی تھی کہ جعفر نے دریا میں چھلانگ لگا دی اور چشم زدن میں آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ الماس اجنبی کی باتوں سے سخت متاثر نظر آتی تھی۔ اس میں موجودہ معاشرت کے خلاف نفرت و حقارت کا جذبہ پیدا ہو چلا تھا۔ اس نے ملاحوں کو حکم دیا کہ بجرے کو گھر کی طرف لے چلو۔ سوداگر زادے نے ہزار بہلانے کی کوشش کی۔ مگر بے سُود۔ بجرا سکون سے اپنا سفر طے کرتا رہا اور الماس انتہائی خاموشی سے دجلہ کے اس سمت تکتی رہی جدھر کو اجنبی نے چھلانگ لگائی تھی۔ یہاں تک کہ خادم نے کہا۔ اچھی خاتون! اُتریے، گھر آ پہنچا۔"

(۴)

دو تین دنوں تک الماس پر اس واقعہ کے اثرات مسلط رہے، ازاں بعد اس کے نقوش مدھم ہوتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ ذہن میں اس کی یاد بھی باقی نہ رہی اور الماس حسب دستور شہر کے نوجوانوں کے ساتھ داد عیش دینے لگی۔

(۵)

بایزید بسطام کے ایک باخدا درویش تھے۔ ان دنوں اپنے وطن سے بغداد آئے ہوئے تھے جعفر برمکی کو ان سے بے حد عقیدت تھی۔ وہ ملکہ خیزران کے مقبرہ میں فروکش تھے جعفر نے ایک ملاقات میں ان سے عرض کی کہ آپ کے وطن کی ایک طوائف ہمارے ہاں آئی ہوئی ہے اور اس نے بغداد کو اپنی اداؤں پر نثار کر رکھا ہے ہم لوگوں نے حتی الوسع وعظ و نصیحت کرنے کی کوشش کی ہے مگر اس قتالہ کی سحر بیانی کے آگے ہماری کچھ پیش نہیں گئی۔ آپ خدا کے برگزیدہ انسان ہیں مہربانی کر کے اس بلا کو اس شہر سے دفع کریں۔

شیخ نے مسکرا کر کہا "یہ فقیر اس معاملہ میں کیا کر سکتا ہے؟"

جعفر نے مکرر عرض کی "حضرت! آپ امت محمدیہ کے پاسبان ہیں اگر جناب بھی اس قسم کا جواب عنایت فرمائیں تو پھر ملت مرحومہ کی کون غمخواری

کرے گا۔"

شیخ خاموش ہوگیا۔اس کی نگاہیں جامع منصوریہ پر مرتکز ہو چکی تھیں معلوم ہوتا تھا کہ شیخ کسی گہرے سوچ میں مستغرق ہے اور اس کی قوت ارادی نفی اور اثبات کی آویزش میں پھنس کر رہ گئی ہے۔

وزیر چپ چاپ سر جھکائے اپنے سوال کے جواب کا انتظار کر رہا تھا اچانک شیخ نے زبان کو جنبش دی۔فرمایا"جعفر! تسلی رکھ۔الماس سے ایسا فعل پھر کبھی سرزد نہ ہوگا۔"

دوسرے دن شام کو بغداد کے خوش فکرے جو الماس کے مکان پر پہنچے تو مکان کی سیڑھیوں پر شیخ کو سر جھکائے بیٹھا پایا۔شیخ کی روحانیت کا لوہا تمام بغداد مانتا تھا اس لئے کسی کو آگے بڑھنے کی جرأت نہ ہوتی چپ چاپ آنکھیں بچاتے آگے کو نکل گئے۔

الماس کی ماں اپنے گھر کی بے رونقی کو دیکھ کر سخت گھبرائی کہ یہ کیا معاملہ ہے۔یا تو گروہ کے گروہ لوگ آتے تھے یا کسی نے آج جھانک کر بھی نہیں دیکھا۔سیڑھیوں کی طرف لپکی۔دیکھا کہ ایک پیر مرد عصا تھامے دہلیز پر ڈٹا بیٹھا ہے۔جھلا کر نیچے اتری اور عصا چھین کر مارنا پیٹنا شروع کیا۔کہ موئے تمہارا یہاں کیا کام!چل نکل دور ہو ————!!"

شیخ نے نہایت عاجزی سے کہا"شریف خاتون! قبر میں پاؤں لٹکائے

بیٹھا ہوں۔ ستّر اسّی کی عمر ہے دنیا کی ہر خواہش پوری ہو چکی ہے تمہاری المناس کی خوبصورتی کی داستان سُن کر عرصہ سے قربان ہو رہا تھا۔ بڑی مشکل سے یہ پیسے جمع کئے ہیں۔ اگر یہ آرزو پوری ہو جائے تو دل خوش ہو جائیگا۔ تمہاری غرض روپوں پیسوں سے ہے۔ اگر دوسروں سے بیس لیتی ہو تو مجھ سے پچیس لے لو لیکن مجھے المناس کے جمالِ بے مثال کی ایک جھلک دیکھ لینے دو۔"

المناس کی ماں نے جب توقع سے زائد روپے دیکھے تو خوش ہو گئی عزت سے عصا تھاما، سہارا دے کر اوپر لے گئی اور المناس کے کمرے میں داخل کر دیا۔

المناس نے حسب عادت شیخ کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور نہایت ادب سے بستر پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

شیخ نے المناس کے شگفتہ چہرے پر نظر ڈالی اور کہا ——

آہا۔ تم کتنی خوبصورت ہو۔ پروردگار نے تمہیں اتنا حُسن نرالا فریب دے کر تم پر کتنی بڑی مہربانی فرمائی ہے۔"

المناس ایک معمّر مرد کی زبان سے اپنی خوبصورتی کی تعریف سُنکر مسکرائی شیخ نے اُسے متبسم پا کر دوبارہ سلسلہ کلام شروع کیا۔

"اے فرغانہ کی بلبل ہزار داستان! آج رات کیلئے تمہاری والدہ نے تمہارے نازنین جسم کو میرے ہاتھ فروخت کر دیا ہے۔ گویا رات بھر کے لئے تم میری ہو —— ! کیوں یہ درست ہے نا —— !!"

الماس نے سر جھکا کر مسکراتے ہوئے جواب دیا ـــــ "جی سرکار۔ بالکل حضور کی ہی ہوں۔"

"تو کیا تم میری ہر بات کو مان لو گی ـــــ؟"

"جی حضور"

"تو اچھا پہلے غسل کر لو۔" (مسکراتے ہوئے) "میں ذرا وہم پرست واقع ہوا ہوں۔" شیخ دوبارہ مسکرایا۔

"یہ عمر ہی ایسی ہے۔ برا نہ منانا۔"

الماس نے جلدی سے غسل کیا۔ اور اپنی قیمتی پوشاک پہنی۔ عطر سے اپنے لباس کو خوب بسایا۔ وہ سمجھتی تھی کہ بوڑھا دل ہے۔ خدا معلوم جوانی میں اس نے کیا کیا عیش کئے ہونگے۔ کتنی نفاست سے زندگی بسر کی ہو گی اسے خوش کرنا ہے تو پھر اس کے آگے پوری طرح بن ٹھن کر کیوں نہ جاؤں۔

لیکن جب وہ لباس تبدیل کر کے شیخ کے پاس آئی تو آپ نے اس کے بیش قیمت کپڑوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے تعریف کے پل باندھ دیئے اور جب چند لمحے گذر گئے تو پھر اپنی کالی کملی اُتار کر پیش کی اور کہا۔

"الماس! اب اپنا شاندار لباس اُتار دو۔ اور میری یہ کالی کملی اوڑھ لو۔ دیکھیں تم اس میں کتنی بھلی لگتی ہو۔"

شیخ نے الماس کی طرف دیکھتے ہوئے ہنسنے کی ناکام کوشش کی

المآس نے حسبِ ارشاد اپنا زرق برق لباس اتار ڈالا۔ اور کالی کملی زیب تن کر کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

شیخ نے پھر المآس سے خطاب کیا۔

"اے حورِ ارضی! تم کہو گی عجیب خبطی سے واسطہ پڑا ہے۔ مگر کیا کروں اپنی عادت سے مجبور ہوں۔"

المآس نے کہا۔ "نہیں سرکار! کوئی بات نہیں۔ میں آج رات ہر طرح آپ کے تابعِ فرمان ہوں۔"

آپ نے خوش ہو کر فرمایا۔ "خدا تمہیں خوش رکھے اگر اجازت ہو تو میں نماز کے دو سجدے ادا کر لوں۔"

"بڑی خوشی سے سرکار!"

شیخ نے کندھے کا کپڑا فرش پر بچھا دیا اور اس پر رُو بہ قبلہ کھڑے ہو گئے نماز شروع کرنے کر نے اچانک المآس کی طرف رُخ کیا کہا ______

"المآس! یہ زیب نہیں دیتا کہ میں تو خدا کے حضور میں جھک جاؤں اور تجھے پروا بھی نہ ہو۔ آؤ آج تو مل کر نماز پڑھ لیں۔ پھر ساری رات اپنی ہے۔"

"نہیں سرکار! میں ساتھ ہوں۔"

شیخ کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا۔ کہا

"المآس! ایک دفعہ پھر وضو کر لے۔" چنانچہ اُس نے شیخ کی ہدایت کے

بو جب دوبارہ وضو کیا۔ اور نماز پڑھنے کیلئے آپ کے بائیں جانب آکر کھڑی ہو گئی۔ شیخ نے نہایت رقت سے دوگانہ کی نیت باندھی۔ اور جونہی سجدہ گئے۔ بارگاہِ رب العزت کی جناب میں گڑگڑا کر عرض کی:۔

"اے بارِ خدایا! اس عاجز سے تو یہی کچھ ہو سکتا تھا۔ اب تیری مرضی ہے خواہ اسے ہدایت کی راہ دکھائے خواہ بدستورِ سابق بدی کے لئے کھلا چھوڑ دے"

ؔ از زنا سوئے نماز آوردمش   آنچہ کارِ من بُود یا رب کردمش

شیخ نے سر جو اُٹھایا، کیا دیکھا کہ الماس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہیں۔ اور اس کا سارا بدن خوفِ الٰہی سے کانپ رہا ہے۔ آپ کھڑے ہو گئے۔ فرمایا:۔

"بیٹی! میں جس کام کیلئے آیا تھا وہ ہو چکا۔ اب رخصت ——!"

الماس نے روتے ہوئے کہا "حضور! اب رخصت کیسی —— اگر بیٹی کی نسبت عطا فرمائی ہے۔ تو پھر مجھے گندگی کی اس دلدل میں کیوں چھوڑتے ہیں۔ اب میں حضور کے ہی ساتھ رہوں گی"

شیخ کی آنکھوں سے تشکر یہ کے آنسو نکل آئے۔ فرمایا "بارِ الٰہا! تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تو نے اپنے بندے کی دعا کو قبولیت کا شرف عطا کیا اور اسکے ذریعے سے ایک گنہگار روح کو ہدایت کی توفیق بخشی"

صبح کے دھندلکے میں لوگوں نے دیکھا کہ فرغانہ کی بلبل ہزار داستان کالی کملی اوڑھے ایک پیرِ مرد کے ہمراہ تکیہ خیزران کی طرف چلی جا رہی ہے اور ایک بڑھیا پیچھے سے اُسے واپس آنے کیلئے منت خوشامد کر رہی ہے ——

نورالدّین کا خواب

ماخذ

وفاء الوفا از علاّمہ سمہودیؒ

"دیکھتے ہو نور الدّین! یہی دو کتے مجھے تنگ کر رہے ہیں ——————————"

ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم
فی الرویت

(۱)

دوا فرنگی

چھٹی صدی ہجری میں شام کے ساحل پر مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان خون ریز جنگیں ہو رہی تھیں۔ ایک طرف یورپ کی تمام ٹرینڈ فوجیں تھیں اور دوسری طرف دمشق کا مرد مجاہد سلطان نورالدین اپنے چند ہزار فداکاروں کے ساتھ کفر کے اس سیلاب کو روکنے کے لئے کھڑا تھا۔ اس نے خلفائے بغداد و مصر سے خدا کا واسطہ دے دے کر امداد طلب کی مگر کسی کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ آخر اس نے خداوند عالم کی ذات بابرکات پر بھروسہ کر کے عیسائیت کے طوفان کو روکنے کا تہیہ کر لیا۔ بانیہ عکہ اور بیروت پر خوب معرکے ہوئے۔ ہر بار اللہ والوں کا پلڑا بھاری رہا۔ عیسائیوں نے سوچا کہ اگر بانئے اسلام کا وجود مقدس ہی مدینہ طیبہ سے اڑا لائیں۔ تو انہیں اپنے مذہب کے بارے میں جو خوش فہمیاں ہو رہی ہیں وہ دور ہو جائیں گی ۔ ان کے ذہنوں میں اپنے نبی سے متعلق جو حیات بعد الممات کا تصوری عقیدہ جما ہوا ہے۔ وہ مٹ جائیگا۔ اور وہ اس جوش و خروش

سے نہیں لڑسکیں گے جیسا کہ اب لڑتے ہیں۔ چنانچہ دو عیسائیوں کو بہت سازو سامان دے کر مدینہ عالیہ روانہ کیا گیا۔ یہ فرنگی مغربی حاجیوں کے لباس میں مدینہ منورہ وارد ہوئے۔ شہر کے فقرا و مساکین میں بہت سی رقم بطور خیرات کے تقسیم کی۔ حرم نبوی کے شیخ اور خدّام کو بھی بہت کچھ نذر کیا۔ اور نہایت عقیدت اور وارفتگی سے مسجد نبوی میں ایام بسر کرنے لگے۔

(۲)

سرنگ ـــــــــــ!

جب اہل مدینہ پر ان فرنگیوں نے اپنی ریاضت و عبادت کا سکہ جما لیا۔ تو پھر وہ اپنے کام کی طرف متوجہ ہوئے۔ حجرۂ شریف کے ساتھ شمالی جانب امّہات المومنین کے جو مکانات تھے۔ وہ داخل مسجد ہو چکے تھے صرف جنوبی طرف کے مکانات قریب پڑتے تھے۔ جو دار عشرہ مبشرہ کے نام سے مشہور تھے۔ انہوں نے قبلہ کی دیوار کے قریب ترمکان کرایہ پر لے لیا۔ اب ان کے راستے میں اور کوئی مشکل حائل نہ تھی۔ ان بدبختوں نے وجود گرامی کو قبر شریف سے نکالنے کے لئے اس مکان سے سرنگ کھودنی شروع کی رات کو کھودتے اور صبح سویرے مٹی مشکوں میں بھر کر بقیع میں لے جا کر پھینک دیتے۔ پھر ان مشکوں کو پانی سے بھر لیتے اور دن بھر جنت البقیع اور قبا وغیرہ کی زیارت گاہوں میں گھوم گھوم کر پانی پلاتے۔ اگر کوئی ان سے حال دریافت

کرنا تو انتہائی مسکینی سے کہتے۔ کہ

"ہم تو محض اس لئے ترک وطن کر کے یہاں آتے ہیں۔ کہ
جوارِ رسول میں رہ کر عبادت و اطاعتِ الٰہی میں زندگی بسر کریں"

مدینہ کے لوگوں نے جب ان کی پُر فریب عبادت و اطاعت خیرات و صدقات اور انہیں قبا و احد تک مشکیں بھر بھر کر پانی پلاتے دیکھا تو ان کے گرویدہ ہو گئے ہر محلہ اور ہر گھر میں ان کی نیکی کا چرچا ہونے لگا۔ اور کسی کو یہ گمان تک نہ ہو سکا کہ اس زہد و ریاضت کے پردہ میں شیطان اپنی پوری قوت سے کام کر رہا ہے اور یہ دو عاشقان رسول بہ باطن فرنگی ہیں۔ اور حضرت کے وجود مقدس کو منتقل کرنے کی غرض سے اپنے لیل و نہار سرنگ کھودنے میں بسر کر رہے ہیں بلکہ جوں جوں دن گزرتے گئے ان کی نیکی اور پرہیزگاری کا چرچا بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ وہ سرنگ کھودتے کھودتے حجرہ شریف تک جا پہنچے۔

(۳)

خواب ——————!

انہی ایام میں ایک رات سلطان نورالدین نے خواب میں سرکار دو عالم روحی فداہ کو دیکھا کہ دو گورے آدمیوں کی طرف اشارہ کر کے فرماتے ہیں۔

"اے نورالدین! مجھے یہ دو کتے تنگ کر رہے ہیں۔ اور تو بےخبر سو رہا ہے!"

سلطان گھبرا کر اُٹھ بیٹھا۔ صبح کو علماء فضلا طلب کر کے اُن سے تعبیر پوچھی۔ مگر کسی پر اصل کیفیت منکشف نہ ہو سکی۔ سلطان نے شہر کے فقراء و مشائخ کو بلا کر صدقہ دیا۔ اور بہت کچھ خیرات کی۔ سارا دن حضور کی ذات گرامی پر درود پڑھتا رہا۔ رات ہوئی تو پھر حضور کی زیارت ہوئی۔ اور دو فرنگی چہرے دکھا کر ارشاد کیا۔

"نورالدین دیکھتا نہیں۔ مجھے یہ دو کتّے ستا رہے ہیں؟"

بادشاہ کی شدت خوف سے چیخ نکل گئی۔ بستر سے اُٹھ کر فوراً وضو کیا۔ اور مدینہ طیبہ کی طرف منہ کر کے کہنا شروع کیا۔

"اے لولاک لما کے مالک۔ تیرا غلام تیرے ارشاد کے مفہوم کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ صاف صاف بتا کہ تو غلام سے کیا چاہتا ہے"

محلسرائے سلطانی میں ایک کھلبلی سی مچی ہوئی تھی۔ بیگمات اور خادمائیں سلطان کے اس گریہ پر دل ہی دل میں گھلی جاتی تھیں۔ امرا اور مشائخ الگ اندوہناک تھے کوئی بات سمجھ میں نہ آتی تھی۔ سلطان نے صبح کو پھر علماء اور مشائخ کو طلب کیا۔ اور وزراء سے مدینہ طیبہ کی بابت پوچھا۔ سب نے یہی جواب دیا۔ کہ حجاج اور زوار جو اس ارض پاک سے آتے ہیں۔ بیان کرتے ہیں کہ مدینہ مبارک آباد اور پُر رونق ہے۔ روضہ مطہرہ اور مسجد نبوی پر ہر وقت زائرین کا ہجوم رہتا ہے کوئی حادثہ سننے میں نہیں آیا۔ سلطان نے پھر خزانے کے دروازے کھلوا دیئے اور

شہر و مضافات کے محتاجوں اور مسکینوں کو بلا کر مالا مال کر دیا۔ مساجد میں چراغاں کئے گئے۔ اور درود خوانی کی مجلسیں مرتب کی گئیں۔

رات کو دیر تک اوراد و وظائف میں مصروف رہا۔ اور بستر پر سونے کے لئے نہ گیا۔ بلکہ جائے نماز پر پڑ رہا۔ مگر جونہی اونگھ آئی۔ کیا دیکھا۔ سرکار دو عالم سامنے کھڑے ہیں اور دو افرنگیوں کی طرف اشارہ کر کے فرماتے ہیں۔

"دیکھتے ہو نورالدین یہی دو کتے مجھے تنگ کر رہے ہیں"

نورالدین فوراً چونک پڑا۔ کہا۔ ہو نہ ہو۔ مدینہ طیبہ میں ضرور کوئی حادثہ گذر رہا ہے موگری اٹھا کر گھڑیال پر ماری جس پر خادمائیں اور بیگمات دوڑ کر آ گئیں سلطان نے ایک خواجہ سرا سے فرمایا کہ ابھی میرے وزیر جمال الدین موصلی کو اطلاع کرو۔ کہ علی الصباح بیس سواروں کے ساتھ میرے ہمراہ مدینہ منورہ جانے کیلئے تیار رہے۔ صبح صادق کا طلوع ہو رہا تھا سلطان نے غسل کر کے کپڑے بدلے صبح کی نماز مسجد میں جا کر ادا کی اور پھر گھوڑے پر سوار ہو ہمراہیوں کے ساتھ ارض مقدس کو روانہ ہو گیا۔

(۴)

سلطان مدینہ میں

دمشق سے بیت المقدس اور بیت المقدس سے تبوک اور تبوک سے خیبر سلطان اڑتا چلا جا رہا تھا۔ اگرچہ علامہ جمال الدین موصلی بہت جفاکش

اور بہادر سپاہی تھا۔ مگر وہ گھوڑا اساتھ نہیں ملا سکتا تھا۔ سر باز اور جاں نثار ہمراہی بھی پیچھے گرد چھانکتے چلے آ رہے تھے۔ راستے میں گھوڑے بدلتے رہے۔ مگر سوار نہ بدلے۔ مہینوں کا سفر دنوں میں اور دنوں کا گھنٹوں میں طے کرتے زمین کی طنابیں ملاتے رسول کریم کے سچے پروانے سولھویں دن بلا اطلاع مدینہ مبارک آ پہنچے۔ داڑھی خاک میں اٹی ہوئی تھی۔ چہرے غبار آلود ہو رہے تھے۔ لباس پر گرد سے کئی تہیں جم رہی تھیں۔ ادب کا تقاضا تھا کہ نہا دھو کر باریاب ہو۔ مگر دل بے قرار تھا۔ آنکھیں چاہتی تھیں کہ ایک لمحہ کا بھی توقف نہ ہو۔ گھوڑوں کو جبل سلع کے قریب نفس ذکیہ کے آستان پر چھوڑا۔ اور خود اسی ہیبت کذائی سے روضۂ مطہرہ پر جا پہنچا۔ مسجد نبوی اور حجرہ شریف کو بخیر و خوبی دیکھ کر خدا کا شکر ادا کیا۔ مگر طبیعت فکر مند تھی۔ شیخ الحرم کو بلا کر روضہ مبارکہ اور شہر کے حالات دریافت کیے۔ اس نے تسلی دی۔ مگر دل تو تین راتوں تک حضور کا عتاب آمیز فرمان سن چکا تھا۔ اُسے سکون کیسے ہوتا۔ شہر کے محلہ محلہ میں سلطان کے اس طرح بلا اطلاع آنے کی خبر پہنچ چکی تھی۔ حاکم شہر گھبرا کر دوڑا دوڑا آیا۔ اور اس طرح یکایک تشریف لانے کا سبب پوچھا سلطان نے تنہائی میں لے جا کر سارا ماجرا کہہ سنایا۔ امیر نے عرض کی۔ کہ جو دو چہرے جناب کو خواب میں دکھائے گئے ہیں۔ کیا آپ انہیں پہچان لینگے سلطان نے کہا کیوں نہیں۔ جن شکلوں کو میں مسلسل تین راتوں تک دیکھتا

رہا ہوں وہ کیسے بھول سکتی ہیں؟؟

امیر نے کہا۔ اس کی آسان صورت یہ ہے کہ آپ مسجد نبوی میں جا کر بیٹھ جائیں۔ میں سلام اور ملاقات کے بہانہ سے مدینہ طیبہ کے تمام آدمیوں کو سامنے سے گذار دوں گا۔ یہ تجویز سلطان کو بہت پسند آئی۔ چنانچہ اس نے جلدی جلدی غسل کیا اور کپڑے بدل کر مسجد نبوی میں آ بیٹھا۔

۵

انکشاف

مدینہ منورہ کے باشندے آنے شروع ہوئے سلطان ہر شخص سے اسکے مرتبے کے موافق سلوک کرتا رہا۔ ہزارہا روپے ان میں خیرات و صدقات کے طور پر تقسیم کیے۔ آمد و رفت کا سلسلہ ظہر تک جاری رہا۔ مگر ان میں سلطان کو وہ آدمی نظر نہ آئے پوچھا۔ کیا اور کوئی شخص باقی نہیں رہا۔ امیر نے کہا۔ تمام آدمی حاضر ہو چکے ہیں۔ صرف دو مغربی حاجی نظر نہیں آرہے۔ میرا خیال ہے وہ جنت البقیع میں لوگوں کو پانی پلاتے پھر رہے ہوں گے۔ اگر آپ حکم دیں تو ان کو طلب کر لیا جائے۔ فرمایا۔ کہاں۔ امیر نے ایک آدمی ان کے بلانے کی غرض سے روانہ کیا اتنی دیر میں کہ وہ آئیں۔ اہل مدینہ میں سے ان لوگوں نے جو ان شیطانوں کے زیر بار احسان تھے۔ ان کی تعریفوں میں زمین و آسمان کے قلابے ملانے شروع کیے۔ جب وہ پیش ہوتے تو سلطان جو گھڑی بھر سے

ان کے زہد و ورع اور دینداری و خدا شناسی کی تعریفیں سن رہا تھا۔ انہیں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ نگاہیں ان کے چہروں پر اس طرح جمیں کہ ٹکٹکی کر رہ گئیں۔ امیر نے پوچھا۔ کیوں ان میں کوئی خاص بات نظر آتی ہے۔ سلطان بولا صدق اللہ وصدق رسول النبی الکریم! اے عزیز! مجھے سچے خدا کے سچے رسول نے تین رات انہی آدمیوں کا چہرہ دکھایا ہے۔ مگر یہ جاننے کے باوجود سلطان نے احترام کے ساتھ ان سے ہاتھ ملایا۔ اور گفتگو شروع کی باتیں کرتے کرتے سلطان کھڑا ہو گیا۔ اور ان کے ساتھ اس گھر میں گیا جہاں وہ ٹھہرے ہوئے تھے سلطان نے کھوج لگانے کی بڑی کوشش کی۔ مگر کوئی خاص بات نظر نہ آئی۔ مایوس ہو کر جب واپس لوٹنے لگا۔ تو فرش کے نیچے کوئی چیز ہلتی معلوم ہوئی۔ فرش کو اٹھوایا۔ تو نیچے لکڑی کا ایک تختہ نظر آیا۔ اسے ہٹایا۔ تو اندر سرنگ دکھائی دی جو حجرہ شریف کی طرف کافی دور تک کھودی جا چکی تھی۔ اسی وقت دونوں افرنگیوں کو گرفتار کر لیا اور فرمایا۔ کہ ٹھیک ٹھیک بتاؤ کہ تم کون لوگ ہو۔ اور یہ کیا کر رہے تھے۔ انہوں نے کہا کہ

"ہم اپنی حکومت کی طرف سے اس لئے بھیجے گئے تھے
کہ رسولِ عربی کی نعش کو نکال کر روم میں لے جائیں"۔

بجلی کی طرح یہ خبر سارے شہر میں پھیل گئی۔ سارے کے سارے روضہ مبارک پر جمع ہو گئے۔ ایک قاری نے قرآن مجید کی یہ آیت تلاوت کی۔

اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوْا بِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ وَهُمْ بَدَءُوْكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ اَتَخْشَوْنَهُمْ فَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَوْهُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۔

تم ان لوگوں سے کیوں نہیں لڑتے جنہوں نے اپنی قسمیں توڑ ڈالیں۔ اور رسول کے نکالنے کا ارادہ کیا۔ انہوں نے تمہارے ساتھ پہلے چھیڑ شروع کی۔ کیا تم ان سے ڈرتے ہو پس اگر ایمان رکھتے ہو۔ تو اللہ زیادہ حقدار ہے کہ تم اس سے ڈرو۔

غصے سے سلطان کی آنکھیں شعلہ جوالہ بن رہی تھیں۔ اس آیہ کریمہ نے اس پر مہمیز کا کام کیا۔ حکم دیا۔ کہ حجرہ شریف کے قریب ہی ان بدمعاشوں کو قتل کر دو۔ چنانچہ وہ ناہنجار حجرہ شریف کے متصل دیوار کے نیچے قتل کر دیئے گئے۔

سلطان دیر تک اللہ کے اس انعام پر روتا رہا۔ کہ اس کے رسول نے اس کام کے لئے اُسے ہی پسند فرمایا۔ ورنہ اگر سرکار مدینہ کی طرف سے اس امر کی ایک غریب حبشی نژاد کو اشارہ ہوتا۔ تو وہ بھی ان کمبختوں کو ٹھکانے لگا سکتا تھا۔ مگر یہ اس کا فیض ہی ہے کہ اس نے اس کام کیلئے سلطان کو ہی منتخب فرمایا۔ اور پھر اس خدمت کو بجا لانے کی توفیق عطا فرمائی۔ سلطان نے حجرہ شریف کی دیواروں کو ہر طرف سے کھدوا کر ان میں سیسہ پلوا دیا تاکہ آئندہ پھر کسی کو ایسی غلط کاری کی جرأت نہ ہو۔ چنانچہ سیسے کی دیوار اب تک روضہ اقدس میں موجود ہے۔

قبساتِ عشق

ہے یزیدیوں کی ہوا وہی ہے زیادیوں کی جفا وہی
مگر آج اُف نہیں قوم میں وہ عزیمتِ شہِ کربلاؑ
نہ حسینؑ کوئی پھر آسکا نہ وہ مرتبہ کوئی پا سکا
کوئی عشقِ حق میں پھر اس کی طرح کٹا سکا نہ کبھی گلا

علامہ طالوت مدظلہ

لال پتھروں کا شہر

ماخذ

۱۔ تزک جہانگیری ــــــــــــــ

۲۔ سیر المتاخرین ــــــــــــــ

۳۔ دربار اکبری ــــــــــــــ

آنکھوں کا چار ہونا تھا۔ کہ وہی مغل اعظم جس کی حکومت کا فرمان برما سے بلخ اور بخارا سے دکن تک جاری تھا۔ شیخ کے حضور میں جھک گیا۔ اور دنیا نے کیا دیکھا کہ:۔

جس کے دربار سے لاکھوں ضرورت مند روزانہ شادکام ہوتے ہیں جو محتاجوں کو ہزاروں نہیں لاکھوں بخش دیتا ہے۔ خود ایک بے نوا درویش کے آگے دست احتیاج دراز کیے ایک فرزند کی بھیک مانگ رہا ہے ——————

——————————!

(۱)

بے اولاد شہنشاہ

اکبر اعظم کی عمر ۲۸ برس کی ہو چکی تھی لیکن ابھی تک اس کی گود تاج تخت کے وارث سے محروم تھی۔ اس لئے وہ ہندوستان جیسی عظیم الشان سلطنت کا مطلق العنان تاجدار ہونے کے باوجود ہمیشہ مغموم رہتا۔ اُسے گوشہ نشین درویشوں سے دلی عقیدت تھی۔ اُسے یقین تھا کہ ان کی دعائیں ضرور اثر رکھتی ہیں۔ بقول ئے سے

دعا کرتے ہیں مقبولان خدا جس دم
قبولیت فلک سے بہر استقبال آتی ہے

اسی خیال پر جب کبھی اسے سلطنت کے کاروبار سے فرصت ملتی۔ مشائخ اور فقرا کی خدمت میں جا کر اولاد کی زندگی کیلئے دعا کراتا۔ اسی دُھن میں اپنے عہد کا وہ سب سے بڑا سلطان خواجہ معین الدین چشتی کے آستانہ پر حاضر ہوا اور منت مانی۔ کہ اگر اللہ تعالیٰ مجھے جیتا جاگتا بیٹا عنایت فرمائے۔ تو میں آگرے سے اجمیر شریف تک (۱۰۴ کوس) پیدل چل کر حاضری دونگا۔

(۲)

سیکری کا پیر مرد

جن دنوں مغل اعظم اودے پوری کی مہم سے فارغ ہو کر دارالسلطنت آگرہ کو واپس آرہا تھا۔ اس کا گذر سیکری کے مقام سے ہوا۔ امراء نے بتایا کہ اس گاؤں میں ایک درویش رہتا ہے جس کی دعا کا تیر کبھی خالی نہیں جاتا بادشاہ کو اس سے ملنے کا اشتیاق ہوا۔

اچانک ایک غلغلہ سا برپا ہوا کہ دلی کا تاجدار اپنے لاؤ لشکر سمیت شیخ کی زیارت کے لئے حاضر ہو رہا ہے۔ دفعتہً فوجیں رک گئیں۔ اور شاہانہ سواری سے تیس برس کا باوقار انسان نیچے اترا۔ شیخ محمد بخاری اور معین الملک خضر راہ بن کر آگے چلے۔ بادشاہ پیادہ پا فقیر کے جھونپڑے کی طرف روانہ ہوا سیکری کے سنگتراش اپنا کام چھوڑ یہ تماشا دیکھنے جمع ہو گئے۔ لیکن وہ بوڑھا درویش جس کے ملنے کو اکبر سا جوان بڑھا چلا آرہا تھا۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر یاد الٰہی میں محو تھا۔ ابھی فقیر کا جھونپڑا دور ہی تھا۔ کہ شہنشاہ نے ادب سے جوتے اتار دیئے۔ گویا ہاتف غیبی نے فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ إِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى کا فرمان سنا کر اسے متنبہ کر دیا تھا۔ کہ وہ وادی ایمن میں پہنچ چکا ہے اس لئے اسے اپنے جوتے اتار دینے چاہئیں۔

جونہی بادشاہ بوریہ نشین درویش کے قریب پہنچا۔ اس نے مراقبہ سے

سر اُٹھا کر غلط انداز سے نووارد پر نظر ڈالی۔ آنکھوں کا چار ہونا تھا کہ وہی مغلِ اعظم کہ جس کی حکومت کا فرمان برما سے بلخ اور بخارا سے سمرقند تک جاری تھا شیخ کے حضور میں جھک گیا۔ اور دنیا نے کیا دیکھا۔ کہ جس کے دربار سے لاکھوں ضرورتمند روزانہ شاد کام ہوتے ہیں۔ جو مجھتا ہوں کہ ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں بخش دیتا ہے۔ خود ایک بے نوا درویش کے آگے دستِ احتیاج دراز کیے بلک بلک کر بقائے نسل اور قیام سلطنت کے لیے ایک فرزند کی بھیک مانگ رہا ہے۔ فقر کی بارگاہ میں شاہی سرنگوں ہے طاغوتی طاقتیں پامال ہو رہی ہیں۔ انکسار، فروتنی رقت، سوز و گداز، اور خاکساری کے پاکیزہ جذبات بیدار ہو رہے ہیں۔ اکبر اعظم کا یہ نیا زمندانہ رنگ دیکھ کر درویش پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ نورانی چہرہ پوری تابانی سے دیکنے لگا۔ ارشاد ہوا۔

"اکبر! تسلی رکھ۔ پروردگارِ عالم تجھے تین فرزند عطا کرے گا۔"

خوشی سے بادشاہ کی آنکھوں سے آنسو ڈھلک آئے۔ قدم بوس ہو کر بولا۔

"اے اُمید گاہِ بیکساں وائے تکیہ گاہِ تہی داماں! میں عہد کرتا ہوں کہ پہلے بیٹے کو آپ کے قدموں میں لا ڈالوں گا۔ تاکہ آپ کے دامن کے سایہ کی برکت اُس کی محافظ ہو۔ اور وہ زندہ و سلامت رہے۔"

شیخ کی نگاہ ایک دفعہ پھر اُٹھی اور فرمایا مبارک باشد ما ہم ایشاں را بنام

خود ساختیم" یعنی مبارک ہو۔ ہم نے اس لڑکے کو اپنا ہم نام بنایا۔
یہ بزرگ حضرت شاہ سلیم چشتی تھے۔ جو حضرت خواجہ فریدالدین مسعود شکر گنج (پاک پٹن) کی اولاد سے تھے۔ اور یہاں گوشہ گمنامی میں اپنی پاکیزہ زندگی کے مبارک ایام اللہ اللہ میں بسر کر رہے تھے۔

(۳)

سلیم کے گھر میں سلیم کی پیدائش

خداوند عالم کے فضل و کرم سے چند دنوں کے اندر ہی اندر اکبر اعظم کی ملکہ جو راجہ بہارامل والئے جے پور کی صاحبزادی تھی۔ بار آور ہوئی۔ اکبر نے اُسے سیکری میں بھیج دیا۔ تاکہ بچے کی ولادت بھی شیخ کے گھر میں ہو چنانچہ شیخ سلیم کے مکان میں ہی ۱۷ ربیع الاول ۹۷۷ھ کو سلطان ہند کا جگر گوشہ تولد ہوا۔ ممالک محروسہ میں وسیع پیمانہ پر خوشیاں منائی گئیں۔ قیدی رہا ہوئے۔ امراء و وزراء کو خلاع فاخرہ مرحمت ہوئے۔ ملکہ مریم زمانی کے لقب سے سرفراز ہوئیں اور خواجہ حسن ہروی نے ایک عجیب و غریب قصیدہ لکھ کر پیش کیا۔ جس کے پہلے مصرعہ سے اکبر کا سن جلوس اور دوسرے سے جہانگیر کی ولادت نکلتی تھی (چند اشعار ملاحظہ ہوں)

لِلّٰہ الحمد از پئے جاہ و جلالِ شہریار — گوہر مجید از محیطِ عدل آمد در کنار
کس نیارد دہر یہ نذریں بہ اگر دارد کسے — ہر کہ دارد گو بیا چیزے کہ داری بیار

مصرعہ اول زروئے جلوس بادشاہ از دوم مولود نور دیدہ عالم براز

بادشاہ اس قصیدے کو سن کر بہت محظوظ ہوا۔ اور دو لاکھ اشرفیاں انعام میں عطا فرمائیں جس کمرے میں جہانگیر پیدا ہوا۔ اس کا نام راج محل پڑ گیا۔ حضرت شیخ کی مرضی کے موافق شہزادے کا نام سلطان سلیم رکھا گیا مگر اکبر اعظم بالعموم پیار و محبت سے شیخو بابا کہہ کر پکارتے تھے۔

اب شہنشاہ نے منت پوری کرنے کے لئے اجمیر کا سفر کیا۔ چنانچہ ۱۴۰ میل کا فاصلہ بادشاہ نے بیگمات سمیت پیدل چل کر طے کیا۔ اس تقریب کی خوشی میں اکبر اعظم نے آستانہ شریف پر ایک وسیع و عریض مسجد بھی تعمیر کرائی۔

(۴)

لال پتھروں کا شہر

سیکری ایک چھوٹا سا گاؤں تھا سلیم کے پیدا ہونے پر اکبر نے اسے اپنے لئے ایسا مبارک خیال کیا۔ کہ اس نے یہاں مستقل طور پر سکونت اختیار کر لی اور شیخ کی خواہش پر اسی گاؤں کے قریب جہاں شہنشاہ بابر نے رانا سانگا پر فتح پائی تھی۔ سنگ سرخ سے ایک شہر کی تعمیر کا سلسلہ شروع کیا۔ اگرچہ یہاں ریگستانی گرمی سموم اور طوفان۔ گرد و غبار اور خوبصورت مناظر کا اس قدر فقدان درپیش تھا۔ کہ انسان دیکھے تو دل بیٹھ جاتے اور ایسے بیابان میں گلستان کا

خواب دیکھنا جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔ مگر اکبری ذوق و ہمت نے وہ لالہ زار بنا دیا۔ کہ یہ مقام تمام عالم میں انتخاب ہو گیا۔

یہ شہر چھ میل کے محیط میں پھیلا ہوا تھا تین اطراف میں سنگین فصیل اور ایک جانب جھیل تھی جب شاہی محلات اور دیوان خاص و عام کی خوشنما عمارتیں بن چکیں تو تمام امراء نے بھی سنگ سرخ کی عمارتیں بنوانی شروع کیں۔ چوڑے چوڑے بازار بنائے گئے۔ ہوادار بالاخانے مدرسے خانقاہیں حمام زنانے اور مردانے باغ بن کر تیار ہوئے۔ ادنیٰ درجہ کے لوگوں نے بھی اپنی بساط کے مطابق مکانات بنوا لئے۔ بادشاہ نے شہر کی تعمیر میں یہ خاص اہتمام ملحوظ رکھا۔ کہ مکان خواہ امیر کا ہو یا غریب کا سنگ سرخ سے تعمیر ہو۔ غریبوں کو پتھر مفت مہیا کئے گئے۔ زمینیں بھی بلا معاوضہ عطا ہوئیں۔ اور بھی کئی قسم کی مراعات سے نوازا گیا۔

۱۵۷۹ء میں پانچ لاکھ ٹکے مصارف سے جامع مسجد بن کر تیار ہوئی۔ یہ شمالاً جنوباً ۳۸۴ فٹ اور شرقاً غرباً ۵۴۲ فٹ تھی۔ اس میں داخل ہونے کے لیئے ایک دروازہ مشرق میں اور دوسرا جنوب کی طرف رکھا گیا۔ یہ اس شہر کی سب سے عالیشان عمارت تھی۔ ۱۵۷۹ء میں اکبر نے اس مسجد میں جمعہ کے موقعہ پر بحیثیت امام کے خطبہ پڑھنا شروع کیا۔ مگر جونہی منبر پر قدم رکھا۔ خوف الٰہی سے لرزنے لگا۔ اور فیضی کے یہ اشعار پڑھ کر نیچے اتر آیا ؎

خداوند سے کہ مارا خسروی داد دل دانا و بازوئے قوی داد
بعدل و داد ما را رہنموں کرد بجز عدل از خیال ما بروں کرد
بود وصفش ز حد فہم برتر تعالیٰ شانہٗ اللہ اکبر

جب شہر تعمیر ہو گیا۔ تو اکناف و اطراف سے لوگ آنے لگے۔ دیوان عام اور خاص میں اکبر اعظم کے دربار منعقد ہونے شروع ہوئے۔ داد و دہش کے دروازے کھول دیئے گئے۔ آئے دن فتح و نصرت کی اطلاعیں پہنچتیں۔ دربار میں اکبری جشن ہوتے۔ بہادروں اور جاں نثاروں کی حوصلہ افزائی ہوتی۔ بڑے بڑے مہاراجے کوہ پیکر ہاتھیوں پر سوار ہو کر آتے ان کے شایانِ شان استقبال ہوتا۔ بادشاہ بغلگیر ہو کر اپنے پہلو میں جگہ دیتا اور عزت و احترام کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ ہونے پاتا۔ معزز مہمان خوشی کے مارے اپنے جامے میں پھولے نہ سماتے۔ امرائے دربار کو توقع سے بڑھ کر صلہ ملتا۔ ابوالفضل اور فیضی جیسے دانائے روزگار، منعم خاں مرزا عزیز کوکلتاش حسین خاں ٹکریہ، جھبش داس راجہ بیربر۔ ملا دوپیازہ شیخ عبدالنبی صدر، شیخ عبدالقادر بدایونی۔ راجہ ٹوڈرمل۔ راجہ مان سنگھ مرزا عبدالرحیم۔ خانخاناں، حکیم ابوالفتح گیلانی حکیم ہمام۔ حکیم نورالدین قرانی فتح اللہ شیرازی سے باکمال امراء ہر وقت دربار میں حاضر رہتے۔ پھر دن مذاکرات علمیہ سے دیوان عام گونجتا رہتا۔ رزم کے معاملات بزم میں طے

ہوتے۔ بنگالہ۔ دکن۔ کابل اور قندہار کے خان زماں، علی قلی خان شیبانی جیسے سرکشان کینہ توز کی سرکوبی کے لئے بڑے بڑے شجاع اور جان سپار افغان اور جہار راجے عزت کے ساتھ رخصت کئے جاتے۔ اکبر اعظم کے لشکر جرار مغلیہ پرچم لہراتے ہوئے روانہ ہوتے۔ شاہان ممالک غیر کے سفرا شرف باریابی حاصل کرنے کے بعد اپنے فرمانرواؤں کے مکاتیب پیش کرتے۔ بڑے بڑے سوداگر کالے کوسوں کا سفر طے کرتے ہوئے اکبری نام سن کر یہاں حاضر دربار ہوتے۔ اور نادرۂ روزگار تحائف پیش کر کے منہ مانگا انعام پاتے۔ مرزا غیاث سے آشوب زمانہ کے شکار اور علی قلی خاں سے فلک جفا پیشہ کے ہاتھوں ظلم وستم اٹھا کر یہاں پہنچتے اور پانصد و پانچہزاری منصب حاصل کر کے ہندوستان کی قسمتوں کے مالک بن بیٹھتے۔ انعام و اکرام کی غیر فانی بارشوں اور اکبر کی قدرشناسیوں نے فتح پور کو وہ شہرت بخشی کہ اکناف عالم میں دہلی و آگرہ اور بغداد و قاہرہ کی طرح مشہور ہو گیا۔

(۵)

مسٹر ریلف فنچ کا بیان

مسٹر ریلف فنچ پہلا انگریز سیاح ہے۔ جس نے ہندوستان کا سفر کیا وہ لکھتا ہے کہ:۔

"ہم آگرہ سے فتح پور سیکری گئے۔ یہ وہ شہر ہے۔ جہاں بادشاہ دربار

لگتا ہے۔ آگرہ کی نسبت یہ شہر زیادہ لمبا چوڑا ہے۔ یہ دونوں شہر لندن سے بہت بڑے ہیں۔ آگرہ سے فتح پور کو جو سڑک جاتی ہے۔ اس پر جگہ جگہ اس کثرت سے سرائیں اور دوکانیں واقع ہیں کہ اس پر ایک لمبے بازار کا گمان ہوتا ہے۔

(۶)

شیخ کا انتقال

دیکھتے ہی دیکھتے جہاں چند سال پہلے چھ سات جھونپڑیوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہاں اتنا عظیم الشان شہر بن گیا۔ کہ اگر یہاں نقارے پر چوٹ پڑتی تو بنگال سے بخارا تک کے سورما کانپ اٹھتے۔ ہندوستان۔ ایران اور دیگر ممالک کے بہترین دماغ کھچ کھچا کر یہاں جمع ہو گئے۔ آگرہ سے سیکری تک کی شاہراہ ایک بڑا بازار نظر آنے لگی۔ ہزاروں ہاتھی۔ گھوڑے اور اونٹ ہر وقت اصطبل شاہی میں بندھے نظر آتے۔ یہ سب کچھ ہو رہا تھا۔ لیکن شیخ سلیمؒ سب کچھ جانتے ہوئے اس ماحول سے اس قدر بے نیاز تھے۔ گویا وہاں کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ نہ کبھی دربار میں چل کر گئے۔ اور نہ کبھی دربار والوں سے ملنے کی خواہش ظاہر کی حسب دستور دنیا سے مستغنی، اپنی دنیا کے آپ شہنشاہ تھے۔ گوشہ فقر و غنا میں بیٹھے قال اللہ و قال الرسول سے دل کو گرما رہے تھے۔ ایک دن اکبر اعظم نے بات بات میں یہ عرض کی کہ حضرت کی

برکت اس دنیا میں ہمارے سروں پر کب تک سایہ افگن رہے گی؟
فرمایا۔ جب سلیم پہلی بار کوئی موزوں فقرہ زبان سے ادا کرے گا۔
ہم اس دارِ فانی سے رخصت ہو جائینگے۔"

یہ سن کر بادشاہ کو بڑا فکر ہوا۔ اور انہوں نے شہزادے کے نوکروں کو حکم دیا کہ شیخوجی کے سامنے کوئی شعر یا موزوں فقرہ نہ پڑھا جائے۔ لیکن مشیت ایزدی میں کون دخل دے سکتا ہے۔ ایک دن ایک عورت نے شہزادے کو یہ دعا سکھائی "الٰہی غنچۂ امید بکشا"۔ سلیم کو یہ دعا بہت پسند آئی اور وہ اس کو پڑھتا ہوا حضرت کے پاس چلا گیا۔ اور شیخ کے سامنے جا کر "الٰہی غنچۂ امید بکشا" پڑھا۔ حضرت خوشی سے اچھل پڑے اور سلیم کو گود میں لے کر خوب پیار کیا۔ اور اکبر اعظم کو بلا کر فرمایا۔ کہ ہمارا وقت آگیا ہے چنانچہ اسی دن بیمار ہوئے اور وفات پائی۔ اس وقت سن شریف ۹۲ برس تھا۔

(۷)

شیخ کا مقبرہ

شیخ کے وصال پر اکبر نے جامع مسجد کے شمال مشرقی گوشے میں دفن کر کے اس پر سنگ سرخ کا خوبصورت مقبرہ تعمیر کیا۔ جب جہانگیر تخت پر بیٹھا۔ تو اس نے سنگ سرخ کے پتھر اکھڑوا کر اس کی جگہ سنگ مرمر کا حسین و جمیل گنبد اور گرداگرد مرمریں مرغولی برآمدہ بنوایا۔ مقبرہ کی عمارت ۴۷ فٹ ۱۱ انچ

مرصع ہے۔ فرش سے چھت تک خالص سنگ مرمر ہے۔ تناسب اور نفاست میں اس روضہ کا شمار دنیا کی بہترین عمارتوں میں ہوتا ہے۔ اصلی قبر تہ خانے میں ہے۔ بالائی قبر پر سیپ کا خوشنما کٹہرہ ہے۔ جو اتنی چابکدستی اور کاریگری سے بنایا گیا ہے۔ کہ دُور دُور سے سیاح اُسے دیکھنے کے لیے آتے ہیں۔

شیخ کی پائنتی میں سنگ سرخ کا ایک اور مقبرہ ہے۔ اس میں شیخ کا پوتا نواب اسلام خاں محو خواب ہے۔ جہانگیر کے زمانے میں یہ بزرگوار بنگال کے گورنر تھے۔ جب اجمیر میں جہانگیر پر بیماری کا غلبہ ہوا تو بنگال میں نواب اسلام خاں کو کشف کے ذریعے یہ علم ہو گیا۔ وہ بہت گھبرایا۔ اس نے خیال کیا۔ کہ اگر کوئی عزیز چیز جہاں پناہ پر سے تصدق کرے تو وہ شہنشاہِ بحروبر ضرور شفایاب ہو جائے گا۔ چنانچہ اس نے اپنے فرزند ہوشنگ کے فدا کرنے کا ارادہ کیا۔ پھر اس کی کم عمری کے سبب رحم کھا کر اس کی جگہ اپنے آپ کو جہانگیر اعظم پر تصدق کیا۔ خدا نے اس کے دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی دعا سُن لی۔ وہ آناً فاناً فوت ہو گیا۔ اور بادشاہ بستر سے اُٹھ بیٹھا۔

نواب اسلام خاں نے ۱۶۱۳ء میں وفات پائی۔ اس کی لاش کو بڑے اعزاز و اکرام سے فتح پور میں لا کر شیخ کے قدموں میں سپردِ خاک کیا گیا۔

(۸)

اُچ کے پیرزادے

فتح پور کے جاہ و جلال کا زمانہ تھا۔ اکبری شوکت و اقبال نے چندر گپت اور اشوک اعظم کے اقتدار کی داستان کو قصہ پارینہ بنا دیا تھا۔ انہی ایّام میں اُچ کے بہت بڑے پیر مخدوم سید حامد گنج بخش جیلانی کا انتقال ہو گیا۔ اُن کے دو صاحبزادے تھے۔ اور دونو سجادگی کے دعویدار تھے۔ چونکہ اس دربار کو بہت بڑی جاگیر حکومت کی طرف سے ملی ہوئی تھی۔ اس لئے صوبہ دار ملتان نے معاملہ دربار شاہی کو بھیج دیا۔ دربار سے دونو بھائیوں کو طلبی کا فرمان پہنچا۔ چنانچہ آسمانِ معرفت کے یہ شمس و قمر کالے کوسوں کا سفر طے کر کے بہزار دقّت فتح پور سیکری حاضر ہوئے۔ اکبر نے علمار فضلاء اور رؤسائے ملت کو تفتیش و تحقیق پر مامور کیا۔ دورانِ تفتیش میں بڑے بھائی سید عبدالقادر نے حضرت والد ماجد کا قرآن شریف، مجموعہ اوراد اور چند تبرکات پیش کرتے ہوئے فرمایا۔ کہ اگر چھوٹے بھائی صاحب ولیعہد ہوتے۔ تو یہ چیزیں ان کے پاس ہوتیں۔ طے پایا کہ اس بارہ میں خود قرآن مجید سے مشورہ لیا جائے چنانچہ مصحف مبارک کھولا گیا۔ تو پہلے پہل یہ آیت شریفہ نظر میں آئی۔

فَخَرَجَ مِنْهَا خَائِفًا يَتَرَقَّبُ قَالَ رَبِّ نَجِّنِي مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝

چونکہ آیہ کریمہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے منسوب تھی۔ اس لئے مجلس شوریٰ نے

فیصلہ سید جمال الدین موسیٰ کے حق میں لکھ کر دربار میں پیش کیا۔ جس پر بادشاہ نے آپ کی مسند نشینی کا اعلان کر دیا۔ چونکہ اس واقعہ سے دونوں بھائیوں میں شکر رنجی کے پیدا ہونے کا امکان تھا۔ اس لئے اکبر نے مصلحتہً سید عبدالقادر کو تو اپنے پاس رکھا۔ اور حضرت موسیٰ پاک کو فوجی افسر بنا کر دکن کی طرف جہاد پر بھیج دیا۔

مخدوم صاحب کو اکبری دربار میں رہتے ہوئے تھوڑا سا ہی عرصہ ہوا تھا۔ کہ ایک دن جبکہ اکبر دربار میں پوست پی رہا تھا۔ سید عبدالقادرؒ تشریف لائے۔ اکبر نے بے محابا یہ شغل جاری رکھا۔ بلکہ آپ کو بھی پوست نوشی کی دعوت دی۔ آپ بے حد جوشیلے نوجوان تھے۔ غصہ سے کانپ اُٹھے۔ اور فرمایا۔

”اے مردِ حق ناشناس! تو خود بھی گناہوں سے ملوث ہو رہا ہے۔ اور مجھے بھی گناہوں کی دلدل میں پھنسانا چاہتا ہے۔ کیا ایسا کرتے ہوئے تمہیں خدا سے شرم نہیں آتی ——— !

اس وقت تو اکبر خاموش ہو رہا۔ لیکن اور موقعہ پر جبکہ آپ دیوانِ عام میں نوافل ادا کر رہے تھے۔ مخاطب کر کے کہا۔

”حضرت! آپ کا یہاں نوافل ادا کرنا آدابِ دربار کے خلاف ہے۔“

مخدوم صاحب نے "الملک للہ" کا نعرہ لگایا۔ اور اس قدر غضبناک ہوئے۔ کہ آنکھوں سے چنگاریاں برسنے لگیں۔ اکبر پہ غیظ و غضب کی نگاہ ڈالتے ہوئے فرمایا۔

"اچھا — ! اپنے دربار میں خدائے ذوالجلال کا ذکر بھی گوارا نہیں — ۔!! سنو اکبر! یہ حکومت جس پر تم اس قدر ناز کر رہے ہو بہت جلد تمہارے خاندان سے چلی جائے گی"

اتنا کچھ کہا۔ اور دربار سے نکل کر چلے گئے۔

اکبر شیخ کی بددعا سے کانپ اُٹھا۔ آپ کے منانے کے لئے ہزار جتن کئے۔ سواری اور پیادوں کا بندوبست بھی کیا۔ مگر آپ راضی نہ ہوئے اور پیران پیر کے گھرانے کا فیرزنداں گرجتا برستا اُچ کو روانہ ہوا۔

اکبر کو جب سید عبدالقادرؒ کے منانے میں کامیابی نہ ہوئی۔ تو تیز رفتار قاصد بھیج کر دوسرے صاحبزادے سید جمال الدین موسیٰ جیلانی کو دکن سے واپس بلایا۔ اور شاہ صاحب کی گرم کلامی کا ذکر کر کے دعا طلبی کی استدعا کی۔

آپ نے فرمایا۔ فقیر عبدالقادر کا تیر تو واپس نہیں لا سکتا۔ البتہ عرصہ حکومت میں اضافہ کی درخواست کر سکتا ہے۔ آپ تسلی رکھیں کہ پانچ پشتوں تک آپ کی اولاد سے حکومت نہ جائے گی۔

اس کے بعد چند دن آپ نے بھی دربار میں گزارے۔ مگر اس شان سے کہ جب ظہر کا وقت آتا۔ خادم کو اذان کا اشارہ کرتے اللہ اکبر! اللہ اکبر!! کی فلک شگاف صدا سے دیوان عام گونج اُٹھتا۔ پھر کس کی مجال تھی۔ کہ وضو کر کے شامل نماز نہ ہوتا۔ اگرچہ اکبر کے دماغ میں بے دینی کی بُو پیدا ہو چلی تھی۔ لیکن وہ بھی بسا اوقات شامل نماز ہو جاتا اور کبھی کبھی اجلاس برخاست کا حکم سنا کر محلسرائے میں داخل ہو جاتا۔

فتح پور کا ماحول حد سے زیادہ رنگین ہو چکا تھا۔ علماء اور مشائخ کی جگہ دربار میں بھانڈوں اور مسخروں نے سنبھال لی تھی۔ مُلّا دو پیازہ اور بیربل اکبر کے مزاج پر چھا گئے تھے۔ اس لئے مخدوم سید موسیٰ جیلانی کی طبع مبارک اُچاٹ ہو گئی۔ اور اکبر سے اپنے وطن جانے کی اجازت مانگی۔ چنانچہ اس نے آپ کے اصرار پر پانصدی کا منصب عطا کر کے انتہائی عزت و احترام کے ساتھ رخصت کیا۔ اور سرکاری طور پر آپ کے سفر کا انتظام بھی کر دیا۔

(۹)

فتح پور کی بربادی ــــــــــ

شیخ سلیمؒ کو فوت ہوتے ابھی چند ہی سال گزرے تھے۔ کہ فتح پور سیکری عیش و عشرت کا گہوارہ بن کر رہ گیا۔ اکبری امراء سے اخلاقی لغزشیں

صادر ہونے لگیں۔ یہاں تک کہ شیخ کے مزار کے قریب ہی علی الاعلان شراب کا دور چلتا تھا۔ غیرتِ خداوندی جوش میں آئی۔ اور اس خدا یاد انسان کی مقدس ہڈیوں کو اس نامشروع ماحول سے بچانے کے لئے بادشاہ کی توجہ کو لاہور کی طرف پھیر دیا گیا۔ اور وہ محلات جن میں آٹھوں پہر ایک ہنگامہ سا برپا رہتا تھا۔ اپنے مکینوں سے اچانک خالی کر دیئے گئے اور اب عبدالقادر جیلانیؒ کی یہ پیشین گوئی پوری ہو رہی۔ کہ یہ محلات اور ایوان جن پر تم اتنا گھمنڈ کر رہے ہو۔ ایک دن مور و ملخ کا مسکن بنا دیئے جائینگے اب یہ کیفیت ہے۔ کہ وہاں دن کو بھی جاتے ہوئے ہول آتا ہے۔ لیکن شیخ سلیمؒ کے مزار سوز بار پر رات کو بھی چہل پہل رہتی ہے۔ بلکہ چاندنی راتوں میں احمرین مسجد کے اندر مرمریں مقبرے کا انعکاسی عمل عجیب کیفیات پیدا کرتا ہے۔ الغرض جس طرح اکبر اعظم اس بے نوا درویش کے آگے جھکا تھا۔ آج اس کے پر شکوہ مگر ویران محل بھی اسی طرح مرمریں گنبد کے آگے سجدہ ریز نظر آتے ہیں۔

صدیاں گذر چکی ہیں۔ لیکن فتح پور کے ان محلات میں کہنگی کے آثار تک نہیں ملتے معلوم یوں ہوتا ہے۔ گویا مکین ابھی ابھی اسے چھوڑ کر گئے ہیں محلات کی خوبصورتی و نفاست اور مضبوطی و پختگی اب ضرب المثل بن چکی ہے نگاہِ عبرت دیکھتی ہے۔ اور قدرت کی بے نیازی پر حیران رہ جاتی ہے

اگرچہ شہنشاہ اکبر اور شاہ جہانگیر ان محلات میں نہیں ملتے۔ تاہم ان کے ذرّہ ذرّہ میں ان کے جبروت و جلال اور ان کی فیاضی و علوہمتی کی چمک موجود ہے۔ باکمال سنگتراشوں اور عالی دماغ نقاشوں نے ان عمارات کو عجیب و غریب نقش و نگار۔ اور انواع و اقسام کی زیبا کشوں سے اس خوبی کے ساتھ مزین اور مرصع کیا ہے۔ کہ پتھر کی مضبوطی اور نفاست کا تو کیا کہنا بلکہ جس گارے یا چونے سے پتھروں کو وصل کیا ہے۔ وہ بھی فولاد کو شرماتا اور ہشت دہات کو مات کرتا ہے۔ بڑے بڑے انجینئر اور کیمسٹ اس کے اجزا علیحدہ نہیں کر سکتے۔ اور کسی کی سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ یہ گارا کس ترکیب اور کن اجزا سے بنایا گیا ہے۔ یہ حالت زائر دیکھتا ہے۔ تو اس کی زبان پر بے ساختہ قرآن حکیم کی یہ آیات جاری ہو جاتی ہیں۔

"وہ بہت سے باغات اور چشمے چھوڑ گئے اور کئی کھیتیاں اور عمدہ و نفیس مقامات اور ایسی ہی کئی نعمتوں سے کہ جن سے وہ مزے کیا کرتے تھے۔ محروم ہو گئے۔ یہ بات اسی طرح ہے۔ اور ہم نے ایک دوسری قوم کو ان کا وارث قرار دیا۔ اور جو ہزاروں سال سے اس سرزمین میں کوس لمن الملکی بجا رہے تھے۔ ایک دن اقوام عالم کی نگاہ سے ایسے پوشیدہ ہوئے کہ آسمان اور زمین نے ایک آنسو بھی ان کی یاد میں نہ بہایا۔ اور نہ ان کو مزید مہلت دی گئی۔"

(قرآن حکیم)

عربی

عربی، اسلام کی زبان ہے۔

عربی، قرآن کی زبان ہے۔

عربی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان ہے

عربی، اہلِ جنت کی زبان ہے۔

اسلئے

عربی سیکھنا مسلمانوں پر لازم ہے

اردو

اُردو، ہماری مادری زبان ہے۔

اُردو، ہماری وطنی زبان ہے۔

اُردو، دنیا کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت پاکستان کی سرکاری زبان ہے

اسلئے

اُردو کو رائج کرنا اور اس کی ترقی کے لئے کوشش کرنا ہمارا فرض ہے،

ماخذ

اخبار الاخیار

تعارف

شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمتہ اللہ علیہ کا اسم گرامی محتاج تعارف نہیں۔ آپ اکبری دور کے بہت بڑے عالم تھے۔ آپ کے علمی کمالات کی تمام اسلامی دنیا معترف ہے۔ تمام مورخین کا اس امر پر اتفاق ہے۔ کہ اگرچہ فن حدیث کے فاضل آپ سے پہلے بھی ہندوستان میں موجود تھے۔ لیکن صحیح معنوں میں اس علم کی ترویج کا سبب آپ ہی بنے۔ حطۃ فی ذکر الصحاح ستہ میں آپ کے علمی خدمات کو اس طرح سراہا گیا ہے۔ اوّل من جاء بعلم الحدیث فی الھند وافاضہ علی سکانہ فی احسن تقویم آپ سو کتب کے مصنف ہیں۔ اور دواوین کا تو شمار ہی نہیں ہے شیخ محمد اکرام صاحب ایم اے نے اپنی قابل قدر تصانیف آب کوثر۔ رود کوثر وغیرہ میں آپ کو شاہ ابوالمعالیؒ اور خواجہ باقی باللہ کا مرید ظاہر کیا ہے۔ آب کوثر کے صفحہ ۱۲۱ پر آپ کی بیعت کا ذکر اس طرح فرمایا ہے "سلسلہ قادریہ میں آپ نے شاہ ابوالمعالی سے بیعت کی تھی" رود کوثر کی عبارت یہ ہے۔

> "۱۵۹۹ء میں خواجہ محمد باقی باللہ نقشبندی قدس سرہ دہلی تشریف لائے تو شیخ نے ان کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت کی اور ارشاد و ہدایت کی اجازت حاصل کی۔" (۲۲۸)

لیکن شیخ کی اپنی عبارت سے پتہ چلتا ہے۔ کہ وہ حضرت مخدوم سید جمال الدین موسیٰ پاک

شہید کے مرید تھے۔ اخبار الاخیار کے خاتمہ پر شیخ نے اپنی بیعت کا حال تفصیل سے لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ جب حضرت موسیٰ پاک رحمتہ اللہ علیہ اکبر اعظم سے رخصت ہو کر اپنے وطن کو تشریف لئے جا رہے تھے۔ چند دنوں کیلئے حضرت نے دہلی میں قیام کیا۔ لوگوں کو جب حضرت کی آمد کا علم ہوا۔ کشاں کشاں خدمت عالیہ میں حاضر ہونے لگے۔ شیخ عبدالحق کے کانوں میں جب آپ کا نام نامی پہنچا۔ تو وہ چونک پڑے۔ اس طرح جیسے کوئی بھولی ہوئی بات یاد آگئی ہو۔ اُفتاں و خیزاں حضرت کی خدمت میں باریاب ہوئے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے ہی سو جان سے فدا ہو گئے۔ ۶ر شوال کو علم و ادب کے اس شہریار نے حضرت موسیٰ پاک کے دست حق پرست پر بیعت کی۔ مرقد سے فیضان حاصل کرنے کیلئے آپ نے کئی بار اُچ کا سفر کیا۔ اور مدتوں ان کی خدمت میں حاضر رہے۔ ۱۰۰۱ھ میں جب پیر طریقت نے عالم آخرت کا سفر کیا۔ تو ان کے صاحبزادے سید جان محمد گیلانی کو جو اپنے زمانے کے بہت بڑے عالم اور زبردست ولی تھے منت سماجت کر کے دِلّی لے آئے۔ چنانچہ انہوں نے اس شہر کو ایسا اپنایا۔ کہ انتقال کے بعد بھی نہ چھوڑا۔ کوٹلہ فیروز شاہ کے قریب آپ کا مزار پُر انوار واقع ہے۔

بقول حضرت سعدی "دہ درویش بیک گلیمے بخسپند" فقرا کو ایک دوسرے سے بے پایاں محبت ہوتی تھی۔ حضرت محدث دہلوی بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہ تھے۔ ان کے اکثر مشائخ اور فقراء سے دوستانہ مراسم تھے۔ شاہ ابوالمعالی اور خواجہ باقی باللہ سے آپکو زیادہ عقیدت تھی۔ شیخ عبدالوہاب سے بھی ارضِ پاک میں گہرا رابطہ رہا۔ لیکن آپ اُن

ہیں سے کسی کے مرید نہ تھے اور نہ ہی آپ نے حضرت مخدوم صاحب کی بیعت فسخ کی تھی
حضرت شیخ کے ان الفاظ پر غور فرمایئے۔ کیا ایسے خیالات کا انسان اور پھر محدث دہلوی
سا ثقہ عالم متعدد اشخاص سے مریدی کی نسبت رکھ سکتا ہے!

"میں اس فضیلت کی طلب میں دیوانہ وار سرگرداں رہا۔ لیکن کوئی ایسا صاحب کمال
نظر نہ آیا جس سے اطمینان قلب حاصل ہوتا میرا یقین پختہ ہو چکا تھا۔ کہ واہب العطایا
ضرور کوئی ایسا شہباز طریقت عطا فرمائینگے۔ جسے صاحب لولاک سے روحانی اور جسمانی
دونو قرب حاصل ہونگے۔ تاکہ ہاتھ میں ہاتھ ملانے کا جو مقصد ہے پوری کامیابی سے
حاصل ہو۔ اگر ——— ایسا مرد کامل مل گیا تو ——— ہاتھ دونگا اور پاؤں
پکڑ لوں گا۔ زندگی بھر اس کی خاک پا کو سرمہ بناؤں گا۔ اگر دم بھی نکلے گا۔ تو اس کے
قدموں کے ہی نیچے ——— اسی آرزو میں ملک ملک کی خاک چھانتا پھرتا تھا
کہ آخر میری صدق نیت کا پودا بار آور ہوا۔ الی آخرہ ———

اسی بیان میں شیخ نے اپنے مرشد کا ایک ایسا فقرہ درج کیا ہے جس سے معلوم
ہوتا ہے کہ دہلی کے مشائخ سے محدث دہلوی کے جو مراسم تھے ان سے بحر طریقت کا وہ
شناور بخوبی واقف تھا۔ اسی لئے بیعت میں لینے سے پہلے پہلے دلشگاف الفاظ میں کہہ یا کہ

لہ شیخ کے بیان سے پتہ چلتا ہے۔ کہ (ک) سالک کیلئے کسی مرد کامل کی بیعت کیوں ضروری ہے
(ب) مرشد کے انتخاب میں کیا کیا خصوصیتیں پیش نظر رہنی چاہئیں (ج) یک درگیر محکم بگیر کی
اہمیت (د) استخارہ کی تحریک یہ سب کچھ آپ کو آگے چل کر معلوم ہوگا۔

اے تشنہ کام! ہم سب ایک دریا کی نہریں ہیں۔ دنیا میں اور بھی بہت سے ایسے لوگ ہیں۔ جو اپنے آپ کو اسی بحرِ بسیط کی نہر خیال کرتے ہیں۔ پہلے اُن کی خدمت میں حاضر ہو اور اپنی تشنہ کامی پیش کر۔ اس کے بعد جس نہر کا پانی تجھے زیادہ شیریں معلوم ہو۔ اُسے نوش جان کر ــــــــ!

یعنی اسی ملک میں صوفیاء کے بے شمار سلسلے ہیں اور وہ روحانیت سے خالی بھی نہیں۔ پہلے ٹھوک بجا کر انہیں دیکھ لے ممکن ہے ان میں مجھ سے زیادہ خدا یاد درویش مل جاتے تو وہ بہر حال بہتر ہوگا۔ ورنہ میں تو موجود ہی ہوں۔

اس زمانہ میں شاہ ابوالمعالیؒ۔ خواجہ محمد باقی باللہ۔ حضرت مجدد الف ثانی۔ شیخ سلیم چشتی، کمال کاشمیری، امام العلماء عبداللہ تلنبی اور مخدوم الملک عبداللہ سلطان پوری جیسے باکمال درویش موجود تھے۔ شیخ عبدالحق سا متعدد عالم ان کے فضل کمال سے بے خبر نہیں رہ سکتا تھا۔ اکثر مشائخ سے انکے دوستانہ مراسم تھے۔ ان سے خط و کتابت کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ لیکن اس کے باوجود اس کا جواب سنئے:۔

یہ سن کر میری چیخ نکل گئی۔ اور فریاد کی۔ کہ:۔

ہائے! میں تو سراب تخیل کے طویل میدان میں حیران اور تحیر کے کنارے پر سرگرداں ہوں۔ مجھے بحر سے کیا نسبت کہ آواز وہاں تک پہنچے۔ میں تو حضور کے قدموں تک پہنچا ہوں۔ جہاں چاہیں پہنچا دیں ورنہ میری کیا ہستی اور کیا بساط کہ معرفت الٰہی کا دم بھروں ــــــــ!"

ان فقرات سے صاف ظاہر ہے۔ کہ شیخ تصوف کے باقی تمام سلسلوں اور درویشوں سے خالی الذہن ہو کر حضرت کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ شیخ نے عبدالوہاب متقی سے بھی ضرور علمی صحبتیں کیں۔ ان سے علم حدیث کی سند حاصل کی اور برسوں شاہ ابوالمعالی اور خواجہ باقی اللہ کے ہم صحبت رہے ان سے شیخ کو قلبی محبت بھی تھی۔ اور ارادت بھی لیکن آپ نے زندگی بھر کا سودا صرف ایک شخصیت سے کیا ہے۔ اور وہ ملتان کے بہت بڑے پیر شمس العارفین سلطان السالکین حضرت مخدوم سید ابوالحسن حافظ محمد جمال الدین موسیٰ پاک شہید ؒ تھے۔ اگرچہ یہ کتاب افسانوں کی ہے لیکن شیخ کی بیعت کا سچا قصہ اتنا دلچسپ ہے۔ کہ افسانے سے زیادہ پُر لطف معلوم ہوتا ہے اور نیز آج جبکہ عروس البلاد ملتان اس پایہ کے درویش دکھانے سے قاصر ہے مُسلمانانِ دورِ گزر کی نگہ ہی میں یہ حقیقت ایک افسانہ معلوم ہوتی ہے ؎

بیکار پڑا ہے ترا سامانِ تجلّی
اے وادیٔ ایمن کوئی موسیٰ نہیں اُٹھتا

---

[1] اکرام صاحب نے صرف محدث دہلویؒ کو مغل دَور کا جید عالم اور مجدد الف ثانی کو زبردست شیخ تسلیم کیا ہے۔ لیکن جن قدسی نفوس کی خاک پا کو یہ حضرات سرمہ ہدایت جانتے تھے اور جن کی نظر کیمیا اثر نے ان کو اس مرتبے پر پہنچایا تھا۔ انہیں آپ نے اس فہرست میں شمار ہی نہیں کیا محض اس لئے کہ ان کی تصانیف آپ کی نظر سے نہیں گذریں۔ یا اس لئے کہ ان کے علمی تبلیغی اور مجاہدانہ کارناموں سے آپ کو آگاہی نہیں ہو سکی۔

ع قیاس کن ز گلستان من بہار مرا

(۱)

تاج البلاد دہلی کا ایک ذہین طالب علم

میں نے اپنے بچپنے کی ابھی تین چار منزلیں ہی طے کی تھیں کہ میرے والد بزرگوار سخت بیمار ہو گئے۔ ان کی ضعیفی کا زمانہ تھا۔ ان کے یارانِ غمگسار ایک ایک کر کے رخصت ہو چکے تھے۔ اس مرض میں رفع تکلیف اور دفع دلگیری کا میں ہی علاج تھا۔ مجھے وہ ایک لمحہ کے لئے بھی اپنی جوارِ رحمت و کنارِ عنایت سے جدا نہ کرتے تھے۔ خدا تعالیٰ نے میرے والد ماجد میں وہ تمام خوبیاں جمع کر دی تھیں۔ جو ایک ماہر فن استاذ کے لئے ضروری ہوتی ہیں۔ وہ بے پناہ اثر و نفوذ کے مالک تھے محض ان کی توجہ اور اثر کا ہی فیض تھا۔ کہ میں نے دو تین ماہ میں قرآن شریف ختم کر لیا۔ اس کے بعد انہوں نے لکھنے کی طرف توجہ دلائی۔ خدا جھوٹ نہ کہلائے۔ ایک ہی ماہ میں مجھے انشا پردازی کی قدرت حاصل ہو گئی۔ پھر مجھے نظم شروع کرائی۔ گلستاں، بوستاں اور دیوان حافظ پر چند دنوں میں ہی عبور ہو گیا۔

قرآن شریف حفظ کرانے کے بعد میزان الصرف یاد کرائی مصباح اور کافیہ تک خود پڑھایا۔ میرے حافظے کا یہ عالم تھا۔ کہ کافیہ۔لب اور ارشاد کا ایک ایک جزو روزانہ یاد کر لیتا تھا۔ صحیح اور محشے جیسی کتابوں کو تو استاد کے سامنے دہرانے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوتی تھی۔ اس زمانے میں ذہن اس قدر تیز تھا۔ کہ کوئی کتاب کتنی مغلق کیوں نہ ہوتی اسے پڑھے بغیر نہیں چھوڑتا تھا ______

بارہ تیرہ سال کے سن میں شرح عقائد اور شرح شمسیہ کا سبق شروع تھا۔ پندرہ سولہ سال کی عمر میں مختصر و مطول ختم ہو گئی۔ والد صاحب میری زود رس طبیعت کی جولانیاں دیکھ دیکھ کر پھولے نہ سماتے فرمایا کرتے کہ انشاء اللہ تو بہت جلد عالم فاضل ہو کر مسند ارشاد کی زینت بنے گا اور میں وسادۂ پیری پر تکیہ لگا کر تیری دینی خدمت کے نظارہ سے آنکھیں روشن کرونگا

ابتدائے طفولیت سے مجھے یہ معلوم نہیں تھا۔ کہ کھیل کسے کہتے ہیں نیند کیا ہے مصاحبت کس بلا کا نام ہے۔ آرام و آسائش کا کیا مفہوم ہے اور سیر و سیاحت کیا بلا ہوتی ہے۔ مجھے یاد نہیں۔ کہ تحصیل علم کے بے پایاں شوق کے سبب کبھی وقت پر کھانا کھایا ہو۔ یا وقت پر نیند کی ہو۔ سردی گرمی کی پرواہ نہ کرتے ہوتے مدرسہ دہلی میں حاضر ہوتا تھا۔ جو میرے گھر سے دو میل کے فاصلے پر تھا۔ اور لطف یہ کہ طلوع فجر سے پہلے مدرسے میں پہنچکر

چراغ کی روشنی میں ایک جزو یا کم و بیش کا مطالعہ بھی کر لیتا تھا۔ گاہے گاہے ایسا اتفاق بھی ہو جاتا۔ کہ مشروح سے بعض پیچیدہ حواشی بھی لکھ لیتا فنا فی العلم ہونے کے باوجود اورادِ اذکار اور نوافل کی کثرت کی یہ کیفیت تھی کہ میرے واقف کار اس صورتِ حال پر حیرت و استعجاب کا اظہار کرتے تھے۔ رات کا بیشتر حصہ تسبیح و تہلیل میں بسر ہوتا تھا۔

والد کے فیضِ صحبت نے طبیعت میں انکسار اور فروتنی پیدا کر دی تھی فرماتے تھے۔

"بیٹا کسی سے علم کی بحث میں الجھنے کی کوشش نہ کرنا۔ اور کسی کی طبیعت کو مکدر نہ کرنا۔ اگر دورانِ بحث میں معلوم ہو جائے۔ کہ فریقِ ثانی حق پر ہے۔ تو بلا تامل قبول کر لینا۔ اگر مخاطب حق پر نہ ہو۔ تو دو تین دفعہ اسے قائل کرنے کی کوشش کرو۔ اگر نہ مانے تو یہ کہہ کر خاموش ہو جاؤ کہ میری تحقیق یہی ہے ———— !

چنانچہ زندگی بھر میرا یہی معمول رہا۔ سترہ اٹھارہ برس کی عمر میں جب تمام علوم عقلی و نقلی سے فارغ ہو گیا۔ تو والد نے جو سلسلہ عالیہ قادریہ میں نسبت مریدی رکھتے تھے۔ ایک دن پاس بٹھا کر کہا۔ کہ اپنی ارادت یقین کی نسبت حضرت غوث پاک سے مربوط کر۔ کیونکہ کوئی سالک جب تک اس بارگاہِ عالیہ کی خاک نہ بنے۔ منزلِ مراد کو نہیں پہنچتا۔ اس کے بعد وہ بارہا فرمایا کرتے۔

"بابا مُلّا تے خشک وناہموار نباشی"۔ اس لئے عشقِ الٰہی کا خمار پوری شدت سے میرے قلب و دماغ پر مستولی ہو گیا۔ تصوف کی کتب میں یہ امر نظر سے گذر چکا تھا۔ کہ سالک بجز دستِ شیخ "ہالک" ہے لیکن وسوسۂ شیطانی سدِّ راہ ہو جاتا۔ کہ با ایں ہمہ علم و دانش اپنا ہاتھ دوسرے کے ہاتھ میں دینا موجبِ ذلت ہے۔ اس قسم کے کئی وسوسے اور خدشے آتے رہے۔ میں نے اپنے معاصرین اور احباب سے مشورہ لیا۔ مگر کوئی چارہ گر نہ بن سکا۔ آخر الامر میں نے استخارہ کیا اس کے بعد عقل و خرد کا دامن چھوڑ کر دیوانگی کو اختیار کیا ؎

زیں خرد بیگانہ مے بایدشدن

دست در دیوانگی باید زدن

خدا کے فضل سے میرے تمام وسوسے دُور ہو گئے۔ میں نے تمام تعلقات سے کنارہ کر لیا۔ اور غیروں کے خیال سے خالی ہو کر دل کے دروازے پر دستک دی۔ ہادیٔ گم گشتگان اور چارہ گرِ بے چارگان نے اپنی طرف کھینچا کشش عشق کی راہنمائی مجھے ماوراء النہر لے گئی۔ یہ مینو سواد خطہ ان دنوں علم و معرفت کا گہوارہ بنا ہوا تھا۔ قدم قدم پر جنیدؒ و شبلیؒ جیسے فخرِ روزگار مشائخ مشعلِ ہدایت روشن کئے بیٹھے تھے۔ میں نے ان کے درس میں شریک ہو کر اس قدر کمال حاصل کیا۔ کہ اب تعجب آتا ہے۔ کہ کیونکر حاصل ہوا۔ اگر اس نعمتِ علمی کا سو سال بھی شکریہ ادا کروں تو کم ہے۔

(۲)

حرمین کا سفر

۹۹۶ھ میں قادرِ مطلق نے اس بینوا کی گردن میں شوق کی زنجیر ڈال کر کشاں کشاں اپنے در پہ پکڑ بلوایا۔ اس کے بعد منزل مراد یعنی اپنے محبوب علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بارگاہ میں مقیم کر دیا۔ الحمدللہ کہ اس حریم حرمت سے مجھے ناکام واپس نہ لوٹایا۔ آستانِ نبوت میں بڑے بڑے علماء اور مشائخ قال اللہ وقال الرسول سے مردہ دلوں میں زندگی کی نئی روح پھونک رہے تھے ان سب کی خدمت میں خصوصاً شیخ عبدالوہاب متقی جو شیخ علی متقی کے صحیح جانشین اور خلیفہ تھے کی خدمت میں زانوئے تلمذ تہ کر کے میں نے علم حدیث کو بدرجہ اکمل حاصل کیا۔ اس کے بعد خبیر، بشیر، نذیر کی جناب سے ایسی اشارات اور بشارت حاصل ہوئی۔ کہ اس کا شمہ تک بیان نہیں ہو سکتا۔ مجھے یقین ہو گیا۔ کہ گوہرِ مراد حاصل ہونے میں اب کوئی دیر نہیں۔ سفینۂ نوح پر سوار ہو چکا ہوں۔ ساحل نجات آیا چاہتا ہے۔ اور یہ اتفاق ہوا۔ کہ حضرت غوث صمدانی، محبوب سجانی، سید عبدالقادر جیلانی کا دامن مضبوطی سے تھام لے۔ چنانچہ حضرت کا خیال ہر وقت مشغول رہنے لگا۔ نسبت بوئے کردم

دنپناہ بارگاہِ او بُردم ——————

اس کا یہ مطلب نہیں۔ کہ حضرت غوثِ صمدانی محبوب سجانی سے محبت نہ

طریقت مجھے بشارت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہوئی نہیں! نہیں!! اقلیم معرفت کے اس تاجدار کا اسم گرامی تو اس وقت سے میری لوحِ دل پر کندہ تھا۔ جبکہ مجھے اپنے تن بدن کا ہوش بھی نہ تھا ؎

ما بعشق تو نہ امروز گرفتار شدیم
کہ گرفتاری ما با تو ز روزِ ازل است

حضرت کی جاذبہ محبت مجھے خود بخود اپنی طرف کھینچتی تھی۔ لیکن ابھی مقدر میں نہ تھا کہ ان کا کرشمہ عنایت بلاتا۔ چند مرتبہ وابتغوا الیہ الوسیلہ کی غیبی بشارتیں سننے میں آئیں اور میں اس فضیلت کی طلب میں دیوانہ وار سرگرداں رہا۔ لیکن کوئی ایسا صاحب کرامت نگاہ میں نہ آیا۔ کہ جس سے اطمینان قلب نصیب ہوتا۔ میرا یہ یقین پختہ ہو چکا تھا کہ واہب العطایا ضرور کوئی ایسا شہبازِ طریقت عطا فرمائیں گے۔ جیسے صاحب لولاک روحی فداہ سے روحانی اور جسمانی دونو قرب حاصل ہوں گے۔ تاکہ ہاتھ میں ہاتھ ملانے کا جو مقصد ہے۔ پوری کامیابی سے میسر ہو سکے۔ اگر ایسا مردِ کامل مل گیا۔ تو ہاتھ دوں گا اور پاؤں پکڑ لوں گا۔ زندگی بھر اس کی خاکِ پا کو سرمہ بناؤں گا۔ اگر دم بھی نکلے گا۔ تو اس کے قدموں کے نیچے اسی آرزو میں ملک ملک کی خاک چھانتا اپنے وطن کو روانہ ہوا۔ افسوس ہے کہ عمر کا بیشتر حصہ مرد کامل کی تلاش میں فنا ہو گیا۔ جس طرف قدم رکھا۔ محروم رہا۔

(۳)

مخدوم سید جمال الدین موسیٰ جیلانی کا مقام

(میں تاج البلاد دہلی میں بیٹھا لوگوں کو علم حدیث کی تعلیم دے رہا تھا۔ ہزارہا تشنگانِ علوم میرے حلقۂ درس میں شریک ہو کر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے دلوں کو گرما رہے تھے۔ لیکن میرا اپنا دل سیماب وار بے قرار تھا۔ میری آنکھیں بقیۂ چشم میں بے تابی سے کسی مردِ کامل کا انتظار کر رہی تھیں اسی سچی تڑپ اور طلب صادق میں میرے لیل و نہار بسر ہو رہے تھے) آخر کار میری نیت کا پودا بار آور ہوا اور میرے سر پر ایک عیسیٰ نفس آ پہنچا جس کا ہر نفس آسمانِ معرفت کا مائدۂ نازل

اور ———

ہر کرشمہ عیب و سرود ادا خرد و اوائل تھا۔

موسیٰ مقام کہ

——— جس کے حسن و جمال کی چمک شجرِ توحید سے ضوفشاں تھی

اور

——— نور اس کا حقیقتِ طور سے روشن تھا۔

خلیل مثال کہ

——— اس کا چہرہ زیبا بوستانِ خُلّت

اور

——— گلستانِ دین وملت تھا۔

مصطفیٰؐ اجمال کہ

——— اس کا دہن نمک دانِ خوانِ اَنَا اَمْلَحُ

اور

——— اس کی زبان تبیانِ قرآن کہ اَنَا اَفْصَحُ کی نقارہ زن تھی۔

مرتضیٰؓ کمال کہ

——— اس کا سینہ بے کینہ بابِ مدینۂ علم و فتوح

اور

——— اس کا دل ابوابِ اسرارِ کشف مفتوح تھا۔

حسنؓ سیرت کہ

——— وارث مرتبہ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْم

اور

——— نائب منصب بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَؤُفٌ الرَّحِيْم

حسینؓ سریرت کہ

——— مصدوق وَيُطَهِّرُكُمْ تَطْهِيْرًا کا

اور

مصدوق اِلَّا الْمَوَدَّۃَ فِی الْقُرْبیٰ کا

اوصاف ہیں

زین العابدین، امام الصادقین، السید النقی والتقی والعلوی العلی المہدی ہم نام کلیم اللہ محبوب حبیب اللہ ہے

احمد خوئے کہ عالم بندۂ اوست یوسف روئے کہ ماہ شرمندۂ اوست

عیسیٰ نفس کہ جان و دل زندۂ اوست موسیٰ کہ لقائے دوست خوانندۂ اوست

جس قدر مناقب و کلام حضرت کلیم اللہ کے حق میں وارد ہوئے۔ اس پاکباز پر صادق اور اس کے حال پر موافق ہیں معلوم ہوتا ہے۔ کہ شاہد قدرت نے اس ذات پاک کو قلب موسیٰ پر پیدا کیا ہے۔ یہ منقبت افزوں ہے کہ یہ جگر گوشۂ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے۔ اگرچہ وہ مقتدائے اولیاء عالی مرتبت رسول اور پیغمبر ہے ہے

اے دیدہ بیا لقائے منظور ببیں آں جبہ و آں جمال و آں نور ببیں

در وادی ایمن بجنّت بگذر موسیٰ و ہم درخت و ہم طور ببیں

یہ ذات ایسی حمیدہ صفات، جانشین حامد اور مقام محمود کی وارث واقع ہوتی ہے کہ اگر کوئی بڑے سے بڑا ثنا خواں ان کے محامد و محاسن کو شمار کرنا چاہیے۔ تو گنتے گنتے بے اختیار کہہ اٹھے۔ کہ یہ کام میرے امکان سے باہر ہے۔

(۴)

محدّث دہلوی حضرت موسیٰ پاکؒ کے قدموں میں

الحاصل جب یہ آفتاب دین و دولت طلوع ہوا۔ تو میں نے یقین کر دیا۔ کہ میرا طالع زوروں پر ہے۔ بمجرد اس کے کہ میری آنکھیں ان کے نور جمال سے روشن، دل منور اور جان باغ و بہار ہو گئی۔ آنکھیں چار ہوتے ہی دل بے قابو ہو گیا۔ پائے عزت کو بوسہ دے کر یوں عرض گذار ہوا ؎

مدتے بود کہ مشتاق نقایت بودم
لاجرم روئے ترا دیدم و از جا رفتم

اس کے بعد اپنے مقصد کو خدمت اقدس میں عرض کرنے کے لئے زبان کو حرکت دی۔ مگر وہ تو صفائی باطن سے میرا ظاہر باطن سب جانتے تھے اور مقصد و مقصود سب سمجھے ہوئے تھے۔ میری سچی پیاس کی تحقیق و تفتیش کی غرض سے امتحان کے طور پر فرمایا۔

"اے تشنہ کام! ہم سب ایک دریا کی نہریں ہیں۔ دنیا میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اپنے آپ کو اسی بحر بسیط کی نہر خیال کرتے ہیں۔ پہلے ان کی خدمت میں پیش ہو کر اپنی تشنہ کامی پیش کر۔ اس کے بعد جس نہر کا پانی تجھے زیادہ

شیریں معلوم ہو۔ اُسے نوش جان کرے۔"

اگر یہ نہ ہو سکے۔ یا نہ کر سکے۔ تو پھر خود بلا اعانت غیرے اسی دریا کی طرف دوڑے۔ اور توجہ کرے جس طرف بتلائے یا پہنچائے بہتر ہو گا ـــــ!"

یہ سن کر میری چیخ نکل گئی۔ اور فریاد کی کہ:۔

ہائے! میں تو سرابِ تخیل کے چٹیل میدان میں حیران اور تحیر کے کنارے پر ہراساں و سرگرداں کھڑا ہوں مجھے بحر سے کیا نسبت کہ آواز وہاں تک پہنچے۔ اور میری ایسی قسمت کہاں کہ وہ میری چیخ دپکار پر کان دھرے ہیں تو حضور کے قدموں تک پہنچا ہوں۔ جہاں چاہیں پہنچائیں۔ ورنہ میری کیا ہستی اور کیا بساط کہ معرفتِ الہٰی کا دم ماروں۔"

اس پر اقلیم معرفت کے اس تاجدار نے دردمندی اور دلسوزی کے لہجہ میں فرمایا:۔

"اے عزیز! نا اُمید نہ ہو۔ بالیقین تو اس بحر بیکراں سے متعارف ہے۔ اور خصوصیت کے ساتھ۔ بفرضِ محال اگر تجھے شناسائی حاصل نہیں بھی۔ تو کیا ہوا۔ وہ بحرِ رحمت سب پر محیط ہے ـــــ مرکب ہو یا بسیط،

ناقص ہو یا کامل۔ اس کا فضل ہر شخص کے شامل حال ہے
یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ بندہ پکارے
اور ملاءِ اعلیٰ سے لبیک یا عبدی کا جواب نہ آئے ــــــ!
ناچار حسب الارشاد آں وُلیِ سید الابرار اُٹھ کھڑا ہوا۔ دل مضطرب اور بے قرار تھا۔ کہ دیکھیے کیا ہونا ہے۔ رات کو توجہ بجا لا کر کے سویا۔ نیند کیا تھی بخت کی بیداری تھی۔ آنکھ لگتے ہی بشارت ہوئی۔ کہ:۔
"باب مقصود یہی ہے اور دُرِ مطلوب یہی"
پس عنانِ اختیار ہاتھ سے جاتی رہی۔ بلا توقف حاضر خدمت ہو کر اپنا ہاتھ حضور کے ہاتھ میں دے دیا۔ اور سر قدموں پہ رکھ دیا۔ والحمد للہ رب العلمین۔
یہ سعادت ۶ر شوال ۹۸۵ھ کی صبح کو نصیب ہوئی۔
(آزاد ترجمہ)

یاقوت کی انگوٹھی

ماخذ

روپ سنگار

آپ جو کچھ بھی ہوں۔ لیکن میں آپ کو مہاراج ہی سمجھونگی
کیونکہ مہاراج کے سوا اور کسی کو ایسی بیش بہا انگوٹھی
میسر نہیں آ سکتی۔ اور اگر مل بھی جائے۔ تو اس میں
دوسروں کو بخشش دینے کا حوصلہ کہاں؟ ایسا دل اور
ایسا کلیجہ تو راجوں مہاراجوں کا ہی ہوا کرتا ہے"

"روپ سنگار"

بندھیاچل کی وادی میں ایک خوش پوش نوجوان ہرن کے پیچھے گھوڑا اُڑائے چلا جا رہا تھا۔ ہرن چھلانگیں مارتا ہوا پہاڑ کی کسی کھوہ میں چھپ گیا سوار نے گھوڑے کو دو تین چکر دیئے اور شکار کو ہر چند ڈھونڈنے کی کوشش کی مگر وہ نہ ملا۔ سوار نے مایوس ہو کر گھوڑے کی باگ پھیری اور ابھی وہ چند قدم ہی چلا تھا کہ دائیں جانب سے شیر کے گرجنے کی آواز آئی۔ گھوڑا خوف سے پسینہ پسینہ ہو گیا۔ سوار نے تیر کمان سنبھال کر اِدھر کا رُخ کیا شیر دہاڑتا گرجتا چلا آ رہا تھا۔ سوار نے چستی سے نشانہ باندھ کر دو تین تیر چلائے شیر گرج کر لپکا لیکن تیر اسکی آنکھوں میں پیوست ہو چکے تھے۔ وہ آتے ہی چکرا کر گر پڑا۔ سوار نے اُتر کر تلوار سے اس کا خاتمہ کر دیا۔

اب دن کافی گرم ہو چکا تھا۔ تمازتِ آفتاب سے مسافر کا چہرہ تمتما اُٹھا۔ پیاس سے حلق خشک ہو رہا تھا۔ مسافر نے ریت کے تودے پر چڑھ کر اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ ایک جانب سے بہت دور آبادی کے نشان نظر آئے مسافر نے بے اختیار گھوڑے کی باگ اِدھر کو پھیری اور چند لمحوں میں وہاں جا پہنچا۔

یہ ایک سرسبز اور خوشگوار مقام تھا۔ قریب ہی ایک صاف شفاف چشمہ اُبل رہا تالاب میں مرغابیاں اور راج ہنس ڈبکیاں لگا رہے تھے کنارے پر پھلواری کے درخت تھے جن میں مور ناچتے پھرتے تھے۔ درختوں کے جھرمٹ میں شوالہ کی مختصر سی عمارت سر چھپاتے کھڑی تھی جس کے چبوترے پر ایک حسین و جمیل دوشیزہ بیٹھی خاموشی سے کشیدہ کاڑھ رہی تھی۔ مسافر صحرا کی راجکماری کو دیکھ کر اس قدر مبہوت ہوا کہ اُسے پیاس کا احساس بھی نہ رہا۔ لاریب یہ دوشیزہ نسوانیت کا بہترین مرقع تھی۔ اگرچہ اس کا لباس بالکل سادہ تھا اور ایک پرانی ساڑھی میں ملبوس تھی۔ لیکن جیسے بدلی سے چاند کی کرنیں چھن چھن کر اس کی دلفریبی میں چار چاند لگا دیتی ہیں۔ اسی طرح پھٹی پرانی ساڑھی سے اُس کا پیکرِ نور اُبل اُبل کر اُس کے حُسن خداداد کی غمازی کر رہا تھا۔

گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز کو سُن کر صحرا کی دوشیزہ نے ہرنی کی طرح سر اُٹھا کر مسافر کو دیکھا مگر اس کی باوقار شخصیت اور امیرانہ لباس سے محجوب ہو کر فوراً آنکھیں جھکا لیں۔ مسافر نے کہا "بیٹی! فکر کی کوئی بات نہیں۔ میں ایک سپاہی آدمی ہوں راستہ بھول کر ادھر آنکلا ہوں۔ پیاس سے حلق خشک ہو رہا ہے کیا تم تھوڑا سا ٹھنڈا پانی پلا سکتی ہو ——— ؟"

لڑکی نے گھڑا چٹائی پر رکھ دیا۔ کھڑی ہو کر بولی "آپ گھوڑے سے اتر کر چار پائی پر تشریف رکھیں۔ میں ابھی پانی لاتی ہوں"۔

یہ کہہ کر صحرائی دوشیزہ ہرنی کی طرح چوکڑیاں بھرتی شوالہ میں داخل ہوئی۔ مسافر نے گھوڑے کو درخت سے باندھ دیا اور چارپائی کو پیپل کے سائے میں گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ چند لمحوں کے بعد لڑکی ایک ہاتھ میں پانی سے بھرا ہوا لوٹا اور دوسرے میں تھالی سلئے شوالہ سے برآمد ہوئی۔ وہ جو کی دو روٹیاں اور تھوڑی سی ترکاری بھی ناشتہ کے لئے لے آئی تھی۔ اُس نے ادب سے مسکرا کر کہا۔

"کیا میں اپنے معزز مہمان سے یہ درخواست کر سکتی ہوں کہ پانی پینے سے پہلے دو چار لقمے اُن سوکھی روٹیوں کے تناول فرما لئے جائیں۔ مجھے نادم ہے کہ گھر میں ان کے سوا کچھ نہیں ورنہ حاضر کرتی۔

مسافر نے روٹیوں پر اس طرح سے نظر ڈالی۔ گویا کہ وہ اس کیلئے نئی چیز ہیں اور اُس نے جھرجھری سی محسوس کی ایک بار پھر اُس نے دوشیزہ کے سراپا پر نظر ڈالی اور ساتھ ہی کھانے کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ یہ شخص کوئی عالی مرتبت آدمی ہے۔ اور اس قسم کی رُوکھی سوکھی روٹیاں کھانا اس کے بس کا روگ نہیں ہے۔ مگر وہ اس لڑکی کے جذبہ اخلاص سے متاثر ہو کر ہاتھ بڑھا رہا تھا۔ چنانچہ وہ بلا تکلف کھاتا ہی رہا۔ لڑکی اُسے غور سے دیکھ رہی تھی۔ جب کھانا ختم ہو گیا تو نووارد نے پانی پیا۔ گلاس ہاتھ میں لیتے وقت لڑکی کو مسافر کی انگشتری نظر پڑی اس میں یاقوت کا نگینہ جگمگا رہا تھا۔ اس کے دیکھنے

ہی لڑکی اس قدر بے خود ہوئی کہ اسے تن بدن کا ہوش تک نہ رہا۔ اور وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مسافر کو دیکھنے لگی مگر اس کی یہ کیفیت دیر تک نہ رہی۔ کسی خیال نے بے اختیار اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی لہر پیدا کر دی مسافر کھانا کھا چکا تھا۔ لڑکی نے ادب سے کہا۔

"آپ بہت تھکے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ میں آپ کے لیے بستر لے آتی ہوں۔ ذرا آپ آرام کر لیں۔ آپ کے گھوڑے کیلئے گھاس کا انتظام بھی ہو سکتا ہے۔"

مسافر نے ہنس کر کہا۔

ایک سپاہی کے لئے اس قدر تکلیف کی کیا ضرورت ہے ہم لوگ تو ننگی زمین اور گھوڑے کی زین پر بھی آرام کر لیتے ہیں۔

لڑکی کھل کھلا کر ہنسی اور کہا معمولی سپاہی ـــــــــــ؟

وہ لوٹا اور تھال لے کر دوڑتی ہوئی خوالے میں گم ہو گئی اور بہت جلدی صاف ستھرا بستر اور کاغذوں کا ایک پلندہ ہمراہ لئے حاضر ہوئی۔

مسافر نے چغہ اور عمامہ پاس ہی پلنگڑی پر رکھ دیا۔ کمان درخت سے لٹکائی اور ترکش سرہانے رکھ کر لیٹ گیا۔

لڑکی خاموشی سے کاغذوں کے الٹنے پلٹنے میں مصروف تھی اور مسافر بڑے غور سے اس کی ایک ایک حرکت کا جائزہ لے رہا تھا۔

کچھ دیر بعد لڑکی کی پریشانی ختم ہوئی اور ایک کاغذ کا پرزہ نکال کر اس پر کچھ لکھنے لگی۔ یہ دیکھ کر مسافر کے تعجب کی انتہا نہ رہی کہ لڑکی دراصل اس کا زائچہ تیار کر رہی ہے۔ وہ کچھ پوچھنا ہی چاہتا تھا کہ لڑکی نے ادب سے کہا۔

"کیا میں آپ کا داہنا ہاتھ دیکھ سکتی ہوں؟"

مسافر نے مسکرا کر ہاتھ بڑھا دیا۔

لڑکی نے ہاتھ دیکھ کر بلنپ سے ایک اور کاغذ نکالا، اس پر عرصہ دراز کا ایک زائچہ بنا ہوا تھا۔ اس نے دونوں زائچوں کا مقابلہ کر کے خوشی سے بے تاب ہو کر مسافر کو دیکھا اور کہا۔

اگر آپ اجازت دیں تو میں اپنی بوڑھی ماں کو لے آؤں وہ آپ کے ملنے کی خواہش میں جی رہی ہے۔

اجنبی نے حیرت سے چلا کر کہا۔

"میرے ملنے کے لئے ——————!"

لیکن لڑکی جواب سنے بغیر جا چکی تھی۔

دفعتہً مسافر کو لڑکی ایک بڑھیا کا ہاتھ تھامے ادھر کو آتی دکھائی دی۔ ضعیفہ کے چہرے پر بھی مسرت اور شادمانی کے آثار ظاہر تھے معلوم ہوتا تھا کہ دنیا بھر کی فراست اور دانائی اس کے چہرے کی جھریوں میں سمٹ آئی ہے۔ بڑھیا نے قریب آ کر مسافر کو سلام کیا اور کہا کہ یہ ضعیفہ اپنے معزز مہمان کا

شکریہ ادا کرتی ہے کہ اس نے بیوہ کی جھونپڑی کو اپنے درشنوں سے فخر بخشا ع
کلاہِ گوشہ دہقاں بآفتاب رسید
بڑھیا ستانے کے لئے چٹائی پر بیٹھ گئی اور مسکراتے ہوئے بولی۔
"کیا میں اپنے معزز مہمان کا نام دریافت کر سکتی ہوں؟"
مسافر نے جواب دیا۔
"میں شہنشاہ جہانگیر کی سینا کا ایک معمولی سپاہی ہوں۔ دہلی کا رہنے والا ہوں۔ آج ساتھیوں کے ہمراہ شکار کو نکلا تھا کہ راستہ بھول کر ادھر کو آ گیا۔ میں آپ کی لڑکی کا بہت احسان مند ہوں کہ اس نے نہ صرف پیاسے مسافر کو پانی پلایا بلکہ کھانا بھی کھلا دیا۔"
لڑکی نے غلط انداز سے مسافر پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔
جناب والا! معاف فرمائیے۔ گو آپ نے اپنا صحیح حال نہیں بتایا مگر ہم نے آپ کو پہچان لیا ہے۔ میرے پتا کا اور میرا علم غلط نہیں ہو سکتا۔ جتنی علامتیں میرے سورگباشی پتا نے مجھے بتائی تھیں یا نشانیاں وہ لکھ کر چھوڑ گئے ہیں۔ وہ مجھے سب آپ میں نظر آ رہی ہیں۔ سچ بتائیے کیا آپ ہمارے مہاراج ادھیراج نہیں ہیں۔۔؟"
مسافر کے چہرے پر مسکراہٹ کھیلنے لگی اس کے باوقار چہرے سے شاہانہ تمکنت ٹپکنے لگی۔ وہ سچ مچ سلطان نورالدین جہانگیر ہی تھا۔ تاہم اس نے راز

کو پوشیدہ رکھنے کے لئے کہا۔

بیٹی! تجھے غلط فہمی ہوئی ہے۔ ہندوستان کا شہنشاہ اس خوفناک صحرا میں اکیلا کیسے آسکتا ہے؟ جب وہ راجدھانی سے نکلتا ہے تو لاکھوں سوار اور پیادے اس کے جلو میں چلتے ہیں یہ کہہ کر شہنشاہ نے اپنی توجہ بڑھیا کی طرف منعطف کی اور کہا۔

"مائی جی! کیا میں آپ سے یہ دریافت کر سکتا ہوں کہ آپ اس ویران بیابان میں اکیلی کیوں رہتی ہیں؟ اور آپ کی گذر اوقات کا ذریعہ کیا ہے؟"

بڑھیا نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

آپ کو ہماری مصیبت کی کہانی سننے سے کیا فائدہ؟ اس وقت سارے ملک میں ہمارا کوئی نہیں ہے۔ قلعہ کے قریب ہی ایک گاؤں ہے۔ وہاں کے لوگ ہماری دیکھ بھال کیا کرتے ہیں، اور ہماری زندگی کی گاڑی چلتی ہی رہتی ہے۔ لیکن ہماری حالت پہلے ایسی نہیں تھی۔ ایک زمانہ ایسا بھی گذر چکا ہے کہ اچھے کھاتے پیتے ہم پر رشک کھاتے تھے۔ روپا کے پتا بہت بڑے ودیاوان اور نجومی تھے۔ بیجا نگر کے دربار میں ان کی بڑی عزت تھی۔ ہزاروں کی یافت ہوتی تھی جس سے ہمارا بڑے ٹھاٹھ سے گذارہ ہوتا تھا۔ یکایک حالات بدل گئے۔ وزیر اعظم سے بگاڑ ہو گیا جس پر سورگباشی

ملازمت چھوڑ کر اس صحرا میں چلے آئے۔ یہ شوالہ اور پاس کی چند جھونپڑیاں ان کی ہی بنوائی ہوئی ہیں۔ انہوں نے رُوپا کو ذہین اور ہوشیار سمجھ کر اسے بڑی محنت سے علم نجوم کی تعلیم دی۔

شہنشاہ نے بات کاٹ کر پوچھا۔

"پنڈت جی کا کیا نام تھا ——— ؟"

لڑکی نے جواب دیا "میرے پتا پنڈت ویاس جی کے نام سے مشہور تھے۔"

شہنشاہ نے مسکرا کر کہا "خوب!"

بڑھیا نے پھر سلسلۂ کلام شروع کیا۔

"ایک دن رُوپا کے پتا نے اُسے بُلا کر کہا بیٹی! آؤ اس زمین کا زائچہ تیار کریں۔ چنانچہ رُوپا کاغذ لے کر آگے بیٹھ گئی اور وہ بھی دیر تک کام کرتے رہے جب رُوپا زائچہ تیار کر کے لے آئی تو پنڈت جی کے زائچہ سے رتی بھر فرق نہ تھا۔ یہ دیکھ کر وہ اتنے خوش ہوئے کہ رُوپا کو گلے سے لگا لیا۔ پھر میری طرف دیکھ کر بولے کہ رُوپا بہت سمجھدار ہے اس نے بالکل درست زائچہ تیار کیا ہے اس زائچہ سے معلوم ہوتا ہے کہ میرے مرنے کے بعد جو راجہ یہاں آئیگا۔ اُس کے ہاتھ میں یاقوت کی بڑی قیمتی انگوٹھی ہو گی۔ وہ ہمارے ہاں آ کر ٹھہرے گا اور تمہاری سرپرستی کریگا۔ یہ باتیں ہمیں پہلے سے معلوم تھیں

اور یہی وجہ ہے کہ جس وقت روپا نے آپ کی انگلی میں انگوٹھی دیکھی اور اپنے زائچہ سے آپ کا مقابلہ کیا تو وہ جان گئی کہ آپ وہی راجہ ہیں جس کا ہمیں عرصہ سے انتظار تھا۔ چنانچہ وہ دوڑ کر میرے پاس آئی اور بولی کہ ماں جی! مہاراج آگئے جس پر میں گرتی پڑتی آپ کے چرنوں میں آپہنچی۔ آپ فرماتے ہیں کہ میں ایک ادنیٰ سپاہی ہوں لیکن ہم یہ کیسے باور کریں۔ آپ کے چہرے سے ایسا رعب و جلال ٹپکتا ہے کہ آنکھیں جھک جاتی ہیں اور دل چاہتا ہے کہ سر قدموں میں رکھ دیا جائے۔"

شہنشاہ بڑھیا کی باتیں سن کر ہنس پڑا۔ تقریباً تقریباً اس کا راز فاش ہو چکا تھا مگر اپنے راز کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

"خیر! میں جو کچھ بھی ہوں اس کی جستجو نہ کرو۔ لیکن آج سے روپا میری بیٹی ہے اور تم ماں ہو۔ میں نے اندازہ کیا ہے کہ روپا کو میری انگشتری بہت پسند ہے۔ میں نے اسے اپنی بیٹی بنا لیا ہے اور اس موقع پر میں اپنی یہ انگوٹھی اس کے حوالے کرتا ہوں۔ خدا مبارک کرے۔

فرطِ مسرت سے بڑھیا کی آنکھوں سے آنسو چھلکنے لگے۔ گلوگیر ہو کر بولی ——— "آپ جو کچھ بھی ہوں لیکن میں آپ کو مہاراج ہی سمجھوں گی۔ کیونکہ مہاراج کے سوا اور کسی کو ایسی بیش بہا انگوٹھی میسر نہیں آسکتی۔ اور اگر میسر آ بھی جائے تو اس میں دوسروں کو بخش دینے کا حوصلہ کہاں؟ ایسا دل اور ایسا

کا بچہ تو راجوں مہاراجوں کا ہی ہوا کرتا ہے۔"

اس کے بعد بڑھیا نے روپ سنگار کو اشارہ کیا کہ اٹھ کر اپنے دھرم پتا کے چرنوں کو چھو لے۔ اور جو امانت تیرے سورگباشی پتا نے دی تھی وہ ان کو پیش کر۔

روپ سنگار نے انتہائی عقیدت اور گرویدگی کے ساتھ شہنشاہ کے قدموں کو چھو لیا۔ عین اسی وقت ——— جنگل سے گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ سب ادھر کو دیکھنے لگے۔ گرد چھٹنے پر سواروں کا ایک دستہ نمودار ہوا جس نے قریب آکر جہانگیر اعظم کو سلامی دی شہنشاہ سلامت اور شہنشاہ زندہ باد کے نعروں سے شوالہ کے در و دیوار گونج اٹھے۔

بڑھیا نے مسکرا کر کہا۔

"حضور! اب ہم سے چھپنے کی اور کیا ترکیب کریں گے۔ کیا اتنے بڑے افسر کسی معمولی آدمی کی سلامی اتار سکتے ہیں؟ اور اس ملک میں مغل بادشاہ کے سوا اور بھی کوئی شہنشاہ کہلا سکتا ہے؟"

جہانگیر اعظم نے ہنس کر بڑھیا کی طرف دیکھا۔ کہا۔

"مائی جی! ہم بادشاہ لوگ اپنی جان کی حفاظت کی خاطر اپنے آپ کو یوں کسی پر ظاہر نہیں کیا کرتے آپ نے ٹھیک پہچانا۔ میں ہی اس ملک کا بادشاہ جہانگیر ہوں۔ اس وقت روپا نے آگے بڑھ کر ادب سے وہ خط پیش

کیا جو اس کے باپ نے اپنی زندگی کے آخری لمحات میں لکھ کر روپا کے حوالے کیا تھا۔ یہ خط فارسی میں لکھا تھا۔

(ترجمہ) "اے بھارت کے بادشاہ! میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔ کہ ملک دکن کی مہم میں فتح آپ کو ہوگی۔ آپ اُس ملک پر بادشاہی کریں گے اور آپ کے دشمنوں کو شکست فاش ہوگی۔

میری اکلوتی روپا اور اس کی بڑھیا ماں کی سرپرستی فرمایئے۔ اللہ کریم آپ کو اس کا اجر عظیم عطا فرمائیں گے۔ افسوس ہے کہ مجھے موت نے مہلت نہ دی ورنہ یہ داس آپ کے جمال بے مثال سے شاد کام ہوتا۔"

شہنشاہ نے افسران فوج کو حکم دیا کہ روپ سنگار اور اس کی والدہ کو اسی وقت ملکہ کی خدمت میں پہنچا دو۔ حکم ملنے کی دیر تھی کہ روپا کے گھر کا سارا سامان لدا کر کیمپ شاہی کو روانہ ہو گیا۔ اور روپا اور اس کی ماں کو عزت و احترام سے ملکہ نورجہاں کی خدمت میں پہنچا دیا گیا۔

ملکہ روپ سنگار کی دلفریب شکل اور اس کی غیر معمولی ذہانت پر اس قدر فریفتہ ہوئی کہ اسے اپنے پاس رکھ لیا۔ اور اُس کو اور اس کی بڑھیا ماں کو خلعت فاخرہ سے ممتاز کیا۔

چند دنوں کے بعد وہ باس جی کی پیشینگوئی کے مطابق دکن کا ملک فتح ہو گیا۔ اس تقریب میں شہنشاہ نے بڑی دھوم دھام سے روپ سنگار کی

کی شادی ریاست کوٹہ (راجپوتانہ) کے ایک برہمن لڑکے سے کردی۔ اور ریاست مذکور کا بہت بڑا حصہ روپا کے جہیز میں دے دیا۔

کہا جاتا ہے کہ یہ جاگیر اُس زمانے میں پندرہ لاکھ کی تھی۔ اور جب شاہجہان بادشاہ تخت پر بیٹھے تو انہوں نے اس جاگیر میں پانچ لاکھ سالانہ کا اور اضافہ کیا۔ اور جزیہ بھی معاف کر دیا۔ مشہور ہے کہ جہانگیر اعظم کی عطا کی ہوئی انگوٹھی اس وقت تک ریاست کوٹہ کے خزانہ میں محفوظ چلی آتی ہے جب مہاراجہ تخت پر بیٹھتا ہے تو بطور شگون یہ انگوٹھی اسے پہنائی جاتی ہے۔

مسجد نواب وزیر خاں

ماخذ

تحقیقات چشتی

"یہ مسجد پاکستان کی محض ایک حسین و جمیل عبادت گاہ ہی نہیں
بلکہ عبد اور معبود کے راز و نیاز کی زندہ تصویر ہے ۔ اسکے
بلند مینار اور فلک بوس قبے زبان حال سے ہر زائر کو
مالک الملک کی جہاں بخشی کا پتہ دیتے ہیں ۔ کہ کس طرح اس
نے چنیوٹ کے ایک ذرۂ بے مقدار کو عروج و اقبال
کی انتہائی بلندیوں پر پہنچایا ——————— ہاں پھر
ثبوت ہے اللہ کے اس مخلص بندے کے خدا کی راہ
میں خرچ کرنے کا کہ کس طرح اس نے خدا کی بخشی ہوئی دولت
کو اس کے نام پر لٹا دیا ——————— !"

علم الدین انصاری چنیوٹ کا غریب الحال حکیم تھا۔ اگرچہ تشخیص امراض اور جڑی بوٹیوں کی ماہیت میں وہ اپنی نظیر نہیں رکھتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود لوگ اس سے بہت کم رجوع کرتے تھے ان کا خیال تھا کہ علم الدین کا ہاتھ شفا سے خالی ہے۔ اس لئے اس کی گزر اوقات بڑی عسرت سے ہوتی تھی۔ اس کی بیوی بھی صبر و شکر کی عادی تھی۔ کئی کئی دن فقر و فاقہ سے گزر جاتے۔ لیکن اس کی غیور طبیعت اس امر کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ کہ وہ اپنی والدہ پر اپنی تنگدستی کا حال ظاہر کر کے کھانے کو کچھ منگوا بھیجے۔ وہ سمجھتی تھی کہ یہ میرے خاوند کا راز ہے۔ اور اس کا کسی پر افشا کرنا اس کی امانت میں خیانت کرنا ہے۔

۱۰۳۲ھ میں خداوند کریم نے اس صابر گھرانے میں ایک اور مخلوق کا اضافہ کیا۔ یعنی علم الدین کی پاک دامن بیوی سے ایک خوبصورت بچہ تولد ہوا۔ جس سے دونوں میاں بیوی کے خزاں دیدہ چمن میں بہار آ گئی علم الدین نے اپنے لخت جگر کا نام محمد سعید خاں رکھا۔ اب وہ زیادہ تندہی سے کام

کرتے اور گیارہ گیارہ بجے رات تک دوکان پر موجود رہتے لگا رتا کہ زیادہ نہ سہی تو محمد سعید کے دودھ کے لئے چار پیسے تو کما لاتے۔

ان دنوں کابل سے ایک قافلہ آیا۔ دریا کے پاس پہاڑی کے قریب اس کا پڑاؤ ہوا۔ رات کو سالار قافلہ ملک مظفر کو قولنج کا درد پڑا۔ نوکر چاکر دوڑے دوڑے شہر میں پہنچے۔ لیکن اتنی رات گئے حکیم کہاں ملتے۔ بازار میں ہو کا عالم طاری تھا۔ تاریکی اتنی غضب کی تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ سجائی نہیں دیتا تھا۔ پہرے دار نے ٹوکا۔ تو انہوں نے ساری داستان کہہ سنائی۔ وہ شریف آدمی علم الدین کو جانتا پہچانتا تھا۔ وہ ساتھ ہو پڑا۔ اور اس کے دروازے پر آکر دستک دی۔

علم دین بتی ہاتھ میں لے کر باہر نکلا۔ دیکھا کہ دروازے پر اچھی خاصی بھیڑ لگی ہے۔ پوچھا "کیا بات ہے؟"

سپاہی نے اصل معاملہ کہہ سنایا اور کہا کہ اگرچہ بے وقت کی تکلیف ہے۔ لیکن امید ہے کہ یہ لوگ آپ کی قدر کریں گے۔ ضرور تشریف لے چلیے۔

علم الدین نے جلدی سے کپڑے بدل لیے۔ احتیاط کے طور پر تلوار ہاتھ میں لی۔ اور خدا کے بھروسے پر ان کے ہمراہ ہو لیا۔ ملک مظفر درد سے کراہ رہا تھا۔ علم الدین نے جاتے ہی عرق سونف کے ہمراہ اپنا تیار کردہ سفوف دیا۔ جس سے بیمار کو بہت جلد افاقہ ہو گیا۔ آتی دفعہ دو پڑیاں اور دیتا آیا۔

کہ دو دو گھنٹے کے وقفے سے عرق سولف کے ہمراہ پلائی جائیں۔

صبح کو علم الدین پھر پہنچا۔ اب ملک منظفر کو بالکل آرام تھا۔ اس لئے علم الدین کی بڑی قدر کی۔ اور دس دینار انعام میں عطا کئے اور کہا حکیم صاحب آپ چنیوٹ میں پڑے کیوں زندگی خراب کر رہے ہیں۔ ہمارے ساتھ ہندوستان چلئے شہنشاہ اور اس کی ملکہ بڑے قدردان ہیں اور قابل آدمیوں کی ان کے ہاں بڑی قدر ہوتی ہے۔

چنیوٹ کے اس تنگدست نوجوان کے دل میں بھی قسمت آزمائی کا ولولہ پیدا ہوا۔ لیکن دہلی اور آگرہ جیسے شہر میں دکان نکالنا اور چار سو میل کا سفر کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ کہا "اے ملک التجار! میں آپ کے ہمراہ کیسے چل سکتا ہوں جبکہ زاد راہ کیلئے میرے پاس پھوٹی کوڑی تک نہیں۔!"

ملک منظفر نے کہا۔ آپ مطمئن رہیے۔ آپ کا کل خرچ میں برداشت کرونگا

علم الدین کے چہرے پر خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اور کہا۔

"کیا آپ میرا انگڑ کھنگڑ[1] بھی ہمراہ لے چلیں گے؟"

"بالکل! دکان کے سارے سامان کا ذمہ دار ہوں۔ دہلی میں مجھ سے سنبھال لیجئے گا۔"

علم الدین خوش خوش گھر آیا۔ بیوی سے ذکر کیا۔ اسے کیا عذر ہو سکتا تھا

---

[1] دکان کا سامان برتنیں وغیرہ

وفا کی دیوی نے گھر کا سامان باندھنا شروع کر دیا۔ علم الدین نے دکان کی بوتلیں، مفردات اور علم طب کی تمام کتابوں کو احتیاط سے باندھ کر گھر کے سامان کے ساتھ اونٹوں پر بار کر دیا۔

لاہور پہنچ کر معلوم ہوا کہ بادشاہ آگرے میں ہے۔ اس لئے دہلی اور متھرا سے ہوتے ہوتے یہ قافلہ ۱۴ صفر ۱۰۳۴ھ کو آگرہ میں وارد ہوا چونکہ علم الدین راستے میں اہل قافلہ کا علاج معالجہ کرتا آیا تھا۔ اس لئے اب اس کے پاس چند روپے بھی جمع ہو گئے تھے۔ نیز ملک مظفر نے بھی کافی امداد کی۔ چنانچہ قلعہ معلّٰی اکبر آباد کے پاس ہی علم الدین نے ایک چھوٹی سی دکان کرائے پر لے لی اور خدا کے بھروسے پر اپنا کام شروع کر دیا۔

دربارِ شاہی تک رسائی

ان دنوں ملکہ عالیہ نورجہاں بیگم کو عرق النسا کی شکایت ہو گئی شاہی حکماء نے ہزار جتن کئے۔ مگر آرام نہ آیا۔ ملک مظفر نے شہنشاہ سے علم الدین کا ذکر کیا۔ جہانگیر اعظم نے اسی وقت سواری بھیجکر دربار میں طلب کیا۔ اور فرمایا۔

"حکیم صاحب! اگر ملکہ کو آپ کے علاج سے آرام آگیا۔ تو منہ مانگا انعام دونگا۔

اس کے بعد شہنشاہ نے بیماری کی حقیقت بیان کی علم الدین چپ چاپ

شہنشاہ کی تقریر سنتا رہا۔ اسے علم تھا کہ ملکہ جراحی کے بغیر شفایاب نہیں ہو سکتی اس نے کافی دیر سوچ بچار کرنے کے بعد سر اٹھا کر شہنشاہ کو دیکھا۔ فرطِ مسرت سے اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور اس کے بشرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس نے طریقِ علاج کے بارے میں کوئی تسلی بخش فیصلہ کر لیا ہے۔

جہاں پناہ! ملکہ کو انشاء اللہ ایک ہفتہ کے اندر آرام ہو جائے گا۔ کسی خادمہ کو حکم ہو کہ وہ دالان میں بالو ریت بچھا دے۔ بندہ نماز پڑھ کر ابھی حاضر ہوتا ہے۔

خواجہ سرا دوڑے دوڑے اندر گئے۔ اور اسی وقت جمنا سے صاف ستھری ریت منگا کر ایک دالان میں بکھیر دی گئی۔

حکیم صاحب نے مسجد میں جا کر انتہائی خشوع خضوع سے نماز ادا کی اور کہا۔ "اے بار الہا! تیرا یہ بندۂ ضعیف تیری بارگاہ میں وعدہ کرتا ہے۔ کہ اگر اس کی چارہ گری سے ملکہ کو شفا ہو گئی تو جو کچھ ملے گا۔ اسے مسجد بنانے میں صرف کرے گا۔"

نماز سے فارغ ہو کر درود و اذکار پڑھتا حکیم علم الدین دیوان خاص میں داخل ہوا۔ جہاں پناہ نے فرمایا۔ حکیم صاحب! ریت بچھائی جا چکی ہے۔

علم الدین نے عرض کی قبلہ عالم! اب ملکہ عالیہ کو اتنی تکلیف دی جائے

کہ وہ ریت پر سے چند قدم چل کر پھر پردہ میں تشریف لے جائیں۔

اشارہ پا کر خادمہ اندر گئی۔ اور تھوڑی دیر بعد آکر اطلاع دی۔ کہ ملکہ عالیہ ریت پر سے چل کر پھر واپس تشریف لے جا چکیں۔

یہ سن کر علم الدین دالان میں داخل ہوا۔ وہ دراصل ملکہ کے پاؤں کی خاص رگ کا فصد لینا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے کسی نقش پا میں مطلوبہ رگ کی جگہ نشتر چھپا کر رکھ دیا اور خود باہر آکر ایک خادمہ سے کہا کہ ملکہ عالیہ سے عرض کرو کہ وہ اپنے پیروں کے نشانات پر پاؤں رکھتی ہوئی پھر اندر تشریف لے جائیں۔ ساتھ ہی خادمہ کو ایک پنبہ دوا سے تر کرکے دیا کہ جونہی ملکہ عالیہ کے پاؤں کو نشتر چبھے فوراً یہ دوا وہاں لگا دو۔

جہاں پناہ امر واقعہ سے واقف تھے اور دروازے کی دہلیز پر کھڑے ملکہ کو دیکھ رہے تھے۔

نورجہاں بیگم نے اپنے نقوش پا پر چلنا شروع کیا۔ جونہی نشتر پر قدم پڑا۔ فوراً خونِ فاسد کے چند قطرے ٹپک پڑے اور ملکہ کے منہ سے بے اختیار لے ولئے نکل گئی۔ حضور کی زبان پر آتا ہے

خون فاسد بہ نشتر فصاد

دمبدم از عروق تا کم باد

مرض میں آرام ہوگیا۔ اور ہفتہ بھر کے علاج سے اس بیماری کا نشان تک نہ رہا

ملکہ کے غسل صحت پر بادشاہ نے علم الدین کو امارت شفاخانہ کے مبارک عہدے پر فائز کیا۔ اور ملکہ عالیہ نے اپنے تمام زیورات انعام میں دے ڈالے۔ محل کی دوسری بیگمات نے بھی بیش از بیش انعام عطا کیا۔ اور وہ علم الدین جو کل تک نان شبینہ کا محتاج ہو رہا تھا۔ آج دفعتہً اتنا بڑا امیر بن گیا۔

نواب وزیر خاں

علم الدین نے شفاخانے کا چارج لیتے ہی اس کی کایا پلٹ دی۔ خرچ تو پہلے سے کم ہوا۔ لیکن گوناگوں ادویہ سے شفاخانہ عجائب گھر نظر آنے لگا۔ محلسرائے سلطانی میں جب بھی کہیں دوا کی ضرورت پڑتی بلا پس وپیش پہنچ جاتی۔ اور دو تین خوراکوں ہی سے مریضہ کو آرام ہو جاتا۔ اس انتظام سے ملکہ بہت خوش ہوئی اور اس نے سفارش کر کے شہنشاہ سے ہفت ہزاری منصب اور وزیر خاں کا خطاب دلوایا۔ چنانچہ حکیم صاحب بہت جلد نواب وزیر خاں کے لقب سے مشہور ہو گئے۔ نواب صاحب بہت عبادت گزار شخص تھے[1] ان کا دن روزہ میں اور رات قیام میں بسر ہوتی تھی۔ اور ساری عمر میں عصر کی نماز کبھی بلا سنت ادا نہیں کی تھی۔

جونہی اتنے بڑے منصب پر فائز ہوئے۔ انہیں اپنی منت کا خیال آیا شہنشاہ سے عرض کی کہ وہ لاہور میں مسجد بنوانے کا ارادہ رکھتا ہے اگر جہاں پناہ

---

[1] نواب وزیر خاں بدرجہ غایت متقی دایم الصوم و قائم اللیل بود۔

مسجد کی تکمیل تک رخصت عنایت فرما سکیں۔ تو بعید از نوازش نہ ہوگا۔

بادشاہ نے فرمایا۔ ما بدولت واقبال نے حال ہی میں پندرہ لاکھ کے مصارف سے لاہور میں عیدگاہ[1] تعمیر کرائی ہے۔ جامع مسجد کا ارادہ بھی تھا اگر ہماری خواہش تمہارے ہاتھوں سے پوری ہو سکتی ہے۔ تو بجائے رخصت کی جگہ ہم تمہیں پنجاب کی صوبیداری مرحمت فرماتے ہیں۔ تاکہ تم زیادہ اطمینان سے خانہ خدا کی تعمیر کر سکو۔

مسجد وزیر خاں

نواب وزیر خاں کو جو زیورات ملکہ عالیہ اور دیگر شہزادوں سے حاصل ہوئے تھے۔ اس نے ان سب کو بیچ ڈالا۔ اور بائیس لاکھ روپے کی گراں قدر رقم سے مسجد مبارکہ کا کام شروع کیا۔ حضرت میراں[2] بادشاہ کے مزار کا مقام اس غرض کے لئے بے حد پسند آیا۔ اس کے گردونواح میں جو مکانات تھے ان

---

[1] یہ عیدگاہ انگریزوں کے ابتدائی دور میں اسٹیشن کے لئے گرادی گئی۔

[2] مسجد کے صحن میں حضرت میراں بادشاہ کا مزار ہے آپ شہر گازروں (فارس) کے باشندے تھے اور حضرت عبدالمغیث گازرونی کے مرید تھے۔ خرقہ درویشی حاصل کرنے کے بعد لاہور تشریف لائے اور محلہ روڑہ میں سکونت فرمائی ۷۸۶ھ میں فوت ہوئے تاریخ وفات بسم اللہ الرحمن الرحیم نکلتی ہے وصیت کے بموجب کچی قبر بنائی گئی۔ خود بخود ایک سبز پودا اُگا۔ جس نے قبر کو چھپا لیا۔ اور آپ کا نام پیر سبز مشہور ہو گیا۔ نواب وزیر خاں نے جب اس جگہ کو مسجد کیلئے منتخب کیا۔ تو یہ مزار احاطہ کے اندر آ گئی ۷×۵ گز کے احاطہ میں آپ کا مرقد پاک ہے۔ اصل قبر نیچے تہ خانے میں ہے۔

کے مالکوں کو دوگنی سہ گنی رقم دے کر راضی کیا۔ بعض کو شہر کے دوسرے مقامات پر اچھے اچھے مکانات معاوضہ میں دلائے۔ معمار مزدور ایسے چھانٹے گئے جو صوم و صلوٰۃ کے پوری طرح سے پابند تھے۔ کام پر آنے سے پہلے وضو کر لینا ضروری تھا۔

نواب صاحب نے اپنی رہائش کے لئے شاہ عالمی کے اندر ۱۰۳۱ھ میں ایک عالیشان محل تیار کرایا تھا جس کا نام پری محل اور اس کا پائیں باغ حدیقۃ الارم کے نام سے مشہور تھا۔

نواب نے مسجد کی تعمیر کا کام شروع ہی کیا تھا کہ ۱۰۳۶ھ میں ملکہ نور جہاں کا سرتاج اور ہندوستان کا عادل پرور شہنشاہ نورالدین جہانگیر دار فانی سے عالم بقا کو رخصت ہو گیا۔ ملکہ نور جہاں اپنے ناز بردار شوہر کی لاش لے کر لاہور آئی۔ اور اپنے باغ میں سپرد خاک کر کے اس پر مجاور بن بیٹھی۔ حکومت کی طرف سے جو وظیفہ ملتا۔ اس کا بیشتر حصہ محبوب دلنواز کے مقبرہ کی تعمیر پر لگا دیتی۔

ہندوستان کے طول و عرض میں شہنشاہ شاہجہان کا طوطی بول رہا تھا۔ چونکہ شہزادگی کے زمانے میں نواب وزیر خاں اس کا معالج رہ چکا تھا اس لئے وہ اس کی دل سے قدر کرتا تھا اس نے اسے پنجاب کی صوبیداری پر بحال رکھا۔ اور نواب وزیر خاں نہایت اطمینان سے مسجد کی تعمیر کا کام کراتا رہا۔ اس مسجد کا سنگ بنیاد نواب صاحب نے حضرت میاں میر رحمۃ اللہ علیہ سے

رکھوایا تھا۔ ۱۰۵۱ھ میں یہ مسجد بن کر تیار ہو گئی۔ علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی سے استدعا کی گئی کہ اس مسجد کا افتتاح کریں۔ شاہجہان بادشاہ اور شہزادے اس تقریب میں شامل ہوئے۔

جب نواب صاحب مسجد کی تعمیر سے فارغ ہوئے تو انہیں مسجد کے مصارف کا خیال آیا۔ انہوں نے دہلی دروازہ کے عقبی چوک کی تمام دکانیں خرید کر مسجد کے لئے وقف کر دیں۔ دہلی دروازہ کے اندر ایک خوبصورت سرائے اور حمام محض علماء مشائخ اور طالبانِ علم و ادب کے واسطے تعمیر ہوئے۔ جو طلبا مسجد میں تعلیم پاتے یا بیرونجات سے جو علماء و مشائخ تشریف لاتے۔ وہ اسی سرائے میں قیام کرتے تھے۔

نواب صاحب کا تاریخی وصیت نامہ ــــــ ــــــ

نواب صاحب نے مسجد کے افتتاح کے موقعہ پر اس کے مصارف اور انتظام کے لئے ناقابلِ ترمیم لائحہ عمل وصیت نامے کی صورت میں قلمبند فرمایا۔ جسے خود نواب صاحب نے اکابر سلطین کی موجودگی میں پڑھا اور قاضی القضات سے اس پر مہر تصدیق بھی ثبت کرائی۔ وصیت نامہ کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف سے نواب صاحب کا اخلاص اور انکسار ٹپکتا ہے۔ اور اس زمانے کے دینی شغف کا پتہ چلتا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ ناظرین کرام اس کا بغور مطالعہ فرمائیں۔

وصیت نامہ کی اصل عبارت

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ وَفَّقَ عِبَادَتَ الْاَعْزَازِ الْبَاقِیَاتِ الصَّالِحَاتِ
وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ مُحَمَّدِ نِ الَّذِیْ رَغَبَتِ الْبَرَایَاتِ فِیْ
اِنْفَاقِ الطَّیِّبَاتِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ مَعَادِنِ الْخَیْرَاتِ وَمَنَافِعِ الْحَسَنَاتِ
مَادَامَ الْاَرْضُ وَالسَّمٰوٰاتُ۔

اما بعد این ذکریست دربیان آنکہ وقف کرد و تصدیق نمود نیازمند درگاہ
صمدی مسمی حکیم علم الدین المخاطب بہ وزیر خاں بن شیخ عبداللطیف بن شیخ
حسام الدین انصاری از خالص املاک و اطیب اموال خود فی حال الصحت
و کمال العقل و نفاذ جمیع تصرفاتہ طایعاً ھمگی مسجد جامع بجمیع و مرافق شرعیہ آں
و برائے دوام این بقعہ شریف وقف کرد بر مصالح مسجد مذکور خود تمام دکاکین دو
رستہ متصل بالاخانجات و کذہ ہائے و سرائے کلاں و حمام و دو چاہ چرخ و چند
قطعہ زمین متفرقہ کہ ہر یک ازیں امکنہ مذکورہ معلومتہ الحدود ظاہر علامت است
واقع اندرون دار السلطنت لاہور وقفاً صحیحاً و لازماً لا یباع و لا یوھب و لا یرھن
و لا یبھر و لا یورث و لا یملک بوجہ من الوجوہ و سبب من الاسباب
الی ان یرث اللہ الارض و ھو خیر الوارثین و جعل آخر الوقف علی الفقراء
المسلمین و شرط کرد این وقف مذکور کہ داروغگی و تصرف در اوقاف و عزل و
نصب خادم مسجد و غیرہ و تقسیم و تعیین مصارف و ازدیاد آں و اعطا و حرمان ازاں

نشست دبرخاست اہل کرایہ دکاکین بابست خود واقف مذکور با لاستقلال تا دام حیاتہ باشد وبعد از و با بست ولد جلبی محمد سعید خاں وبعد او بمرزا محمد انور وبعد او باز رشد ذکور اولاد او واولاد اولاد او بطناً بعد بطن ونسلاً بعد نسل الحالماتزال ونناسل واگر احدے از اولاد او نباشد یکے ذکور اقارب او کذالک وشرط کرد نیز امام خطیب مسجد مذکور یک کس باشد اقرار و اعلم احکام الصلوٰۃ و موذن عالم اوقات و نیز شرط کرد کہ بست قطعہ دکاکین بیرون دروازہ شرقی بالاخانہا آنہا محض برائے نشستن صحافان کتب اسلامیہ بے کرایہ باشد۔ علی سبیل الدوام۔ و نیز شرط کرد کہ در مسجد مذکور برائے تعلیم علوم دینیہ دو مدرس باشد سبیل اہل خدمات از محصول عملہ اوقاف مذکور آنکہ امام و خطیب را روپیہ از یک روپیہ تا دہ روپیہ و موذن را چہار آنہ یومیہ۔ ہر یک مدرس را یک روپیہ وہر کہ از اولاد واقف متصرف وقف مذکور باشد در ہر ماہ ششم حصہ از محصول کرایہ اوقاف گیرد۔ وہر کسیکہ از اقربا باشد نہم حصہ گیرد کہ جمالک ضروریہ دیگر کالشرف الوقاد والفراش لیصرف علی المستحقین فی المسجد ومنہ التعین یصرف علی الخدمت کما الحاکم فی المذاہب الحنفی کل ذالک فاشرط الواقف فمن بدلہ بعد ما سمعہ فانما اثمہ علی الذین یبدلونہ فقط حکم بلزوم الوقف المذکور شرط القاضی النافذ الاحکام الذی تزین ہذا الوثیقۃ بجمعۃ المبارک تحریراً فی غرہ رمضان المبارک الواقع فی سنہ ۱۰۵۱ھ ہجریہ مقدسہ۔

اب نواب صاحب کے وصیت نامہ کا اردو ترجمہ ملاحظہ فرمایئے۔

حمد و نعت کے بعد علم الدین المخاطب بہ وزیر خاں بن شیخ عبداللطیف انصاری بقائمی ہوش و حواس اقرار کرتا ہے اور لکھ دیتا ہے کہ یہ مسجد مبارکہ اپنی پاک کمائی سے تیار کی گئی ہے۔ اور اس کے اخراجات کے لئے دو رستہ دکانیں معہ بالاخانجات، محلے سرائے کلاں، حمام، دو چاہ چرخ چند قطعہ اراضی جو مسجد کے قریب نمایاں طور پر حدود رکھتے ہیں یہ سب اس مسجد عالیہ سے متعلق اور وقف ہیں اور یہ کہ اس وقف کی دارو گیری ملازمین مسجد کے عزل و نصب اور دکانوں کے کرایہ کا انتظام وغیرہ تا زندگی خود واقف کے ہاتھوں میں رہے گا۔ اس کے بعد اس کے فرزند ارجمند محمد سعید خاں اور اس کے بعد مرزا محمد الوزر و بعد اس کے اس کی نرینہ اولاد وقف مذکور کی متولی رہے گی۔ اگر اس کی اولاد نرینہ نہ رہے تو پھر اس کے کسی قریبی رشتہ دار کو یہ انتظام تفویض کیا جائے گا۔

اور شرط کی کہ امام و خطیب اس مسجد کا ایک شخص ہو جو قرآن مجید کا قاری اور نماز کے احکام کا عالم ہو۔ موذن کے لئے عالم اوقات ہونا لازمی ہے نیز یہ مقرر کیا کہ مشرقی دروازہ سے باہر کی بیس ۲۰ دکانیں اور بالاخانے محض ایسے کتب فروشوں کے لئے خاص رہیں جو اسلامی کتب کی خرید و فروخت کریں۔ ان سے کرایہ یا کسی قسم کا معاوضہ بالکل وصول نہ کیا جائے اور

نیز طے پایا کہ مسجد میں دینیات کی تعلیم دینے کے لئے دو مدرس مقرر کئے جائیں جنہیں ایک روپیہ روزانہ تنخواہ ملے۔ امام و خطیب کو ایک روپیہ سے دس روپیہ تک اور موذن کو چار آنے روزانہ تنخواہ دی جاتے اور واقف کی اولاد سے جو وقف کی دار وغگی پر مقرر ہوا سے ہر مہینہ وقف کی آمدنی کا ⅙ حصہ دیا جائے اور جو واقف کے اقربا ہوں انہیں آمدنی کا ⅑ حصہ ملے۔ ملازمین کی تنخواہ سے جو بچ جاتے وہ مسجد کی مرمت پر خرچ ہو۔ ملازمین کا تقرر تنزل اور مسجد کا تمام انتظام مذہب حنفی کے مطابق کیا جائے۔ اس کے بعد اگر کسی نے وصیت نامہ میں کسی قسم کی تحریف کی تو اس کا گناہ تحریف کرنے والے پر ہوگا۔

یہ وصیت نامہ رمضان المبارک ۱۲۰۵ھ میں لکھا گیا اور اس پر قاضی شہر کی مہر ثبت کی گئی۔

مسجد وزیر خاں خالصہ دور میں ——————

چونکہ نواب صاحب کے تعلقات سکھوں کے گوروارجن دیو سے نہایت گہرے تھے۔ اس لئے سکھا شاہی دور میں مسجد اور اوقاف کو کوئی نقصان نہ پہنچا۔ مولوی نور احمد صاحب چشتی کے زمانہ میں نواب صاحب کے خاندان سے مرزا ایزد بخش زندہ تھے اور اپنا حصہ دکانوں سے وصول کر کے گزارہ کرتے تھے مسجد کے باہر علماء و طلبا کے لئے جو سرائے تھی

وہ اب نا پید ہے۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ کس زمانہ میں حوادث دہر کا شکار ہوئی۔ حمام کی عمارت دہلی دروازہ کے اندر موجود ہے اور اس پر میونسپلٹی کا قبضہ ہے۔ دہلی دروازہ سے مسجد کے عقبی چوک تک تمام دکانیں مسجد سے متعلق تھیں۔ مولوی نور احمد کے زمانہ میں حسب ذیل دکانیں اوقاف مسجد میں شامل تھیں:۔

میانہ دروازہ اور اس کے شمال رویہ	۹ دکانیں
〃 〃 جنوب رویہ	۷ 〃
چوک کے مشرقی جانب	۷ 〃
〃 〃 غربی 〃	۷ 〃
جنوبی طرف	۱۸ 〃

کل ۴۸ دکانیں تھی تھیں۔ حال کا علم خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ اس وقت مسجد کے خطیب پاکستان کے ممتاز عالم حضرت ابوالحسنات مولانا سید محمد احمد صاحب ہیں۔ جن کے دم قدم سے مسجد کی شان قائم ہے۔

یہ مسجد محض پاکستان کی ایک حسین و جمیل عبادت گاہ ہی نہیں بلکہ عبد اور معبود کے راز و نیاز کی زندہ تصویر ہے اس کے بلند مینار اور فلک بوس قبتے زبانِ حال سے ہر زائر کو مالک الملک کی جہاں بخشی کا پتہ دیتے ہیں کہ کس طرح اس نے چنیوٹ کے ایک ذرہ بے مقدار کو عروج و اقبال کی

انتہائی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ اور جو کل تک علم الدین انصاری کے نام سے معمولی سا حکیم شمار ہوتا تھا۔ خداوند عالم کے فضل وکرم سے یوں دفعتہً جہانگیر اعظم کا ہفت ہزاری امیر اور نواب وزیر خاں کے نام سے صوبہ پنجاب کا گورنر بن بیٹھا۔ ہاں پھر ثبوت ہے اللہ کے اس مخلص بندے کے خدا کی راہ میں خرچ کرنے کا کس طرح اس نے خدا کی بخشی ہوئی دولت کو اس کے نام پر لٹا دیا۔ اس زمانے میں جبکہ چار آنے میں ایک من گندم بکتی تھی اور ایک آنے کا سیر مکھن ملتا تھا۔ اس سے بائیس لاکھ روپیہ کی گراں قدر رقم کا اندازہ لگائیے اور اس نیک بندے کے اخلاص کی داد دیجیے۔

تاریخ اپنے واقعات دہراتی ہے

مآخذ

۱۔ عمر خیام

۲۔ تاریخ ہند

رباعی

ناکردہ گناہ در جہاں کیست بگو!
و آنکس کہ گناہ نہ کرد چوں زیست بگو!
من بد کنم ۔ و تو بد مکافات دہی
پس فرق میانِ من و تو چیست بگو!

"خیام"

(۱)

ایران کی سرزمین میں تین غریب الحال طلبا کسی سبزہ زار پہ بیٹھے آموختہ یاد کر رہے تھے۔ ایک طالب علم جو وضع قطع سے نیشاپوری معلوم ہوتا تھا کتاب الٹ کر ساتھیوں سے بولا، دوستو! ہمارے محترم اُستاد کے متعلق مشہور ہے کہ جو ان سے سبق پڑھ لے۔ وہ ضرور صاحب اقبال بن جاتا ہے۔ کیا تم لوگوں نے بھی یہ روایت سنی ہے؟! دونوں ساتھیوں نے متفقہ طور پہ اس کے بیان کی تائید کی۔ پہلا طالب علم پھر بولا۔

اگر یہ بات صحیح ہے۔ تو ہماری خوش نصیبی ہیں۔ کسے کلام ہوسکتا ہے اگر تینوں نہ سہی۔ ایک نہ ایک تو ضرور ہی ترقی کریگا۔ اس لئے مناسب ہے کہ ہم تینوں آپس میں معاہدہ کریں۔ کہ اگر زمانہ ہم میں سے کسی ایک کی موافقت کرے۔ تو وہ باقی دو کی پرورش کا ذمہ دار بنے۔

"تم درست کہتے ہو عمر!" اس کے دونوں ساتھیوں نے بیک زبان جواب دیا۔

تو آؤ ہاتھ سے ہاتھ ملاؤ۔

تینوں طالب علموں نے ہاتھ سے ہاتھ ملا کر عہد کیا کہ ہم میں سے جو بھی مراتب علیہا پر فائز ہو گا۔ وہ باقی دو رفیقوں کا خیال رکھے گا۔ یہ طالب علم عمر خیام۔ حسن بن صباح اور نظام الملک طوسی تھے۔

چند سال کے بعد بغداد میں ابو حنیفہؒ کے مقبرہ پر عمر خیام اور حسن بن صباح آپس میں ملے۔ پہلے تو انہوں نے اپنی غربت کا ماتم کیا۔ پھر دونوں نے ایک دوسرے کو یہ مسرت افزا خبر سنائی۔ کہ ان کا دوست نظام الملک شاہ ارسلان کا وزیر اعظم بن چکا ہے۔ عمر نے کہا چلو دیکھیں نظام اپنے عہد کا کتنا پاس کرتا ہے!

—(۲)—

مرو کے عظیم الشان شہر میں دستور اعظم نظام الملک طوسی کی سواری جا رہی تھی۔ کہ دفعتہً دو درویشوں نے نمودار ہو کر سلام کیا۔ سواری گذر کر چلی گئی لیکن سپاہیوں نے بڑھ کر انہیں گرفتار کر لیا۔ یہ عمر خیام اور حسن تھے۔ جو بغداد سے سینکڑوں مصیبتیں جھیل کر یہاں پہنچے تھے۔ حسن نے کہا یار بڑے پھنسے کون کسی کی خبر لیتا ہے۔ اب زندگی کی خیر مناؤ۔

عمر۔ کیوں ہم نے نظام کا کیا بگاڑا ہے کہ وہ ہمارے ساتھ دشمنی کریگا۔

حسن۔ ارے بیوقوف! ہم اس کے بچپن کے ساتھی ہیں۔ اس کی غربت کے شاہد۔ اب وہ اتنی بڑی سلطنت کا وزیر اعظم ہے۔ وہ یہ پسند نہیں کریگا

کہ ہم اسکی ابتدائی زندگی کی بابت اس کی رعایا کے سامنے کچھ روشنی ڈالیں وہ ہمیں ختم کرادینا ہی اپنے لئے بہتر سمجھے گا۔

عمر خیام۔ چھوڑو بھی تمہیں ہمیشہ دُور کی سُوجھتی ہے۔

لیکن ——— خلافِ توقع سپاہیوں نے ان کی بڑی عزت کی وزیر اعظم کے عالیشان محل میں لے گئے۔ خدّام نے حمام میں جاکر غسل کرایا اور پہننے کے لئے نہایت ہی بیش قیمت لباس پیش کئے۔

عمر بولا ——— حسن! دیکھو۔ میں نہ کہتا تھا۔ کہ تم ناحق بدگمانی کر رہے ہو۔

حسن۔ (متانت سے) بکری کو جب ذبح کرنے کے لئے مذبح میں لے جاتے ہیں۔ تو اسے سبز چارہ کھلنے کو دیا جاتا ہے۔ پانی بھی پلایا جاتا ہے بس ابو مسلم خراسانی اور برامکہ کی تباہی کے سنسنی خیز واقعات تاریخ میں پڑھ چکا ہوں۔ یہ چیزیں میرے خدشہ کو دور نہیں کر سکتیں۔

یہ نہا دھو کر فارغ ہی ہوئے تھے کہ وزیر اعظم کی فٹن محل میں داخل ہوئی۔ نوکر چاکر آپس میں کہنے لگے کہ آج خلاف معمول وزیر صاحب پہلے کیوں چلے آتے۔

حسن۔ زیر لب آہستہ آہستہ ہمیں ٹھکانے لگانے کے لئے۔

عمر نے حسن کو کھینچ کر کہا۔ وزیر اعظم آرہا ہے۔ مراسم آداب ملحوظ رکھو۔

نظام الملک نے دور سے خندہ پیشانی کے ساتھ السلام علیکم کہا۔ اور پھر قریب آکر دونوں کو بڑے تپاک سے بغل میں لے لے کر دبایا۔

یارانِ قدیم! خوب آئے۔ میں پانچ سال سے لگاتار تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ ایک ایک سے پوچھا۔ کونہ کونہ چھان مارا۔ تم نہ ملے میرے بچپن کے رفیقو! تم کہاں تھے؟ چلو کھانا کھالو بعد میں باتیں کریں گے۔

نظام الملک بڑی گرم جوشی سے مہمانوں کو اپنے دسترخوان پر لے گیا اپنے ساتھ کھانا کھلایا۔ ایسا خوش ذائقہ اور خوشبودار طعام، زندگی بھر میں انکی نظر سے نہ گذرا تھا۔ انہوں نے خوب سیر ہو کر کھایا۔

نظام الملک نے انگور مہمانوں کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ دوستو!! مانگو۔ کیا چاہتے ہو۔ تمہارا نظام اپنے عہد کو پورا کرنے کے لئے بہت ہی بیتاب ہے۔

عمر بولا۔ وزیر صاحب! مجھے تو آپ جانتے ہی ہیں۔ ایک عزلت پسند آدمی ہوں۔ کوئی ایسا گوشۂ عافیت دے دیجئے جہاں بیٹھ کر بے فکری سے زندگی بسر کر سکوں۔ حسن نے ملازمت کی خواہش کی۔

دوسرے ہی دن نظام الملک نے حسن کو شاہی دفتر میں ملازم کرا دیا۔ اور عمر کو ایک سرسبز و شاداب علاقہ جاگیر میں دے کر باعزت و آبرو رخصت کیا۔

(۳)

الپ ارسلان اپنے زمانہ کا بہت بڑا سلطان تھا۔ فارس ماوراالہند اور عراق وشام کی زرخیز ولائتیں اس کی سلطنت میں شامل تھیں۔ نظام الملک اس کا وزیر اعظم تھا۔ جب بادشاہ فوت ہو گیا۔ تو اس کے بلند اقبال بیٹے ملک شاہ نے بھی اسی نیک نام وزیر کو اپنے عہدے پر بحال رکھا۔ اور مثل اپنے والد کے اس کی قدر کرتا رہا۔ نظام الملک نے بغداد اور نیشاپور میں دو بڑی اسلامی یونیورسٹیاں قائم کیں۔ جو اندلس سے چین تک مشہور تھیں۔ الغرض اس با اقبال انسان نے خلق خدا کے سود و بہبود کے لئے ایسے ایسے کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ کہ آج تاریخ کے اوراق "ورق گل" بن کر اس پر سے نثار ہو رہے ہیں۔ نظام الملک ۷۶ برس کی عمر پا کر رفیق حسن بن صباح کے ایک مرید کے ہاتھوں ۴۸۰ھ میں شہید ہو گیا۔

(۴)

عمر خیام نے گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر فلسفیانہ شاعری میں وہ نام پیدا کیا کہ دنیا کے طول و عرض میں اس کا ڈنکا بجنے لگا۔ شاہانِ وقت نے اس کے پاس دعوت نامے بھیجے مگر یہ کنج عافیت سے باہر نہ نکلا ایک موقعہ پر لونڈی نے شراب کا پیالہ پیش کیا۔ یہ نشہ میں اس قدر بدمست ہو رہا تھا کہ پیالے کو تھام نہ سکا۔ اور وہ گر کر ٹوٹ گیا۔ عمر نے عالم کیف میں آسمان کی جانب نگاہ

کر کے فی البدیہہ ذیل کی رباعی موزوں کی ؎

ابریق مئے مراشکستی ربّی بر من درِ عیش را بہ بستی ربّی
برخاک بریختی مئے ناب مرا خاکم بدہن مگر تو مستی ربّی

ترجمہ:۔ اے خدا تو نے میرا شراب کا پیالہ توڑ دیا۔ میرے عیش کو منغص کر دیا۔ میری شراب کو زمین پر انڈیل دیا۔ میرے منہ میں خاک کیا تو بھی مست تھا۔

اسی وقت آندھی چلی۔ گستاخ شاعر کا منہ سیاہ ہو گیا۔ لونڈی نے شیشہ دکھا کر کہا۔ اپنی گستاخی کا حشر دیکھ۔ شاعر کے جذبات نے ایک دفعہ پھر انگڑائی لی اور شیشے میں اپنا کالا منہ دیکھ کر کہا ؎

ناکردہ گناہ در جہان کیست بگو وآنکس کہ گناہ نہ کرد و زیست بگو
من بد کنم و تو بد مکافات دہی پس فرق میان من و تو چیست بگو

ترجمہ:۔ دنیا میں ایسا کون ہے جس نے گناہ نہ کیا ہو۔ اگر میرے گناہوں کا بدلہ بھی مجھے برائی کی صورت میں ملے۔ تو اے خدا تیرا اور میرا کیا فرق رہ گیا۔

ابھی رباعی کا آخری لفظ بگو زبان پر ہی تھا۔ کہ عمر کا چہرہ چودھویں کے چاند کی طرح روشن ہو گیا۔ اسی وقت سجدے میں گر کر کہا۔ اے الٰہ العٰلمین آج میری گستاخی اور تیری رحمت کاملہ دونوں کی انتہا ہو گئی۔ اب زیادہ جینے کی ہوس نہیں رہی۔ اپنی شانِ کریمی کے صدقے مجھے اس دنیا سے اٹھا لے

عمر کا یہ کہنا تھا کہ اس کا طائرِ روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گیا۔

رباعیات عمر خیام اِس کی زندہ جاوید یادگار ہے۔ جس کے ترجمے دنیا کی تمام زبانوں میں عام ہو چکے ہیں۔

(۵)

حسن بن صباح کی چلبلی طبیعت نے ملازمت پر قناعت نہ کی اس نے قلعہ الموط پر قبضہ کر کے ایک نئے فرقے کی نیا ڈالی چار نسلوں تک اس کی اولاد بڑی شان و شوکت سے بادشاہی کرتی رہی۔ آج لاکھوں آدمی حسن بن صباح کو اپنا روحانی پیشوا مانتے ہیں تینوں ہم مکتب نظام الملک طوسی عمر خیام اور حسن بن صباح علمی دنیا میں آج تک غیر فانی شہرت کے مالک چلے آتے ہیں۔ وہ شخص بہت ہی خوش قسمت تھا جس نے ایسے فرزانۂ روزگار شاگرد پیدا کئے۔ ایسے صاحبِ کمال بار بار پیدا نہیں ہوتے لیکن مشہور ہے۔ کہ تاریخ اپنے واقعات کو دہراتی ہے چنانچہ اس دور سے ساڑھے پانچ سو سال بعد پھر ہمیں سیالکوٹ (پنجاب) کی سرزمین میں ایک ایسا معلم نظر آتا ہے جس نے ان سے بھی زیادہ عظیم الترتیب شاگرد پیدا کئے۔ یہ بزرگ مولانا کمال الدین کاشمیری تھے۔ آپ کے تینوں شاگرد جن کا ذکر یہاں مقصود ہے۔ پانچ دریاؤں کی زرخیز اور سرسبز فضا میں پیدا ہوئے اور حضرتِ علام کے فیضِ تربیت سے آسمانِ شہرت پر آفتاب و ماہتاب بنکر

چمکے۔ ایک کو قطب ربانی مجدد الف ثانیؒ کا لقب عطا ہوا۔ دوسرے نے علم منطق، فلسفہ اور کلام میں نام پیدا کیا۔ تیسرے نے شہنشاہ ہند کا قلمدان وزارت سنبھالا۔

علامہ سر محمد اقبالؒ کے متعلق مشہور ہے کہ جب گورنر پنجاب نے آپکو سَر کا خطاب دینے کے سلسلے میں طلب کیا۔ تو آپ نے فرمایا۔ مجھے خطاب دینے سے پہلے میرے اُستاد حضرت مولانا سید میر حسن شاہ صاحب کو جو یگانۂ روزگار عالم ہیں خطاب ملنا چاہیئے۔ گورنر نے جواب دیا۔ میں نے آجتک ان کی کوئی تصنیف نہیں دیکھی۔ آپ کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ گورنر صاحب کی طرف مسکرا کر دیکھا۔ اور کہا۔ جناب والا! مولانا کی سب سے بڑی تصنیف میں خود آپ کے سامنے موجود ہوں۔ ان کے علم و فضل کے لئے اس سے زیادہ کیا ثبوت چاہیئے۔ الغرض حضرت استاد کو شمس العلما کا خطاب دلا کے ہی چھوڑا۔ علامہ مرحوم کے تذکروں میں جب یہ واقعہ ہماری نظر سے گذرتا ہے۔ تو ہمیں علامہ میر حسنؒ کی قسمت پر رشک آنے لگتا ہے کہ وہ کتنے خوش نصیب تھے۔ کہ ان کی شاگردی پر خود اقبال بھی فخر کرتا تھا۔ اور پھر جب ہم علامہ کمال الدین کاشمیری کی شخصیت کا اندازہ لگاتے ہیں تو فرط عقیدت سے ہماری نگاہیں جھک جاتی ہیں۔ اور ہم اپنے دل میں اُن کی عظمت و توقیر کا بے پناہ جذبہ محسوس کرنے لگتے ہیں جن کا شاگرد رشید مجدد الف ثانی ہو۔ اس

کے رہنے کا کیا کہنا بقول شاعر مشرق ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اب علامہ کمالؒ کے شاگردوں کا حال سنئے :-

ایک محبوب سبحانی، قطب ربانی حضرت شیخ احمد مجدد الف ثانی رحمتہ اللہ علیہ ہیں جن کا مزار سرہند میں اب تک مرجع خاص و عام بنا ہوا ہے آپ کا مرتبہ اپنے زمانے کے علما میں یہ تھا کہ بالاجماع اور متفقہ طور پر آپ کو گیارھویں صدی کا مجدد تسلیم کیا گیا۔

آپ کی تصانیف میں مکتوبات امام ربانی کو خاص درجہ حاصل ہے یہ تین ضخیم جلدوں پر محیط ہے اس سے تصوف اور حقیقت کی ہزاروں گتھیاں حل ہوتی ہیں۔ آپ نے اکبر، جہانگیر اور شاہجہان کا زمانہ پایا ہے۔ اکبر کے زمانہ میں آپ نے فیضی کو تفسیر بے نقط "سواطع الالہام" لکھنے میں مدد دی ابوالفضل اُن دنوں علمائے اسلام کے درپے ہو رہا تھا۔ اکبر کے عقائد خراب ہو چکے تھے ایک روز حضرت کی موجودگی میں ابوالفضل نے رسالت پر کچھ شبہات ظاہر کئے اس سے حضرت طیش میں آ گئے۔ وہ سہم کر معافی کا طالب ہوا۔ مگر حضرت بغیر ملے مکان پر چلے آئے۔ رسالہ اثبات النبوت انہی ایام کی یادگار ہے چند دنوں بعد ابوالفضل مارا گیا۔ اور جس دین کی بنیاد اس کی ترغیب سے اکبر

سے نے رکھی تھی۔ وہ بھی ختم ہو گیا۔ شبیر صاحب کے بیان کے بموجب فتنہ دین الٰہی فرو کرنے میں حضرت کا بہت بڑا دخل تھا لکھتے ہیں :۔

"خزاں جب چمن کے حسن و خوبی کو برباد کر دیتی ہے تو باد بہار نوجوانانِ چمن کو نئی زندگی کا پیغام سنانے آتی ہے۔ باغ کے کونے کونے میں ترو تازگی کے آثار نمودار ہونے لگتے ہیں۔ سبزہ از سر نو زمین پر مخملی فرش بچھا دیتا ہے۔ پودے پھر ہرا بھرا لباس پہن لیتے ہیں۔ اور ڈالی ڈالی پر کلیاں مسکرانے لگتی ہیں۔ بعینہ اسی طرح جب ہندوستان کے با اقبال شہنشاہ اکبر کے دماغ میں متحدہ قومیت کا بھوت سوار ہوا۔ اور اس نے مشرکانہ رسوم اور عقائد کو اسلام میں داخل کر کے "دین اسلام" کے نام سے ایک نئے مذہب کی بنیاد ڈالی۔ تو ہر فرعونے را موسیٰ کے مصداق اپنے سچے دین کی حفاظت کے لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت مجدد الف ثانی کو سرہند میں پیدا کیا۔ جن کی مساعی جمیلہ سے اسلام کو ہندوستان میں اس قدر تقویت پہنچی۔ کہ "دین اکبری" نہایت ہی قلیل عرصہ میں صفحۂ دہر سے معدوم ہو گیا۔"

جہانگیر کے زمانے میں عبداللہ خان ازبک والئے توران کی درخواست پر

حضرت نے "ردِ شیعہ" کے عنوان سے ایک رسالہ تصنیف فرمایا۔ مزید برآں خلفائے راشدین اور ام المومنین کی شان میں بھی ایک مبسوط کتاب تحریر فرمائی۔ آصف خاں اور نور جہاں بیگم نے شیعہ مذہب کے خلاف آپ کی کوششیں ملاحظہ کیں۔ تو انہوں نے بادشاہ کے کان بھرنے شروع کئے کہ یہ شخص والئے توران سے ملا ہوا ہے اور ہندوستان میں جگہ جگہ اس نے سازش کا جال بچھا رکھا ہے۔ اگر بروقت اس پر قابو نہ پایا گیا۔ تو اس کے نتائج بے حد خطرناک برآمد ہوں گے۔ بادشاہ نے حضرت کو طلب کیا۔ آپ دربار میں اس شان سے پہنچے۔ کہ نہ مجرا بجالائے اور نہ تعظیمی سجدہ ہی ادا کیا۔ امرائے دربار نے اشارے سے سمجھایا۔ تو فرمایا۔ کہ یہ سر سوائے خدا کے کسی کے آگے نہیں جھکا۔ اور نہ آئندہ اس کے جھکنے کی اُمید ہے۔ بادشاہ نے جھنجھلا کر آپ کو گوالیار کے قلعے میں قید کر دیا۔ مگر کچھ عرصے کے بعد نہ صرف آزاد کیا۔ بلکہ اپنی جسارت کی معذرت بھی طلب کی۔ علامہ اقبال نے جب سرہند میں حضرت کے آستان پر حاضری دی۔ تو حضرت کے اس جہاد کے متعلق اپنے تاثرات کو طویل نظم کی صورت میں پیش کیا جس کے دو اشعار یہ ہیں ؎

سر جس کا نہ جھکا جہانگیر کے آگے — اس خاک میں پوشیدہ ہے وہ صاحب اسرار

وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہبان — اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار

شاہجہاں تو حضرت کا مرید تھا۔ اور اس دور کے بڑے بڑے امرار

اور فضلاء حضرت سے بے پناہ عقیدت رکھتے تھے۔ ۲۸ صفر ۱۰۳۴ھ کو حضرت کا انتقال ہوا۔ وفات سے پہلے آخری جمعہ کے موقع پر حضرت نے مریدوں کو جمع کر کے بہت سی نصیحتیں کیں۔ شب وصال ہندی کا ایک مصرع بار بار زبان پر آتا رہا جس کا مطلب تھا۔

"آج روزِ وصال ہے۔ اس خوشی میں تمام جہاں قربان کرتا ہوں"

علی الصبح وضو کر کے تہجد ادا فرمائی۔ صبح کی نماز جماعت سے پڑھی پھر مراقبہ فرمایا۔ اشراق کے بعد دعائیں پڑھتے رہے اور لیٹ کر اللہ اللہ کہتے ہوئے رفیق اعلیٰ کو لبیک کہہ گئے۔

(۶)

علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی

علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی حضرت علامہ کمال کاشمیری کے دوسرے شاگرد رشید ہیں۔ اکبر اعظم کے زمانے میں آپ حکومت کے سب سے بڑے مدرسہ کے صدور الصدور تھے۔ جہانگیر نے اپنے عہد میں ان کے فضل و کمال کا اعتراف کرتے ہوئے جاگیر عطا کی۔ اور اپنے مصاحبین میں داخل کیا۔ شاہجہان کے دور میں آپ کے زیر اہتمام سیالکوٹ میں بھی ایک یونیورسٹی قائم ہوئی جس میں عراق اور شام سے طالبان علم و ادب آکر تعلیم

پاتے تھے ۱۰۶۸ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔ آپ کی تصانیف زیادہ تر علم منطق، فلسفہ اور کلام پر مشتمل ہیں۔ آپ نے منطق اور کلام کی کتب پر بسیط حاشیے سپردِ قلم فرمائے۔ آپ کی کتابیں صرف ہندوستان میں نہیں، بلکہ مراکش، اندلس اور کابل و قسطنطنیہ تک مستند درسگاہوں میں پڑھائی جاتی ہیں۔

(۷)

نواب سعد اللہ خاں

حضرت علامہ کا تیسرا شاگرد نواب سعد اللہ خاں ہے یہ شاہجہاں بادشاہ کے وزیر اعظم تھے۔ تدبر، سیاست اور علم و فضل میں آپ کا پایہ نظام الملک طوسی، خواجہ محمود گاواں اور خواجہ جہاں احمد بن الیاس سے کم نہیں۔ یہ اپنے زمانے میں ابوالفضل فیضی اور جعفر برمکی سے زیادہ راعی اور رعایا کو محبوب تھے۔ ان کے عروج و اقبال کی داستان بھی بجائے خود ایک افسانہ ہے۔ جو اس کتاب میں الگ درج ہے۔ آج نہ سعد اللہ خاں ہے نہ علامہ سیالکوٹی اور نہ مجدد الف ثانی کا پیکر نورانی کہیں جلوہ فگن ہے۔ مگر ان کی شہرت کا ڈنکا چار دانگ عالم میں بج رہا ہے۔ لیکن علامہ کمال کاشمیری، ان نامور بزرگوں کا استاد سیالکوٹ کے ایک گمنام گوشے میں محوِ خواب ہے۔ دنیا جانتی بھی نہیں۔ کہ اس تودہ خاک میں کس

پائے کی شخصیت استراحت فرما ہے ؎

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے

نوّاب سعد اللہ خاں

مآخذ

تاریخ ہند مولوی ذکاء اللہ ——————

تحقیقات چشتی ——————

وغیرہ

رباعی

آدمی را بچشم حال نگر
از خیال پریشاں بگذر
نافۂ آہو خوں بود
سنگ ہست ابتدائے لعل وگہر

"سعد اللہ خاں"

ما طفیل کم سواد و سبق قصہ ہاے دوست
صد بار خواندیم و دگر از سر گرفتہ ایم

سنہ ۱۰۱۹ھ کے قریب چنیوٹ میں امیر بخش نامی ایک غریب الحال کسان رہتا تھا۔ وہ دن بھر اپنی زمین میں کھیتی باڑی کا کام کرتا تھا اس کی محنت اور دیانت داری علاقہ بھر میں مشہور تھی لیکن اس کے باوجود ہمیشہ تنگ دست رہتا تھا۔ دوپہر کا کھانا اس کی بیوی کھیت میں پہنچاتی تھی۔ مگر اب چند دنوں سے اُسے دوپہر کے وقت خود گھر آنا پڑتا تھا۔ کیونکہ اس کی بیوی کے وضع حمل کے ایام قریب تھے اس لئے وہ کھانا پہنچانے کے لئے کھیت میں نہیں آ سکتی تھی۔

انار لاؤ ورنہ مرتی ہوں

ایک دن جب وہ روٹی کھانے کے لئے گھر آیا۔ تو بیوی نے کمال عاجزی سے گڑگڑا کر کہا۔ کہ میرا جی انار کو چاہتا ہے۔ اگر تو لے کر نہ دیا تو میں مر جاؤنگی۔ امیر بخش نے ہنس کر کہا۔ بے وقوف! ہم غریبوں کا انار

سے کیا کام! اگر شلغم مولی کہو تو لا دوں۔!"
بیوی بولی تم ٹھیک کہتے ہو۔ مگر ایسی حالت میں جبکہ مجھے آٹھ ماہ کا حمل ہے۔ مجھے انار کیلئے نہ ترساؤ اس نیک بخت نے کانوں کی بالیاں اتار کر حوالے کیں۔ اور کہا۔ یہ بالیاں لے جاؤ اور جہاں سے بھی ممکن ہو انار خرید لاؤ۔

امیر بخش نے بالیاں جیب میں ڈالیں اور شہر کو روانہ ہوا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ گھاٹ کے قریب ہی کابلی میوہ فروشوں کا قافلہ اترا ہے اور وہ انار و انگور دہلی لئے جاتے ہیں۔

ملک الیاس

امیر بخش بلا توقف لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا قافلے میں پہنچا۔ اتفاق سے سالار قافلہ ملک الیاس سامان کی دیکھ بھال کرتا پھرتا تھا۔ لوگوں نے اشارے سے بتایا کہ مقصود یہی ہے اگر کچھ لینا ہے تو قدموں میں جھک جاؤ۔ ورنہ پھر کف افسوس ملنے سے کچھ نہ بنے گا۔ امیر بخش لپک کر آگے بڑھا۔ اور ملک الیاس کے آگے دو زانو جھک گیا۔ پاؤں پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ خدا کے لئے ایک انار دے دو۔ ورنہ میری بیوی مر جائے گی۔

سوداگر نے ہاتھوں سے امیر بخش کو اٹھا کر کھڑا کیا اور ملائمت سے بولا۔
"شریف آدمی! میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا پھر کہو۔"

امیر بخش کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور دل گیر آواز میں بولا۔

"اے فرشتۂ رحمت! میری بیوی حاملہ ہے اور وہ اناروں کے لئے دیوانی ہو رہی ہے۔ اگر انار لے کر نہ گیا۔ تو وہ جان دے دے گی۔ ایک حاملہ عورت کی زندگی اور موت آپ کے ہاتھ میں ہے۔ خدا کے لئے مجھے مایوس نہ کیجئے۔ یہ بالیاں لے لیجئے اور ایک انار مجھے دیجئے"۔ سوداگر دفعتہً خاموش ہو گیا اور سائل کے ماتھے کی سلوٹوں کو غور سے دیکھنے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا اس کی تقدیر کے نوشتے کو پڑھنے کی کوشش کر رہا ہے اس نے بہت جلد معلوم کر لیا کہ اس کی بیوی کے شکم میں یقیناً کوئی صاحب اقبال فرزند ہے۔ امیر بخش سے کہا۔ بڑے میاں یہ میوے جہانگیر اعظم شہنشاہ ہند کے لئے دہلی لئے جاتا ہوں۔ راستہ میں مجھے یہ میوے بیچنے یا کسی کو تحفہ کے طور پر دینے کی اجازت نہیں لیکن اگر تم مجھے اس مائی کے پاس لے چلو تو پھر انار بلکہ انگور بھی بلا قیمت پیش کر سکوں گا۔

"بلا تکلف تشریف لے چلئے۔ اتنا بڑا سوداگر غریب خانہ قدم رنجہ کی تکلیف کرے۔ میرے لئے اس سے اور بڑا فخر کیا ہو سکتا ہے۔ امیر بخش نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔

ملک الیاس نے چند انار اور انگوروں کے گچھے ٹوکری میں ترتیب سے رکھ نوکر کے حوالے کئے اور امیر بخش کے ہمراہ اس کے گھر کو روانہ ہوا۔

سند لکھ دو

امیر بخش کی بیوی بڑی بے تابی سے اناروں کا انتظار کر رہی تھی۔ خاوند کو خالی ہاتھ آتا دیکھ کر مایوس ہو گئی۔ امیر بخش نے کہا گھبرا نہیں انار اور انگور لایا ہوں۔ مگر سوداگر تم سے کچھ بات کرنا چاہتا ہے۔

"کیا کہے گا؟" بیوی نے گھبرا کر کہا۔

"کیا معلوم!" میاں نے متفکرانہ انداز میں جواب دیا۔

بیوی نے پردہ کر لیا۔ دروازے کے باہر چارپائی بچھوا دی اور کہا۔ لے آیئے۔

سوداگر نے اندر آ کر ادب سے سلام کیا اور کہا۔ مائی! میں یہ چند انار اور انگور ہدیہ کے طور پر لایا ہوں۔ تمہارے میاں نے قیمت دینی چاہی تھی میں نے نہیں لی۔ میری شرط یہ ہے۔ کہ تو مجھے یہ سند لکھ دے کہ اگر تیرا بیٹا صاحب اقبال ہو تو مجھ سے مروت سے پیش آئے۔"

مائی کے چہرے پر خوشی کی ایک جھلک دوڑ گئی۔ کہا میرا لال ضرور صاحب اقبال ہو گا تبھی تو انار مانگتا ہے۔ آپ جو لکھوانا چاہتے ہیں لکھ لیں۔ میں نشان کرنے کو تیار ہوں۔ سوداگر پہلے سے چند سطور لکھ کر لایا تھا۔ ان کے نیچے مائی کا نام لکھ کر نشان کرا لیا۔

درِ یتیم ——— ۱۰ صفر سنہ ۱۱۹ھ کو جمعرات کے دن امیر بخش کے

گھر میں ایک خوبصورت بچہ پیدا ہوا۔ اس نے خوب جی کھول کر خیرات کی مسجد کے مولوی صاحب سے مشورہ کر کے سعد اللہ نام رکھا۔ زچہ اتنی خوش تھی کہ اسے دردِ زہ کا احساس بھی نہ رہا تھا۔ خدا کی بے نیازی دیکھئے کہ عصر کے قریب اچانک امیر بخش کے پہلو میں درد اُٹھا اور گھڑی کے اندر اندر چل بسا۔ لوگوں میں بچے کے خلاف نفرت سی پیدا ہو گئی۔ کہ کیسا منحوس ہے پیدا ہوتے ہی باپ کو کھا یا۔ زچہ نے میاں کی بے وقت موت کی خبر سنی۔ تو شدت غم سے بے ہوش ہو گئی۔ ہزاروں تدبیروں سے اسے ہوش میں لایا گیا۔ ماں بہنوں نے بہتیرا حوصلہ دلایا۔ مگر اس کا سہاگ لُٹ چکا تھا۔ دنیا اندھیر نظر آئی۔ لیکن مرتی کیا نہ کرتی۔ بچے کو چھاتی سے چمٹا اس کی پرورش شروع کی مگر قدرت کو یہ سہارا بھی پسند نہ آیا۔ سعد اللہ نے ابھی پانچ بہاریں بھی نہ دیکھی تھیں کہ سوداگر کی زبان سے بچے کے صاحب اقبال ہونے کی پیشگوئی سننے والی ماں ہزاروں حسرتیں دل میں لئے آخرت کو سدھار گئی اور سعد اللہ ماں باپ دونوں کی طرف سے یتیم ہو کر رہ گیا۔

جستجوئے علم میں لاہور اور سیالکوٹ کا سفر

یہ "دُرِ یتیم" دس برس کی عمر تک چنیوٹ کی مسجدوں میں دینیات کی ابتدائی تعلیم حاصل کرتا رہا۔ جب ذرا سفر کے قابل ہوا تو شوق علم کشاں کشاں دارالسلطنت لاہور کو لے چلا۔ وہاں دہلی دروازے کے اندر ایک مسجد میں

پڑھ... رہنے کی جگہ مل گئی۔ دن کو آفتاب کی روشنی میں اور رات کو مٹی کے چراغ میں سرسوں کا نہیں بلکہ آنکھوں کا تیل جلا کر علم کی پیاس بجھاتا تھا کھانے کا بندوبست کہاں سے ہوتا۔ قریبی مسلمانوں کے گھروں سے ارواح کی روٹیاں لے کر پیٹ کے جہنم کو بھر لیتا۔ یہاں سے سیالکوٹ کو روانہ ہوا اور علامہ کمال الدینؒ کاشمیری سے حدیث و تفسیر، منطق و فلسفہ اور علم کلام کی سند حاصل کی حضرت سے اجازت لے کر پھر لاہور پہنچا۔ ان دنوں یہاں ملّا خواجہ بہت مشہور ہو رہے تھے۔

وزیر بادشاہ ہند را بطلبید ـــــــــــ

یہ بزرگ میاں میر رحمتہ اللہ علیہ کے مرید اور ملّا شاہ بدخشی کے پیر بھائی تھے۔ خواجہ بختاور مراۃ العالم میں لکھتا ہے کہ نواب سعداللہ خاں اپنی افلاس اور پریشانی کے زمانہ میں ملا صاحب کے پاس کسب علوم کی غرض سے آیا کرتے تھے۔ ایک دن ملّا صاحب بول اُٹھے۔

وزیر بادشاہ ہند را بطلبید

یعنی شہنشاہ ہندوستان کے وزیر کو طلب کرو۔ حاضرین متحیر ہوتے اِدھر اُدھر دیکھا مگر کسی وزیر کو مجلس میں موجود نہ پایا۔ اور نہ ہی ان دنوں لاہور میں کسی وزیر

ؒ علامہ کمال الدین کاشمیری کے متعلق مشہور تھا کہ جو ان سے تلمذ کا شرف حاصل کر لیتا ہے وہ ضرور صاحب کمال بن جاتا ہے حضرت مجدد الف ثانی بھی آپ کے ہی شاگرد تھے۔

کا ورود ہوا تھا۔ ایک بے تکلف عقیدت مند نے جرأت کر کے عرض کیا کہ حضور کا خطاب کس سے ہے۔ فرمایا۔

"ملا سعد اللہ را مے گویم"

سعد اللہ اٹھ کر حضور کے دست بوس ہوا۔ جتنے اصحاب اس وقت وہاں موجود تھے سب اسے مبارکباد دینے لگے۔

دہلی کی کشش

اس واقعہ سے سعد اللہ کے دل میں دہلی دیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ بشارت شاہ نامی درویش دہلی کو جاتا تھا۔ اس کے ہمراہ ہو لیا۔ کرنال تک پہنچے ہی تھے کہ بشارت شاہ تھک کر بیٹھ گیا۔ کہ میں تو اس ویران اور بنجر علاقے میں سفر نہیں کر سکتا۔ لیکن سعد اللہ نے ہمت نہ ہاری اور مسموم ہوا کے تند و تیز طوفان میں فقر و فاقہ کی مصیبتیں برداشت کرتا دہلی جا ہی پہنچا۔ چوراہی محلہ کی مسجد میں مولوی محمد صالح کے ہاں مسجد میں جھاڑو دینے وضو کی سبیل بھرنے پر دونو وقت کی روٹی ملنے لگی۔ اتفاق سے نواب[1] آصف خاں وزیر کا محل پاس ہی تھا۔ ان کے دو صاحبزادے مولوی صاحب کے ہاں پڑھنے آیا کرتے تھے۔

[1] نواب آصف خاں ملکہ عالیہ نور جہاں کا بھائی تھا۔ جہانگیر کے زمانہ میں وزارت عظمیٰ کے مرتبہ پر فائز ہوا۔ بادشاہ نے اپنے ولی عہد سلطنت شاہ جہاں کی شادی اس کی لڑکی ممتاز زمانی سے کر دی۔ شاہ جہاں کے زمانے میں اپنی اخیر عمر تک اس عہدے پر سربلند رہا۔

عروج واقبال کی منزلیں

ایک دن اتفاق ایسا ہوا کہ نواب صاحب کے بچے ایسے وقت پڑھنے آتے۔ کہ مولوی صاحب مسجد میں موجود نہ تھے سعد اللہ نے ان سے تختیاں لے کر اصلاح دے دی۔ رات کو جب نواب صاحب نے اصلاح شدہ عبارت دیکھی تو وہ بہت خوش ہوئے۔ پوچھا کہ یہ کس کا خط ہے؟ لڑکوں نے عرض کی۔ مولوی صاحب تھے نہیں مسجد کے ملازم سعد اللہ نے اصلاح دے دی۔ نواب صاحب نے نوکر بھیج کر سعد اللہ کو بلوایا۔ اور کہا۔ کہ آپ یہاں آکر بچوں کو اصلاح دے جایا کیجئے۔ آپ کو دس روپلے ماہوار ملا کریں گے سعد اللہ نے انتہائی تنگدستی کے عالم میں اس وظیفہ کو غنیمت سمجھ کر قبول کر لیا۔ کچھ عرصہ کے بعد اور ایسا واقعہ ظہور میں آیا۔ جس سے سعد اللہ کی کایا ہی پلٹ گئی۔ ایک دن نواب صاحب کے بچے ملّا محمد صالح سے منقامات ابوالفضل پڑھ رہے تھے۔ اتفاقاً کوئی مشکل سی عبارت آگئی۔ مولانا نے لاکھ کوشش کی مگر اس کے معنی و مطالب بچوں کی سمجھ میں نہ آسکے سعد اللہ نے موقعہ پا کر اس عبارت کی اس طرح وضاحت کی کہ تمام مطالب بچوں کے ذہن میں آگئے۔ بچوں نے رات کو نواب صاحب سے دن کا واقعہ ذکر کیا انہوں نے صبح کو بلا کر چالیس روپلے ماہوار اور دو وقتہ خوراک پر بچوں کا مستقل اتالیق مقرر کر دیا۔

ان دنوں ہندوستان کی باگ ڈور شاہ جہاں بادشاہ کے ہاتھ میں تھی اور ان کی شاہ ایران سے خط و کتابت رہتی تھی۔ انہی ایام میں جبکہ ملا سعد اللہ نواب آصف خاں کے صاحبزادوں کو پڑھایا کرتے تھے شاہ ایران کا ایلچی دربار میں حاضر ہوا۔ اور ایرانی تحائف کے ساتھ اپنے بادشاہ کا خط بھی پیش کیا۔ خط میں ملکی معاملات اور دوستانہ باتوں کے علاوہ ایک سطر خاص صنعت میں لکھی ہوئی تھی۔ بادشاہ کے تمام درباری امرار فضلا۔ کئی دنوں تک فکر آزمائی کرتے رہے۔ لیکن اس عبارت کے مفہوم کو نہ پا سکے۔ بادشاہ اور وزیر اعظم سخت پریشان تھے کہ اگر واپسی مکتوب میں اس عبارت کا جواب نہ گیا تو ہندوستان کے علمار فضلار کی بڑی بکی ہوگی۔

ملا سعد اللہ کی نکتہ آفرینی

ایک دن نواب صاحب اس کو اپنے ہمراہ گھر پہ لائے۔ رات کو شمعدان آگے رکھ کر دریائے فکر میں ایسا غوطہ مارا کہ صبح کو سر ابھارا۔ مگر دُرِ مقصود پھر بھی ہاتھ نہ آیا۔ صبح کو بیگم صاحبہ نے پوچھا۔ کیوں صاحب! شب بیداری کا نتیجہ بھی نکلا۔ نواب صاحب نے کہا۔ کچھ نہیں۔ کم بخت نے ایسی صنعت میں لکھا ہے۔ کہ تہہ ہی نہیں چلتا۔"

ملا صاحب کو بھی شاگردوں کی زبانی اس مکتوب کی حقیقت معلوم

ہو گئی تھی۔ جب نواب صاحب محلسرا تے سے دیوان خانے میں آتے۔ تو ملا صاحب نے وہ خط دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ نواب صاحب نے کہا۔ ملا جی بڑے بڑے عالم فاضل تھک کر ہار بیٹھے۔ مگر کسی سے عقدہ کشائی نہ ہو سکی۔ تم دیکھ کر کیا کرو گے۔

ملا صاحب نے دست بستہ التماس کی حضور والا کا ارشاد بجا۔ مگر دکھا دینے میں کیا ہرج ہے۔ کبھی نادانوں سے بھی دانائی کی بات ہو جاتی ہے۔ نواب صاحب نے مسکرا کر خط پڑھا دیا۔ اور کہا۔ دو گھڑی کے بعد بھجوا دیجیے گا۔ کیونکہ قلعہ میں ہمراہ لے جانا ہے۔

ملا صاحب خط لے کر اپنے کمرے میں جا گھسے۔ دو گھڑی کے بعد ہشاش بشاش باہر نکلے۔ خط نواب صاحب کی خدمت میں پیش کر کے عرض کی "جناب والا فدوی مطلب سمجھ گیا ہے۔ ایک ظرافت کی بات ہے۔ جب اس کا جواب لکھا جائیگا تو فدوی اس کے آخر میں اس سطر کا جواب لکھ دے گا۔"

نواب صاحب نے ہر چند دریافت کیا کہ ہمیں بھی تو معلوم ہو۔ کہ وہ ظرافت کی کونسی بات ہے تاکہ میں جہاں پناہ کی خدمت میں عرض کر کے تمہیں انعام دلادوں۔ ملا صاحب نے ہاتھ باندھ کر کہا "حضور والا! غلام کو بتا دینے میں کچھ عذر نہیں۔ لیکن لطف جاتا رہے گا۔ اس کا لطف اس وقت آئے گا جب شاہ ایران اس جواب کی نسبت کچھ لکھیں گے۔ پس حضور جہاں پناہ سے یہی عرض کر دیں۔"

نواب صاحب نے قلعے میں جا کر بادشاہ کی خدمت میں تمام امر واقعہ عرض کیا۔ اور جس وقت خط کا جواب تحریر ہونے لگا۔ ملاجی سے بھی جواب لکھوا دیا گیا۔

ملّاجی مرغی خانے کے داروغہ بنتے ہیں

ملّا صاحب کے لئے جہاں پناہ نے حکم دیا کہ "اگر کوئی خدمت خالی ہو تو ملّاجی کو دی جائے"۔ اتفاق سے مرغی خانے کے داروغہ کی آسامی خالی تھی ملّا صاحب اس خدمت پر مامور ہو گئے۔ بھلا ایک عالم کو مرغی خانے سے کیا نسبت! لیکن قابلیت یہاں بھی کام کر گئی۔ جہاں مرغی خانے پر ماہوار سینکڑوں روپے خرچ ہونے لگتے۔ اس دفعہ وہاں پائی بھی نہ لگی۔ فرد ملاحظہ کرنے پر بادشاہ نے تعجب فرمایا کہ کیا ہمارے مرغی خانے کا خاتمہ ہو گیا کہ ان کی خوراک کا خرچ فرد میں درج نہیں لیکن جب حضور نے تشریف لے جا کر دیکھا تو مرغ پہلے سے زیادہ تیار نظر آئے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا۔ کہ شاہی باورچی خانے میں دیگوں کے منہ خام کرنے کا آٹا جو فالتو جاتا تھا۔ اسے چکنی دیگوں میں ملوا کر ملّا صاحب مرغوں کو کھلاتے ہیں۔ بادشاہ کو ملا صاحب کی یہ سلیقہ شعاری بہت پسند آئی جب رخصت ہونے لگے۔ تو ملّا صاحب نے عرض کی۔ جہاں پناہ نے جو خدمت غلام کے سپرد کی تھی۔ فدوی نے اس سے عہدہ برآ ہونے کی پوری کوشش کی۔ مگر یہ کام بندہ کی طبع کے خلاف ہے۔ اگر مرغی خانے کی جگہ کتب خانہ

کی دیکھ بھال اس غلام کے سپرد کی جائے۔ تو عین احسان ہوگا۔ بادشاہ نے منظور کرلیا۔ اور ملا جی اب لائبریرین بن گئے۔

شاہی کتب خانے کا نیا لائبریرین

کچھ عرصے کے بعد بادشاہ کو کتب خانے کے دیکھنے کا خیال پیدا ہوا تشریف لاکر دیکھا۔ کہ تمام کتابوں پر زربفت کی چولیاں اور کمخواب کے جزدان چڑھے ہیں اور تمام الماریاں زنگار رنگ کی چولیوں اور جزدانوں سے عجیب کیفیت دکھا رہی ہیں۔ فرمایا: "ملا جی۔ مرغی خانے کی کسر یہاں پوری کردی۔ مگر فرد ابھی ملاحظہ سے نہیں گذری۔" عرض کیا: "حضور والا اگر کچھ خرچ ہوتا تو فرد پیش ہوتی۔" فرمایا: "پھر یہ چولیاں کہاں سے آگئیں؟"

ملا صاحب نے عرض کیا: "حضور والا! دربار شاہی میں مراسلے اور عرضیاں جن خریطوں میں آتی ہیں۔ وہ منشی خانے میں بیکار پڑے رہتے تھے۔ فدوی نے وہاں سے منگوا کر توشے خانے کے درزیوں سے ان کی چولیاں اور جزدان سلوا لیے۔"

بادشاہ اس جواب سے بہت مسرور ہوئے اور سوچنے لگے ایسا شخص تو وزارت کے لائق ہے۔ انہی ایام میں ایران سے خط کا جواب بھی آگیا لکھا تھا کہ "ہم کو یقین ہے کہ جس شخص نے ہمارے مراسلے کا جواب لکھا ہے وہ آپ کا وزیر ہوگا۔ اگر یہ بات نہیں ہے۔ اور وہ ایران آنا منظور کرے۔ تو ہم نے

اسے اسی تاریخ سے اپنا وزیر مقرر کیا جس تاریخ سے وہ ہندوستان سے روانہ ہوگا۔

بادشاہ نے ملا صاحب بلا کر کہا: "اب تو بتاؤ۔ وہ کیا معمہ تھا۔" سعد اللہ نے عرض کیا: جہاں پناہ! شاہ ایران نے لکھا۔ کہ آپ تو صرف ہند کے بادشاہ ہیں آپ نے شاہ جہاں اپنا خطاب کیوں اختیار کر رکھا ہے، غلام نے اس کے جواب میں یہ لکھ دیا۔ کہ ہند[1] اور جہاں کے عدد ایک ہیں۔ ہم نے ہند کی بجائے جہاں اختیار کر لیا۔ تو کیا ہرج ہو گیا؟"

ملا کی تقریر سے بادشاہ اور اہل دربار پھڑک اٹھے۔ ہر طرف سے واہ واہ اور مرحبا کی صدا آنے لگی۔ جہاں پناہ تخت سے اٹھ کر نیچے تشریف لائے اور اپنے ہاتھوں اپنا قیمتی چغہ اتار کر ملا سعد اللہ کے کندھوں پر ڈال دیا۔ اور وزارت کا قلمدان طلب کر کے معہ خلعت وزارت ملا کو عطا فرمایا۔ اب ملا سعد اللہ نواب سعد اللہ بن کر وزارت کے پردے میں ہندوستان پر راج کرنے لگے۔ یہ واقعہ ۱۰۵۵ھ کا ہے۔ وزارت کا چارج نواب اسلام خاں سے دلوایا گیا۔ اور منصب چار ہزاری ہزار سوار کا عطا ہوا۔ ماہ رجب ۱۰۵۵ھ میں وزارت عظمیٰ کا منصب، خلعت خاصہ الاصل و اضافہ منصب پنج ہزاری ذات و ڈیڑھ ہزار سوار کا عنایت ہوا۔ ۱۰۵۶ھ میں منصب شش ہزاری دو ہزار

---

[1] ہند   ھ ن د : ۵۹   ج ھ ا ن : ۵۹
        ۵ ۵۰ ۴   ۳ ۵ ۱ ۵۰

سوار مرحمت ہوا۔ ۱۰۵۸ھ میں سعد اللہ خاں منصب ہفت ہزاری ہزار سوار دو اسپہ وسہ اسپہ پر سربلند ہوا۔ ۱۰۵۹ھ میں چونکہ نواب سعد اللہ خاں امارت کے تمام مناصب حاصل کر چکے تھے۔ اور کوئی رتبہ باقی نہ رہا تھا۔ اسلئے دو کروڑ درم جس کی مقدار تیس لاکھ روپے کے برابر ہوتی تھی بطور انعام کے عطا ہوا۔

اس زمانے میں امیر بخش کے تیمم کا اثر و نفوذ اس حد تک پہنچ چکا تھا کہ شہنشاہ کا ولیعہد سلطنت دارا شکوہ بھی اس سے خم کھاتا تھا۔

ہم دشمن کو پشاور پر روکیں گے

شاہ جہاں بادشاہ نے جب شہر شاہ جہاں آباد دہلی تعمیر کیا۔ تو لال قلعے کے سامنے ایک پہاڑی پر جامع مسجد کی تجویز ہوئی۔ امراء نے دست بستہ عرض کی کہ اگر خدانخواستہ دشمن شہر میں گھس آیا تو اس مسجد کو بطور دمدمہ کے استعمال کرے گا۔ اور توپیں چڑھا کر لال قلعہ کو سرمہ بنا کر رکھ دے گا۔ بادشاہ کے چہرے پر تردد کے آثار ظاہر ہوتے۔ نواب سعد اللہ نے بڑھ کر عرض کیا: جہاں پناہ ہم دشمن کو پشاور پر روکیں گے۔" وزیر کی بلند ہمتی نے بادشاہ کے فکر کو دور کر دیا۔ خوش ہو کر فرمایا: "تو پھر اس مسجد کی تعمیر کا کام تم ہی سنبھالو۔" وزیر اعظم کی تو خواہش ہی یہی تھی کہ یہ کار ثواب اس کے ہاتھوں تکمیل پائے چنانچہ اس نے بڑے انہماک سے اس کی تعمیر کا کام شروع کرا دیا۔

سعد اللہ خاں کی قرآن فہمی

نواب سعد اللہ خاں کی ذات بہت سی خوبیوں کی حامل تھی۔ وہ بہترین سپاہی بھی تھے اور پختہ کار حساب داں بھی، وہ معاملہ فہم بھی تھے اور پرہیزگار عالم دین بھی۔ اپنے اپنے موقعہ پر انہوں نے اپنی قابلیت کے خوب جوہر دکھاتے۔ ایک دفعہ دربار میں کوئی پادری حاضر ہوا۔ بادشاہ سے دوران گفتگو میں عرض پرداز ہوا: حضور والا! قرآن کریم میں جو یہ آیا ہے کہ رطب اور یابس سب اس میں موجود ہے۔ بھلا یہ تو فرمایئے۔ "دنوں" کا قرآن کریم کے اندر کہیں ذکر ہے بادشاہ نے فرمایا "ہاں وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ (چاند سے منزلوں کے اندازے مقرر کر دیتے ہیں) سے دن ہی تو مراد ہیں"۔ پادری نے کہا: "حضور نے درست فرمایا مگر سال میں دن کتنے ہیں؟ یہ تو ظاہر نہیں ہوتا"۔ بادشاہ نے وزیر اعظم کی طرف دیکھا۔ نواب صاحب نے بلا تامل عرض کیا: جہاں پناہ، قرآن مجید نے پادری صاحب کے سوال کا جواب اسی آیت میں ہی دے دیا ہے"۔ پادری نے کہا "وزیر صاحب ذرا واضح کر کے فرمایئے" نواب صاحب نے بادشاہ کی طرف متوجہ ہو کر عرض کیا "حضور والا۔ قدّرنٰہ کے اعداد ابجد کے لحاظ سے ۳۶۰ ہوتے ہیں۔ اس سے قرآن کی ہمہ گیری کا زیادہ ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے"۔ نواب صاحب کے اس جواب پر ہر طرف سے تحسین و آفرین کی آوازیں آنے لگیں اور بادشاہ نے خوش ہو کر اسی وقت

اپنی خلعت فاخرہ مرحمت فرمائی۔ اور اُٹھ کر ان کی پیشانی کو بوسہ دیا۔ ادھر پادری صاحب کے لیئے اعتراف کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہا۔

سنگ لرزاں کی مسجد

نواب سعد اللہ خاں کے اعمال خیر میں سے اس کی ایک بے نظیر مسجد چنیوٹ میں اب تک موجود ہے۔ جب خدا نے اسے ہندوستان کی وزارت عنایت فرمائی تو اس نے وطن مالوف کی اس مسجد کو جہاں اس نے پہلے پہل بسم اللہ شروع کی تھی وسیع کر کے اعلیٰ پیمانہ پر سنگِ سرخ اور سنگِ لرزاں سے تعمیر کیا۔ یہ بہت کشادہ مسجد ہے۔ اس کے ستون مشہور ہیں کہتے ہیں۔ کہ شمار میں نہیں آتے۔ اور جو مینار ہیں۔ وہ سنگ لرزاں سے بنے ہیں۔ ان میں خصوصیت یہ ہے کہ اگر کوئی ہاتھ لگائے تو وہ ہلنے لگ جاتے ہیں

بشارت شاہ کی آمد

بشارت شاہ کرنال سے واپس ہو گیا تھا جب اسے معلوم ہوا کہ اس کا ہم سفر سعد اللہ آج کل ہندوستان کا وزیر اعظم بنا ہوا ہے تو وہ دہلی میں حاضر ہوا اور نواب کے محل میں داخل ہونے لگا۔ دربانوں نے روکا۔ وہ بڑبڑاتا ہوا چاندنی چوک میں بیٹھ گیا جب وزیر کی سواری گزرنے لگی۔ تو سامنے آگیا اور چلا کر بولا:

"او بدمعاش حرام زادے! اب یہ دماغ کہ دروازوں پر دربان بٹھا

رکھے ہیں؟"

نواب سعد اللہ خاں دانا آدمی تھا۔ چپ ہو رہا۔ جب اندر گیا۔ تو خزانچی سے کہا۔ "دس ہزار اشرفیاں لے آؤ۔ اور دیوان خانے میں خلوت کرادو۔"
پھر حکم دیا۔ "باہر ایک مجذوب کھڑا ہے۔ اسے لے آؤ!"
خزانچی لپک کر بشارت شاہ کو اندر لے آیا۔ وہ اپنی قدیم عادت کے مطابق گالیاں دینے لگا۔ نواب صاحب نے اس کی بکواس پر توجہ نہ دی اور اسے اپنی یہ طبعزاد رباعی سنائی۔

آدمی را بچشم حال نگر   از خیال پریشاں بگذر
نافۂ آہو خوں بود   مشک ہست اینداے لعل گہر

دس ہزار اشرفیاں اپنے ہاتھ سے شاہ صاحب کی نذر کیں اور چار سپاہیوں کو بلا کر حکم دیا کہ اسی وقت قبلہ شاہ صاحب کو لے کر لاہور روانہ ہو جائیں اور وہاں پہنچا کر واپس آئیں۔

ملک الیاس کی باریابی

سوداگر پیشہ لوگوں کا دستور ہے کہ جب کسی شہر میں وارد ہوتے ہیں۔ تو اس جگہ کے اکابر و معارف کا حال پوچھ لیتے ہیں۔ یخنت کی باوردی ملک ایاس کو جس نے سعد اللہ خاں کی والدہ کو انار اور انگور پیش کئے تھے۔ دہلی سے آئی۔ جب اسے معلوم ہوا۔ کہ وزیر اعظم چنیوٹ کا باشندہ ہے اور اس کے والدین

غریب آدمی تھے۔ تو اُسے یقین ہو گیا۔ کہ ہو نہو۔ یہ وہی بچہ ہے۔ جس کے بارہ میں ہم نے پیشین گوئی کی تھی کہ ایک دن نصرت و اقبال اس کے قدم چومیں گے۔ وہ اپنے قیافے کے صحیح ہونے پر بہت خوش ہوا۔ اور بلا تامل خریطے سے وہی سند نکال وزیر اعظم کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ نواب صاحب کو ماں کی شکل بھی یاد نہ تھی۔ انگوٹھے کے نشان کو دیکھ کر فرط محبت سے انکی آنکھیں اشک آلود ہو گئیں۔ کاغذ کو سر آنکھوں سے لگایا۔ کہا۔ "اے عمّ مہربان! آپ نے میرے ماں باپ کو دیکھا ہے اور ایک وقت میں ان کی ضرورت کو پورا کیا ہے۔ اس لئے آپ بمثل میرے باپ کے ہیں۔ اس غریب خانہ کو اپنا گھر سمجھئے۔ اور جو خدمت میرے لائق ہو۔ بلا تکلف ارشاد فرمایئے۔!"

ملک الیاس نے وزیر اعظم کی اس قدر افزائی کا شکریہ ادا کیا۔ اور اپنے علائق خاندانی کا ذکر کر کے رہائش سے معافی چاہی۔ کہا۔ کہ اگر میرے مال و اسباب پر سے محصول ہٹا دیا جائے۔ تو یہ میری بڑی خدمت ہو گی۔ نواب صاحب نے اُسی وقت معافی کا فرمان لکھ دیا اور سوداگر شادکام رخصت ہوا۔

سعد اللہ خاں کا سفرِ آخرت

سنہ ۱۰۶۰ھ میں یہ صاحب اقبال اور نیک نام وزیر قولنج کے عارضہ سے بیمار پڑ گیا۔ حکیم داؤد خاں مخاطب بہ تقرب خاں جو بادشاہ کا معالج خاص تھا

اس کے علاج پر مقرر ہوا۔ بادشاہ کو وزیر سے دلی محبت تھی۔ وہ کئی بار چل کر عیادت کو آیا۔ اس نے طبیبوں کو بار بار بدل کر علاج پر مقرر کیا۔ مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔ آخر چار پانچ ماہ کی بیماری کے بعد ۲۲ جمادی الثانی کو اس سرائے فانی سے عالم جاودانی کو کوچ کر گیا۔ بادشاہ کو ایسا ملال ہوا کہ وہ اس کیلئے بے اختیار زار زار رویا۔

سعد اللہ خاں نے ۴۷ برس کی عمر پائی۔ اس نے صرف پانچ سال وزارت کی۔ مگر اس قلیل عرصے میں وہ اتنے اچھے کام کر گیا ہے کہ جب تک دنیا قائم ہے۔ اس کا نام زندہ رہے گا۔

لہ برنی آر نے دارا شکوہ پر زہر خورانی کا جو الزام لگایا ہے کوئی تاریخ اس کی تائید نہیں کرتی۔ برنی آر کے سفرنامے کا قلعہ قیاس کی بنیادوں پر قائم ہے۔ ہر جگہ افواہوں اور قیاسات سے غلط نتائج مرتب کر لیتا ہے۔

لہ نواب سعد اللہ خاں کے انتقال کے وقت اس کے بڑے بیٹے لطف اللہ خاں کی عمر پندرہ سال کی تھی۔ اُسے بادشاہ نے ہفت صدی صد سوار کا منصب عطا فرمایا اورنگ زیب کے عہد میں صوبہ داری کے عہدہ تک ترقی کی۔ لاہور میں اس نے اپنے لئے سنگِ سیاہ کا عالیشان مقبرہ تعمیر کرایا تھا۔ قبر کا تعویز۔ فرش۔ دیواریں سب سنگِ سیاہ کی تھیں۔ مگر طوائف الملوکی کے زمانہ میں سیاہ پتھر اکھڑوا لیا گیا۔ اب خشتی قبر رہ گئی ہے چونکہ ان کی اولاد نہ رہی تھی۔ اس لئے محکمہ نزول نے یہ مقبرہ اور ملحقہ باغ نواب علی رضا قزلباش کو دے دیا۔

باقی صفحہ ۲۹۲ پر)

زندہ است نام فرخ نوشیرواں بعدل
گرچہ بسے گذشت کہ نوشیرواں نماند
خیرے کن اے فلاں و غنیمت شمار عمر
زاں پیشتر کہ بانگ برآید فلاں نماند

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۹۱)

نواب سعد اللہ خاں کی قبر کا حال معلوم نہیں ہو سکا۔ اس نے دہلی۔ لاہور اور چنیوٹ میں کئی شاندار حویلیاں تعمیر کی تھیں۔ رنگ محل (لاہور) جہاں اب مشن سکول ہے۔ یہ اسی کی حویلی کا کچھ حصہ ہے۔ باقی حصہ اس کے جنوب میں تھا۔ موچی دروازہ میں حویلی پتھراں والی کے نام سے سعد اللہ خاں کی ایک حویلی بھی تھی۔ ان کی تعمیر کردہ سنگ لرزاں کی عالیشان مسجد چنیوٹ میں اب تک ان کی یاد کو تازہ کر رہی ہے ؎

شہنشاہ کی دونیؔ

ماخذ

روایت ملک مراد بخش صاحب لچھ افسر مال

ڈیرہ غازی خاں

"حضرت! جب سے غلام نے دہلی کے تخت پر قدم رکھا ہے
رات کے دو گھنٹے روزی کمانے کے لئے وقف کر رکھے ہیں
ایک گھنٹہ میں قرآن مجید لکھتا ہوں اور دوسرے گھنٹہ میں
ٹوپیاں سیتا ہوں ہفتہ میں دو راتیں شہر کی دیکھ بھال میں
صرف ہوتی ہیں جس رات اُتم چند کے گھر کا کام کیا تھا وہ
میرے بھیس بدل کر شہر میں پھرنے کی رات تھی۔ خدا کا
لاکھ لاکھ شکر ہے۔ کہ اس نے میرے فانی وجود سے
ایک ضرورت مند کی ضرورت پوری کرائی۔ اور حضرت یہ
سن کر بھی یقیناً خوش ہوں گے۔ کہ ناچیز نے تخت نشین
ہونے کے بعد کثرتِ کاروبار اور عدیم الفرصتی کے باوجود
قرآن اور صحیح بخاری کا متن بلفظ حفظ کر لیا ہے"

"اورنگ زیب"

(۱)

آں مسلماناں کہ میری کردہ اند
در شہنشاہی فقیری کردہ اند

املیٹھی کا مکتب قال اللہ وقال الرسول کی بابرکت صداؤں سے گونج رہا تھا۔ بڑے بڑے باکرامت چہرے مُلّا احمد جیون کے آگے زانوئے تلمذ تہ کئے۔ نووارد اور فتوحات مکیہ سے دلوں کو گرما رہے تھے۔ اسی عالم میں ایک شتر سوار سرعت سے زمین کی طنابیں لپیٹتا اور گرد اڑاتا دکھائی دیا۔ سب کی نگاہیں ادھر کو اٹھ گئیں۔ تھوڑی دیر میں گرد چھٹی اور اس میں سے ایک ادھیڑ عمر کا نوجوان اونٹ پر نظر آیا۔ سواری کا جانور پسینہ سے شرابور ہو رہا تھا۔ اور سوار کی حالت اس سے زیادہ ناگفتہ بہ تھی۔ سوار نے قریب آکر اونٹ کو روکا۔ جس پر مدرسہ کے ایک شاگرد نے لپک کر اونٹ کی مہار تھام لی۔ سوار نے اُتر کر کپڑے جھاڑے اور چہرے سے ڈھاٹا کھول کر ملا احمد جیون کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے نووارد کو خندہ پیشانی سے خوش آمدید کہہ کر پاس بٹھایا اور خیریت پوچھی۔ مسافر نے جیب سے چمڑے کی زردین کا بٹھر

تھیلی نکال کر آگے بڑھائی۔ یہ ہندوستان کے اس مطلق العنان تاجدار کا منشور تھا جس کے رعب سے اس برِصغیر کا ذرّہ ذرّہ کانپ رہا تھا۔ یہاں تک کہ جب اس کا فرمان شہزادوں کے پاس پہنچتا تو وہ بھی خوف سے لرز اُٹھتے ملّا صاحب نے منشور مبارک پڑھنا شروع کیا۔

دارالسلطنت شاہجہان آباد دہلی ۲ رجب المرجب ۱۰۷۰ھ

استاذی المکرّم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ اینجا خیر آنجا باد۔ امید ہے آں مخدوم والاتبار کے علم میں آچکا ہوگا کہ قضا و قدر نے اس بندۂ ضعیف کے کندھوں پر برِصغیر ہندوستان کی حفاظت کا گراں بار ڈال دیا ہے ؎

آسماں بارِ امانت نتوانست کشید
قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند

ظاہر ہے کہ جس ذمہ داری کی مسئولیت کے تصور سے فاروق اعظمؓ جیسے متبع خلیفۂ رسولؐ بھی لرز گئے۔ جس کے احساس نے عمر بن عبدالعزیزؒ کی نیند حرام کر دی تھی۔ یہ بندۂ ضعیف اس کے فرائض سے کیونکر عہدہ برآ ہو سکتا ہے جناب کی تربیتِ صالحہ سے جو سوجھ بوجھ پیدا ہوئی تھی اسکی روشنی میں حقوق اللہ

حقوق العباد بجا لانے کا ایک لائحہ عمل مرتب کر رکھا ہے۔

اسی پر لیل و نہار بسر ہو رہے ہیں۔ کتاب و سنت ہر لحظہ، ہر آن پیش نظر ہے۔ بایں ہمہ طبیعت کو تسکین نہیں ہوتی۔ جی چاہتا ہے کہ آں مخدوم محترم کی خدمت میں حاضر ہو کر طمانیت قلب اور اس عظیم ذمہ داری کو باحسن وجوہ نباہنے کیلئے توفیق کاملہ کی دُعا چاہوں۔ مگر سلطنت کے کاروبار ایک لحظہ بھی دم نہیں لینے دیتے۔ اپنی سواری کا خاص اونٹ روانہ ہے۔ براہ کرم نوازی دہلی تشریف لا کر اپنے شاگرد عزیز کو شرف نیاز سے مشرف فرمائیں۔ والسلام مع الاکرام

"محمد اورنگ زیب"

مُلّا احمد جیون خط پڑھ کر کچھ دیر فکر مند رہے اور پھر خود بخود یوں گویا ہوئے۔ "کاش اورنگ زیب کو معلوم ہوتا کہ اس کا اُستاد بھی اس سے کچھ کم مصروف نہیں۔ وہ دُنیاداری کی دلدل میں پھنسا ہے تو احمد جیون کو شریعت کی گرانباریوں نے احاطہ کر رکھا ہے۔ ہزاروں سیہ روحیں علم دین کے اکتساب کے لئے مور و ملخ کی طرح فیض کے اس چشمہ پر جمع ہیں انہیں کس کے سہارے چھوڑوں۔ کل کو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کو سنبھالنا ہے اگر ان کی تربیت میں کچھ نقص رہ گیا تو میں قیامت کے دن حضور (روحی فداہ) کو

کیا منہ دکھاؤں گا۔ ہاں البتہ رمضان شریف میں دہلی جا سکتا ہوں۔ ان ایام میں میرا مکتب بند ہوگا۔ اسلیے وارثانِ نبوت کی تعلیم میں کسی قسم کا ہرج واقع نہ ہوگا ——— !"

مہمان مہمان خانے میں کھانا تناول کر رہا تھا اور مُلّا احمد اس قسم کے خیالات میں محو تھے۔ دفعتہً آپ کا ذہن طلباء کی طرف منتقل ہوا جھرجھری لیتے ہوئے فرمایا۔ اوہو۔ وقت بیکار جا رہا ہے سبق ناغہ ہو جائیں گے۔ فوراً قلم ہاتھ میں لے دبیز کاغذ پر اس طرح سے جواب لکھنا شروع کیا۔

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

دارالعلوم امیٹھی ۶ رجب المرجب ۱۰۷۰ھ

فرزند دلبند محمد اورنگ زیب!

وعلیکم السلام۔ تمہارا خط ملا۔ تمہاری پریشانی بجا ہے رعایا کی آسودگی میں رات دن کوشاں رہو اور اس احساس کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑو۔ کیونکہ اسی میں تمہاری فلاح ہے میں رات دن اس فرزندِ عزیز کے لئے دست بدعا رہتا ہوں کہ اللہ جل شانہٗ و تعالیٰ ان عظیم ذمہ داریوں سے اس عزیز کو عہدہ برآ ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ تم جانتے ہو۔ کہ یہاں ہزاروں تشنگانِ دین الٰہی اصحاب صُفّہ کی طرح اس

نیاز مندی سے رشتے جوڑے پڑے ہیں ان پر علم دین کا دروازہ
کیونکر بند کروں۔ رمضان میں باوجود روزوں کی تکالیف کے
آں عزیز کو ملنے کے لئے سفر کروں گا۔ سواری کے لئے جو
اونٹ بھیجا ہے وہ واپس ہے۔ تعجب ہے کہ اپنے اُستاد
کے مزاج شناس ہونے کے باوجود آپ نے ایسی غلطی کیوں
کی۔ میں اپنی سواری پر اور اپنی مرضی سے آؤنگا۔ والسّلام

"مُلّا احمد جیون"

(۲)

دن گزرتے چلے گئے ——

ایک دن محی الملت اورنگ زیب عالمگیر عصر کی نماز پڑھنے کے لئے جو جامع مسجد میں تشریف لائے تو کیا دیکھا کہ مُلّا احمد جیون حوض پر بیٹھے وضو کر رہے ہیں۔ مسجد نمازیوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ بادشاہ صفوں کو چیرتا ہوا اُستاد کی خدمت میں پہنچا۔ اور انتہائی عقیدت سے قدموں پر جھک گیا شہنشاہت کو فقر کے آگے سرنگوں دیکھ کر لوگوں کی آنکھوں سے بے اختیار خوشی کے آنسو ٹپک پڑے۔ نماز سے فارغ ہو کر مُلّا احمد شہنشاہ کے ساتھ ہاتھی کی عماری پر سوار ہو کر قلعہ معلّیٰ میں تشریف لے گئے مغرب تک دیوان خاص میں پر لطف مذاکرہ جاری رہا۔ افطاری سے ذرا پہلے بادشاہ

نے پوچھا۔

"حضور کھانا غلام کے ساتھ کھائیں گے یا لنگرِ شاہی کو سرفراز فرمائینگے؟"

فرمایا —— "تمہارے ساتھ ہی کھانے کی تڑپ ہے۔"

شام کو دونوں شخصیتیں ایک ہی دسترخوان پر جلوہ افروز تھیں۔

خاصہ طلب ہوا۔ خادم نے گلی ظروف میں دال سے چپاتیاں کھانے کو پیش کیں۔ مُلّا احمد کھانا بھی کھا رہے تھے اور حضرت شاہ جہاں بادشاہ کے بارے میں استفسارات بھی کرتے جاتے تھے۔ بادشاہ انتہائی ادب سے اپنے بھائیوں کے ساتھ لڑی ہوئی جنگوں کے حالات بیان کر رہا تھا کھانا ختم ہوا تو ہاتھ دھونے کے بعد مُلّا احمد نے ایک موٹا سوتی کپڑا پیش کیا۔ فرمایا۔

"اسے میری والدہ نے وضو اور روزہ سے کاتا ہے اور ایک پرہیزگار نوربان نے اسے بُنا ہے۔ ہدیتہً لایا ہوں۔"

بادشاہ نے اسے ملازم خاص کے حوالے کیا۔ اور حکم دیا کہ یہ بابرکت کپڑا ہر وقت میرے ساتھ رہے تاکہ جب مروں تو اسی کا کفن نصیب ہو۔"

رمضان میں رات دن اورنگ زیب بادشاہ اور مُلّا احمد کی یکجا بسراوقات ہوتی رہی۔ دن کو پہر دن کے لئے جب دربار لگتا۔ تو اس میں بھی بادشاہ مُلّا احمد کو ساتھ لے جاتے اور اپنے ساتھ تخت طاؤس پر جگہ دیتے۔ رات کو تراویح کے بعد دیر تک مُلّا صاحب سے علمی مذاکرہ جاری رہتا۔ جس میں مُلّا نظام

اور پایۂ تخت کے دیگر اکابر علماء شریک ہوتے۔

عید الفطر پر مُلّا احمد نے نماز بادشاہ کے ساتھ ادا کی۔ اور پھر طالب رخصت ہوئے۔

وداع کرتے وقت بادشاہ نے ایک بار پھر پا بوسی کا شرف حاصل کیا اور جیب سے ایک روٹی نکال کر نذرانے کے طور پر پیش کی۔ مُلّا احمد نے بڑی خندہ پیشانی سے اُسے قبول کیا۔ اور اخلاص و محبت کی نشاط انگیز فضا میں اپنے بلند اقبال شاگرد کو خدا حافظ کہہ کر گھر کو روانہ ہوا۔

(۳)

انہی ایام میں جنوبی ہند سے اورنگ زیب کو متوحش خبریں پہنچیں اور بادشاہ قشونِ قاہرہ کے ساتھ اُدھر کو روانہ ہو گیا۔ چودہ برس کامل ان مہموں پر صرف ہو گئے جب بادشاہ دہلی واپس آیا تو وزیر اعظم نے رپورٹ کی کہ "مُلّا احمد جیون بہت بڑا زمیندار بن چکا ہے اگر اجازت ہو تو اس سے لگان وصول کیا جائے"۔

اس خبر نے بادشاہ کو حیرت میں ڈال دیا کہ ایک غریب الحال بوریہ نشین عالم امیر کبیر کیسے بن سکتا ہے۔ اُسے اُستاد سے ملنے کا اشتیاق تو تھا ہی، اس خبر نے تو سن اشتیاق پر مہمیز کا کام کیا۔

اسی وقت ایک نیاز نامہ اپنے قلم سے مُلّا احمد کو تحریر کیا کہ:-

حضرت کو ملے کافی عرصہ ہو چکا ہے۔ نیاز مند دکن کی مہمات میں اس قدر الجھا کہ پایۂ تخت کو کبھی واپس نہ آسکا۔ اُمیدوار ہوں کہ بدستور سابق تشریف لا کر اپنے قدوم میمنت لزوم سے سرفراز فرمائیں۔"

رخصتوں کی تقریب دیکھ کر مُلّا احمد دہلی تشریف لے آئے۔ بادشاہ نے انتہائی محبت سے انہیں اپنے ہاں ٹھہرایا اور رمضان کے لیل و نہار اخلاصِ اللہ کے جذبات میں بسر ہونے لگے۔ مُلّا احمد کا لباس اُسی طرح سادہ تھا۔ اُنکے لب و لہجہ اور طور و اطوار سے وہی سادگی نمایاں تھی۔ باوجود اشتیاق مالا یطاق کے بادشاہ کو یہ جرأت نہ ہوئی کہ مُلّا صاحب سے دریافت کر سکے کہ انکی بابت تمول کی جو داستان مشہور ہو گئی ہے۔ اس میں کہاں تک صداقت ہے ایک دن خود مُلّا صاحب نے فرمایا کہ آپ سے جو دونی لے کر گیا تھا وہ کوئی بہت ہی بابرکت تھی۔ میں نے اُس سے بنولے خرید کر کپاس کاشت کی خدائے عزّوجل نے اس میں اتنی برکت ڈالی کہ چند سالوں کے اندر ہی اندر سینکڑوں سے لاکھوں ہو گئے۔"

بادشاہ نے مسکرا کر کہا۔ اگر ارشاد ہو تو دونی کی داستان عرض کی جائے۔"

مُلّا صاحب کا اشتیاق بڑھ گیا۔ فرمایا "ضرور سنوں گا۔"

شہنشاہ نے خواجہ سرا کو حکم دیا کہ سیٹھ اتم چند کو اطلاع دی جائے

کہ وہ ۱۰۶۹ء کا بہی کھاتہ لاکر پیش کرے۔"

خواجہ سرا کو اُتم چند کا پتہ معلوم نہ تھا۔ اس لیے وہ ذرا رُکا اور جہاں پناہ پر نظر کی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اُتم چند کے بارے میں اور وضاحت چاہتا ہے۔

فرمایا۔ چاندنی چوک میں مسجد فتح پوری کے بائیں جانب جو کوچہ چلا گیا ہے۔ اس میں چوتھے نمبر کا مکان اسی کا ہے۔"

خواجہ سرا ادب سے رجعت قہقہری کرتا ہوا واپس چلا گیا۔ اور بادشاہ مُلّا احمد سے فتاویٰ عالمگیری کی بابت تبادلہ خیالات کرنے لگا۔

(۴)

اورنگ زیب کی سیاست مشہور تھی۔ اس کے سامنے آتے ہوئے بڑے بڑے امراء کا زہرہ آب آب ہوتا تھا۔ اُتم چند ایک اوسط درجے کا بنیا تھا۔ اُسے جب حاضر ہونے کی اطلاع پہنچی تو وہ سخت فکرمند ہوا۔ ۱۰۶۹ء کے بہی کھاتہ کو اُٹھا کر بار بار پڑتال کی۔ اُس کے اوراق کو جھاڑا۔ اور صاف ستھرا کر کے بغل میں دبا کر قلعہ کو روانہ ہوا۔

خواجہ سرا اُسے اردو بازار اور دیوان عام کی سیر کراتا ہوا دیوان خاص میں لے گیا۔ بادشاہ وظیفہ میں مصروف تھے۔ کچھ دیر انتظار کی جب حضور فارغ ہوئے تو اُسے پیش کیا۔

بنیا رعب شاہی سے کانپ اٹھا۔ ڈنڈوت کے لئے جھکنا چاہتا تھا۔ مگر خواجہ سرا نے تھام لیا۔

بادشاہ نے مسکرا کر بنیئے پر نظر ڈالی اور فرمایا۔

"گھبراؤ نہیں۔ آگے بڑھو سن ۱۰۶۹ھ کا کھاتہ کھول کر خرچ کی تفصیل عرض کرو۔"

بنیئے نے ہڑبڑا کر روزنامچہ کھولا۔ اور تاریخ اور خرچ کی تفصیل پڑھنے لگا۔ یہاں تک کہ ایک مقام پر آکر رک گیا۔

یہاں ایک دونّی درج تھی۔ مگر اس کے محاذ میں لینے والے کا نام نہیں تھا۔ شہنشاہ نے ملائمت سے پوچھا۔

"ہاں! بولو۔ یہ دونّی کہاں گئی ——————؟"

اُتم چند نے روزنامچہ بند کر کے رکھ دیا۔ ایک آہ جگر دوز کھینچی اور یوں عرض گذار ہوا۔

"جہاں پناہ! یہ ایک درد بھری داستان ہے اگر حضور اجازت دیں تو عرض کی جائے!"

"ہاں —— ! ما بدولت اسے شوق سے سنیں گے ——————!" شہنشاہ نے معنی خیز نظروں سے گھورتے ہوئے فرمایا۔

---

(۵)

پوہ کی ایک تاریک رات کا واقعہ ہے۔ کہ پہر رات گذرے جمنا کی جانب سے شہر پر گھٹا چڑھ آئی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے مُوسلا دھار برسنے لگی میرا مکان اگرچہ پختہ تھا مگر نیا نیا بنا تھا۔ اُس نے بارش دیکھی نہ تھی بمشکل دو گھنٹے گذرے ہوں گے کہ اس نے ٹپکنا شروع کر دیا۔ میرا قیمتی سامان بھی کھاتے، بال بچے سب اسی میں تھے۔ میں نے بڑی کوشش کی۔ مگر مکان کا ٹپکنا بند نہ ہوا۔ بلکہ جگہ جگہ سے ٹپکنا شروع ہو گیا۔ میں نے گھبرا کر باہر جھانکا تو مجھے ایک آدمی سرکاری لالٹین کے نیچے کھڑا نظر آیا۔ میں سخت متعجب ہوا کہ آدھی رات گذرے کون شخص ہو سکتا ہے۔ جو کسی مکان میں پناہ لینے کی بجائے ایسی کھلی جگہ پر کھڑا ہے۔ جہاں بارش کی بوچھاڑ بُری طرح سے پڑ رہی ہے۔ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں پُکارا۔

"بھلے میاں! مزدوری کرو گے ——— ؟"

جواب ملا۔ "کیوں نہیں ——— !"

میں نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔ "چڑھ آؤ ——— !"

میں یہی کہوں گا کہ وہ آدمی نہیں تھا، بلکہ خدا کا بھیجا ہوا کوئی فرشتہ تھا۔ جس نے بروقت پہنچ کر میری امداد کی۔ ورنہ ہم سب تباہی کے قریب پہنچ چکے تھے۔

وہ نیک مردِ کامل تین چار گھنٹے انتہائی بہادری اور جفاکشی کے ساتھ کام کرتا رہا تب کہیں جا کر چھت درست ہوئی۔ پھر اس نے اندر کا سامان درست کیا۔ ہم سب حیرت سے کھڑے تکتے رہے اور وہ مشین کے انجن کی طرح کام میں معروف تھا۔ اتنے میں فتحپوری مسجد سے آذان کی آواز آئی۔ اس آدمی نے کام چھوڑ کر آذان سنی۔ اور ہر ہر کلمے کو موذن کے ساتھ دہراتا رہا۔ جب آذان ختم ہوئی تو اس نے انتہائی نیاز کے ساتھ دعا مانگی۔ پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔

"سیٹھ صاحب! آپ کا کام ٹھیک ٹھاک ہو چکا ہے۔ اب مجھے اجازت دیجیے۔ تاکہ میں کپڑے بدل کر کسی مسجد میں نماز ادا کر دوں"۔

میں نے کہا۔ "واقعی میرا کام آپ نے ختم کر لیا ہے۔ لیکن آپ کو دینے کے لئے سوائے دونی کے میری جیب میں اور رقم نہیں ہے۔ آپ صبح کو دکان پر آجائیں میں منہ مانگا انعام دونگا۔

اُس نے ہاتھ بڑھا کر کہا۔ "مجھے یہی دونی کافی ہے۔ میں پھر حاضر نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ مجھے کہیں اور جگہ جا کر کام کرنا ہے"۔ میں نے دوبارہ سہ بارہ اصرار کیا۔ میری بیوی نے بھی منت سماجت کی لیکن وہ راضی نہ ہوا۔ بولا "دیتے ہو تو یہی دونی دے دو ورنہ میں جاتا ہوں"۔

مجبوراً میں نے جیب سے دونی نکال کر اُس کے ہاتھ پر رکھ دی۔ اور وہ لیکر صبح کے دھندلکے میں غائب ہو گیا۔ ہم دیر تک کھڑکی سے جھانک کر اُسے دیکھتے رہے

وہ فتحپوری مسجد کی طرف ہی گیا تھا۔ اس کے بعد میں نے اُسے بہتیرا ڈھونڈا۔ یزدواڑ میں جا کر تلاش کیا۔ مگر وہ نہیں ملا۔ تقریباً پندرہ برس ہو چکے ہیں۔ پوہ کی رات مکان کا ٹپکنا، اجنبی کا ساری رات کام کرنا اور پھر روٹی لے کر گم ہو جانا نہیں بھولتا۔ رہ رہ کر میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا ہے کہ اگر دو پلے نہ تھے اشرفیاں تو موجود تھیں، ایک اشرفی ہی دیدیتا۔

اُتم چند نے یہ داستان ختم کرنے کے بعد۔ ہاتھ جوڑ کر شہنشاہ کو پرنام کیا۔ بادشاہ نے دست مبارک سے خلعت فاخرہ مرحمت کر کے اُتم چند کو رخصت فرمایا جب وہ روانہ ہو گیا تو شہنشاہ نے مسکرا کر مُلّا احمد پر نظر ڈالی۔ مُلّا صاحب فرطِ محبت سے جھوم اُٹھے۔ بولے۔

"واہ اورنگ زیب! تو نے کمال کر دیا۔ میرا پہلے سے ہی یہی خیال تھا۔ کہ شاگردِ بلند اقبال نے یہ خود کما کر ہی نظر گزاری ہے، ورنہ اس سے سینکڑوں اور لاکھوں کیونکر بنتے۔"

شہنشاہ نے انتہائی عقیدت سے عرض کی کہ "یہ حضرت کے فیض تربیت کا ہی نتیجہ ہے۔ کہ اورنگ زیب ذاتی خرچ کیلئے خود کما لیتا ہے اور خزانہ عامرہ سے کچھ نہیں لیتا۔ اگر حضرت کی دعا شاملِ حال نہ ہوتی تو مجھے یہ توفیق کیونکر ہوتی۔"

مُلّا احمد جیون نے حیران ہو کر پوچھا۔

"اورنگ زیب! امورِ سلطنت سے تمہیں اتنی فرصت کیونکر مل جاتی ہے؟"

عرض کی۔ حضرت! جب سے غلام نے دہلی کے تخت پر قدم رکھا ہے رات کے دو گھنٹے روزی کمانے کیلئے وقف کر رکھے ہیں۔ ایک گھنٹہ میں قرآن مجید لکھتا ہوں اور دوسرے گھنٹہ میں ٹوپیاں سیتا ہوں ہفتہ میں دو راتیں شہر کی دیکھ بھال میں صرف ہوتی ہیں جس رات اُتم چند کے گھر کا کام کیا۔ وہ میرے بھیس بدل کر شہر میں پھرنے کی رات تھی۔ بالعموم گھٹا ٹوپ راتوں میں ہی چوری کی وارداتیں ہوا کرتی ہیں۔ میں اس بازار کو دیکھتا پھرتا تھا کہ دفعتہً بارش شروع ہوگئی۔ میں اُتم چند کے مکان کے بالکل سامنے ایک دکان میں دبکا کھڑا تھا۔ اس کے بچوں کے چیخنے چلّانے کی آواز سن کر میں باہر نکل آیا۔ سرکاری چراغ کے نیچے اور مینہ کی بوچھاڑ میں ادھر کان لگائے کھڑا تھا کہ اُتم چند نے کھڑکی کھول کر مجھے مخاطب کیا خدا کا لاکھ شکر ہے کہ اس نے میرے فانی وجود سے ایک ضرورت مند کی ضرورت پوری کرائی۔ اور حضرت یہ سن کر بھی یقیناً خوش ہوں گے کہ ناچیز نے تخت نشین ہونے کے بعد ہی قرآن حفظ کیا ہے۔ صحیح بخاری کا متن بھی یاد ہے۔

اورنگ زیب اور مُلّا احمد میں اسی قسم کی راز و نیاز کی باتیں ہو رہی تھیں کہ موتی مسجد سے آذان کی آواز آئی اور فقر و شہنشاہی کے دو حسین پیکر نماز کے لئے کھڑے ہو گئے ٭

اورنگ زیب کی اصلی تصویر

روایت

سردار محمد بخش خاں صاحب زمیندار جگووالہ

اورنگ زیب کو دنیا نے بہت کچھ دیکھا ہے۔ مگر پھر بھی جو
دیکھنے کا حق ہے۔ اتنا کسی نے نہیں دیکھا۔ اس کا
رعایا کے دلوں پر کتنا رعب تھا۔ اور اسے اپنے خدا پر
کتنا بھروسہ تھا۔ اس کی جھلک اس افسانے میں
دیکھیے۔

(۱)

صدائے عنیف ______

اچانک ایک طرف سے صدائے عنیف سنائی دی۔کسی جانور کے بدکنے کی آواز پر تمام آدمیوں کی نظریں بے اختیار اُدھر کو اُٹھ گئیں ایک گائے انتہائی درد و کرب سے چلاتی ہوئی ادھر کو بیکل چلی آتی تھی۔اس کا آدھا کٹا ہوا سر زمین سے گھسٹ رہا تھا۔راجپوت حیرت سے چلا اُٹھے "گاؤ ہتھیا" گائے قریب آکر زمین پر گر پڑی اور سرد ہو گئی۔جسونت سنگھ دم بخود کھڑا گائے کی لاش کو دیکھ رہا تھا۔اس کی پھٹی پھٹی آنکھیں اپنی مظلومیت کی داستان سُنا رہی تھیں۔راجہ یہ منظر دیکھ کر بے قرار ہو گیا ایک راجپوت نے چیخ کر کہا مغل بادشاہ ہمارے جذبات کی یہ قدر کر رہا ہے!

دوسرا بولا "مہاراج! ظلم کی حد ہو گئی۔

جسونت سنگھ کا چہرہ غصہ سے لال چقندر ہو گیا۔تلوار نیام سے نکالی اور غصہ سے مونچھوں کو چباتے ہوئے بولا۔

اس تلوار سے مغل بادشاہ کا کام تمام کر دیا جائیگا۔!

راجپوتوں کی آنکھیں فرطِ مسرت سے چمک اُٹھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ ان کے سروں سے بڑا بوجھ ہٹ چکا ہے۔ سب نے مل کر آشیرباد دی۔ پرماتما مہاراج کی سہائتا کرے۔!

(۲)

اُلٹی کھوپڑی ———

اورنگ زیب اعظم مثمن برج سے راوی کی سیماب خرامی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ کہ اچانک ان کی نگاہ بادامی باغ کی طرف پھر گئی۔ راجپوتوں کا ایک رسالہ بڑی پھرتی سے پریڈ کر رہا تھا۔ ان کی زرد پگڑیاں عجیب دلفریب منظر پیش کر رہی تھیں۔ بادشاہ نے اسد خاں وزیرِاعظم سے مخاطب ہو کر کہا۔

"نواب صاحب! راجپوتوں کی پریڈ ملاحظہ ہو۔ کتنا اچھا کام کر رہے ہیں ———؟"

"چستی۔ بے باکی اور بہادری اس قوم کا شعار ہے۔" اسد خاں نے متانت سے جواب دیا۔

"ہاں مگر جہاں پناہ کو راجہ جسونت سنگھ کے تازہ ارادے کی بھی اطلاع ہے؟" وزیرِاعظم نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"وزیرِاعظم اطمینان رکھیں۔ ہندوستان کا تاجدار اتنا بے خبر نہیں ہے" اورنگ زیب نے اسد خاں کو معنی خیز نظروں سے گھورتے ہوئے جواب دیا۔

مگر جہاں پناہ نے اس شیخی خورے کے خلاف کوئی تادیبی کاروائی بھی تو نہیں فرمائی۔" رحمدل سلاطین ایسی لاف وگزاف پر آپے سے باہر نہیں ہوا کرتے۔"
حضور والا کا ارشاد سر آنکھوں پر لیکن جلال الدین خلجی کی حکومت کو اسی قسم کے شیخی خوروں نے ہی کمزور کیا تھا ——— !
"جلال الدین اور اورنگ زیب میں بڑا فرق ہے اسد خاں! ہم نے جسونت کو کھلے بندوں نہیں چھوڑ دیا۔ اس کے ہر لمحہ کی روئیداد وزیر اعظم کو تکالیف دیئے بغیر ہمیں پہنچ رہی ہے اور ہم نے اس کی لاف زنی کا علاج بھی سوچ لیا ہے۔ یہ اُلٹی کھوپری کے لوگ ہیں۔ ان سے حکمت عملی کے بغیر گذارا نہیں ہو سکتا ——— !"
شہنشاہ کی نظریں پھر راجپوتوں کے رسالے پر گڑ گئیں اب جودھپوری پلٹن جے پوری لشکر سے نقلی جنگ میں مصروف تھی۔ دونوں رسالے آپس میں اس طرح گتھم گتھا ہو رہے تھے۔ کہ نقل پر اصل کا دھوکہ ہوتا تھا پختہ کار شہنشاہ اور دیرینہ سال وزیر اس نظارہ سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ دفعتہً بادشاہی مسجد سے عصر کی اذان آئی جس پر برصغیر کا تاجدار اپنے دانا وزیر کو ہمراہ لیے۔ مالک الملک کے حضور میں سر بسجود ہونے کے لیے روانہ ہو گیا۔

(۳)

اعلان شاہی ————

دفعتہً شہر میں اعلان ہوا کہ بادشاہ سلامت کل دس بجے شاہدرہ کے شاہی محل میں امرائے دربار کو ملاقات کا شرف عطا کریں گے۔ دوسرے دن ۹ بجے سے محل کے قریب اجتماع ہونے لگا۔ تمام راجپوت اور مسلمان امراء آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔ مگر کسی پر ملاقات کی غرض ظاہر نہ ہوتی تھی۔ سب سے تعجب خیز امر یہ تھا۔ کہ محل سے پچاس پچاس گز تک کسی سپاہی، نقیب اور چوبدار کو ٹھہرنے کی اجازت تک نہ تھی۔

ٹھیک دس بجے شہنشاہ کی سواری آئی۔ اور اورنگ زیب اعظم اپنے پروانوں اور جاں بازوں کا سلام لیتا محل میں داخل ہو گیا۔ چند ساعت گزرنے پر اسد خاں وزیر اعظم نے ملاقاتیوں کو ترتیب سے محل کی ڈیوڑھی پر بٹھا دیا۔ پہلے شہزادوں کو شرفِ ملاقات حاصل ہوا اس کے بعد ہندوستان کے راجے مہاراجے اور نواب فرداً فرداً جاتے رہے۔ تقریباً پانچ پانچ منٹ ملاقاتی کو ملتے تھے اس کے واپس آنے پر دوسرا ملاقاتی اندر جاتا تھا۔ دوپہر کو وزیر اعظم نے مہاراجہ جسونت سنگھ کا نام لے کر پکارا۔ ہجوم سے ایک بانکا ترچھا راجپوت سردار نکل کر وزیر اعظم کے پاس پہنچا۔ وزیر نے تلاشی لے کر ہتھیار وغیرہ رکھوا لئے اور وہ

ایک خواجہ سرا کے ہمراہ شہنشاہ کی خدمت میں بھیج دیا گیا۔

(۴)

تخلیہ

جسونت نے رعب شاہی سے لرزتے ہوئے کمرے میں قدم رکھا اس کی نگاہیں موجودات کا جائزہ لینے کے لئے اوپر کو اُٹھیں۔ سامنے برصغیر ہندوستان کا مطلق العنان تاجدار تخت شاہی پر جلوہ گر تھا۔ کمرے میں سوائے چند کرسی میزوں کے اور کوئی چیز نہ تھی۔

جسونت سنگھ کورنش بجا لانے کے لئے کمان کی طرح جھک گیا۔

آؤ راجن! زیادہ جھکنے کی ضرورت نہیں۔ ہم سب خدا کے بندے ہیں۔ ہمیں صرف اُسی کے حضور میں جھکنا اور سجدہ کرنا چاہیئے۔ بادشاہ نے جسونت سنگھ کے سراپا پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

راجہ دو قدم آگے بڑھ کر شہنشاہ کے روبرو ادب سے کھڑا ہو گیا۔

جسونت سنگھ بہت بڑا راجہ تھا۔ اس نے شاہ جہاں کے دربار میں لمبا سال بڑے ٹھاٹھ سے گذارے تھے۔ وہاں اس پر کسی قسم کا رعب یا خوف و ہراس طاری نہیں ہوتا تھا۔ مگر اورنگ زیب کے حضور میں پیش ہونے پر اس کا کلیجہ کانپ اُٹھتا تھا۔ اور اس کو بادشاہ سے نظریں چار کرنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی۔ کہ جنگ تخت نشینی میں اس نے

دارا شکوہ اور سلطان شجاع کا ساتھ دیا تھا۔ مگر اس کے باوجود سیر چشم اور فیاض شہنشاہ نے اُسے نہ صرف معاف کیا بلکہ کابل کی صوبیداری پر فایز کیا۔ عنقریب وہ روانہ ہونے والا تھا۔ کہ یہ واقعہ ظہور میں آگیا۔

"راجہ جیو! ذرا محل کے باہر چل پھر کر اس امر کی تسلی کر لیجیے کہ کوئی آدمی تو قریب موجود نہیں ———— ؟"

جسونت سنگھ رجعت قہقری کرتا باہر نکلا۔ اور چاروں طرف چل پھر کر واپس آگیا۔

"جہاں پناہ! پچاس گز تک کوئی آدمی نظر نہیں آتا۔!"

"خوب"

بادشاہ سلامت اپنی شیروانی کے بٹن کھولنے کی کوشش کر رہے تھے۔

"اُف! بٹن بہت سخت ہیں، جسونت! ذرا انہیں کھول دینا۔!"

راجہ نے آگے بڑھ کر دونوں ہاتھوں سے بٹن کھولنے کی کوشش کی مگر بٹن کھل نہ سکے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا جان بوجھ کر انہیں کس کے لگایا گیا ہے۔

راجہ ہار کر بیٹھ گیا۔

ہم نے کہا نہ تھا کہ بڑے سخت ہیں۔ بادشاہ نے ہنس کر کہا۔ لیکن

ذرا ٹھہرنا۔ شہنشاہ نے ہاتھ لمبا کر کے تلوار اُٹھائی اور کہا۔ لو ——— اس تلوار سے بٹن کا تاگہ ہی کاٹ دو۔

راجہ نے تلوار لے کر اس سے بٹن کے تاگے کاٹ دیئے۔ شیروانی کھل گئی۔ راجہ نے تلوار مسندِ شاہی کے آگے رکھ دی اور خود ادب سے پیچھے ہٹ گیا۔

(۵)

ندامت ———

شہنشاہ پر غضب کے آثار ظاہر ہوئے۔ آنکھوں کی پتلیاں تیزی سے گردش کرنے لگیں۔ اس وقت بادشاہ بپھرے ہوئے شیر کی طرح گرج رہا تھا۔

"جسونت ——— !"

"عالم پناہ ——— !"

"جسونت ——— !"

"جہاں پناہ ——— !"

"جانتے ہو یہ دربار کیوں لگایا ——— ؟"

جہاں پناہ ہی بہتر جانتے ہیں۔ خداوند! جسونت نے گھبرا کر جواب دیا فرطِ رعب سے راجہ کا بدن کانپ رہا تھا۔

"نہیں معلوم تو سنئے ——— !"

"ہمیں بتایا گیا تھا کہ ہمارے جانباز ملازم نے ہمارے قتل کا بیڑا اٹھایا ہے۔ ہم بہت خوش ہوئے کہ ایک سپاہی کی مردانگی کے جوہر دیکھنے کا موقعہ ملے گا۔ ہم نے دس نہیں بیس یوم تک انتظار کی۔ مگر راجپوت کی تلوار نیام سے باہر نہ نکلی۔

——— ہم نے سوچا۔ کہ شاید سپاہی موقع کی تلاش میں ہے اسلئے موقع بھی پیش کر دیا۔

——— ایسی جگہ جہاں پچاس گز کے فاصلے تک جہاں کوئی متنفس موجود نہیں تھا۔ اس کی تسلی آپ نے بھی کر لی تھی۔

——— تم آتے۔ مگر مردوں کی طرح بے حس و حرکت آکر کھڑے ہو گئے۔

——— ہم نے خیال کیا۔ کہ راجپوت سورما شاید تلوار سے خوف کھا رہا ہے۔ ہم نے تلوار الگ کر دی۔ مگر پھر بھی تم میں زندگی کے آثار نظر نہ آتے۔

خیال گذرا۔ شاید حملہ آور ایں جانب کے فرسودہ پنجر کو زیادہ تنومند اور طاقتور جان کر حملہ کرنے سے ہچکچا رہا ہے۔ چنانچہ بٹن کھولنے کو کہا۔ ہم بند گلے کا کوٹ محض اسی لئے پہن کر آتے تھے۔ تم دیر تک بٹن

کھو لنے کے لئے جد وجہد کرتے رہے ۔ میں سمجھتا تھا ۔ کہ اب تم ضرور میرا گلا دبانے کی کوشش کرو گے ۔ لیکن پھر بھی تم سے کچھ نہ ہو سکا ۔

اب ہم نے تلوار اٹھا کر دی اور تم نے بٹن کے تاگوں کو کاٹنے کیلئے اسے دو تین دفعہ ہمارے گلے پر پھیرا ۔ لیکن ہمیں قتل کئے بغیر تم نے تلوار واپس کر دی ۔ کیا کوئی شخص اپنے قاتل کو اس سے زیادہ مواقع بہم پہنچا سکتا ہے ———— ؟

تو کیا اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ حافظ حقیقی کی ذات پاک ہم جیسے عادل سلاطین کی حفاظت خصوصی طور پر کیا کرتی ہے ۔ ورنہ کیا یہ ممکن ہے کہ تم جیسے کینہ توز قاتل کو اتنے مواقع ملیں ۔ اور تم ان سے فائدہ نہ اٹھاؤ !"

جسونت سنگھ کی آنکھیں فرط ندامت سے اشکبار ہو گئیں ۔ ہاتھ جوڑ کر بولا ۔ جہاں پناہ ۔ معاف کیجئے ۔ مجھ سے بھول ہوئی ۔

بادشاہ نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے فرمایا ۔

"ہاں ———— تم نے یہ کیسے فیصلہ کر لیا ۔ کہ تمہارے جذبات مجروح کرنے کے لئے ہی نیم بسمل گائے کو ادھر کی جانب چھوڑا گیا ہے ! تمہیں معلوم ہے کہ اس قصاب ، کا کیا حشر ہوا ۔ جس نے اس گائے کو اس غفلت سے ذبح کیا تھا ۔

بادولت نے ہمیشہ کے لئے اس کا مذبح کا اجازت نامہ ضبط کر دیا ۔

اور اسے اس غفلت کے جرم میں بیس کوڑے لگائے۔ اس سے زیادہ سزا کیا دی جاسکتی تھی ------؟

اگر تمہیں یہ صورت دیکھ کر دُکھ ہوا تھا۔ تو اس کی ماں بدولت کو اطلاع کرتے۔ لیکن ہمارا خون تم نے کس طرح حلال سمجھ لیا ؟

ہم آپ کو کابل جیسے اہم صوبے کی حکومت عنایت کرتے ہیں کل ہی اپنے لشکر سمیت تشریف لے جائیے۔ اور آئندہ ایسی فضول باتیں بھول کر بھی نہ کیجئے ------!"

شہنشاہ محی الدین اورنگ زیب عالمگیر راجہ جسونت سنگھ کے ہمراہ محل سے باہر نکلے۔ وزیر اعظم اسد خاں نے اعلان کیا آج کا اجلاس ختم۔ باقی امراء سے جہاں پناہ کبھی پھر ملاقات فرمائیں گے ۔

مغلوں کی سزائیں

ماخذ

تاریخی لطیفے

فدوی کی ناقص رائے یہ ہے کہ اگر نظام الملک کے کمرے میں کسی جاہل آدمی کو بند کر دیا جائے۔ تو یہ سزا اس پر گوالیار کے قلعہ کی قید سے بھی زیادہ شاق گذرے گی کیونکہ وزیر حد درجہ عالی دماغ اور نازک مزاج ہے۔ وہ جہالت کی باتوں کا کبھی متحمل نہ ہو سکے گا ————

"امیر خاں"

(۱)

مطالبہ ______

"دیکھیے نواب صاحب! جب تک آپ پوری رقم ادا نہ کریں گے رہائی ناممکن ہے ______!"

"عزیز من! گھر میں جو کچھ تھا وہ پیش کر دیا۔ اب باقی کہاں سے لاؤں ______!"

"آپ کا ارشاد بجا ہے۔ لیکن دربار کا رنگ آپ دیکھ چکے ہیں بادشاہ اور امرائے سلطنت سے کسی نیکی کی توقع رکھنا فضول ہے ______!"

"محی الدین خاں! اگر اسی ہزار کے پیچھے جہاں پناہ مجھے عذاب دینا گوارا فرماتے ہیں۔ تو غلام کو کیا عذر ہو سکتا ہے۔ آپ جا کر کہہ دیں کہ نظام الملک نے اپنے گھر کی آخری کوڑی تک نذر کر دی ہے۔ باقی رقم کہاں سے ادا کرے ______!"

"بہتر میں ابھی حضور میں جا کر عرض کرتا ہوں۔ لیکن آپ اپنے جواب

پر ایک دفعہ اور غور فرما لیں ــــــــ!" محی الدین خاں نے نظام الملک کے افسردہ چہرے پر نظریں گاڑتے ہوتے کہا "میں نے سوچ لیا ہے" یہ کہہ کر نظام الملک زنداں خانے کی کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا اور جمنا کی سیماب خرامی کا نظارہ کرنے لگا۔ محی الدین خاں ادب سے سر جھکا کر باہر نکل گیا۔ اور پہرے دار نے فولادی دروازے کو بند کر کے وزنی قفل ڈال دیا۔

۲

بڈھےــــــــ

محمد شاہ شہنشاہ ہند دیوان خاص میں تخت طاؤس پر بیٹھے نواب امیر خاں اور دیگر امرائے دربار کے ساتھ امور ملکی پہ بحث کر رہے تھے۔ کہ محی الدین خاں نے حاضر ہو کر کورنش عرض کی۔ "رقم لے آئے ــــــــ؟" بادشاہ نے فکرمند ہو کر پوچھا۔

"عالم پناہ ــ! آپ کا بوڑھا نمک خوار وزیر اپنی دامنی کا عذر پیش کرتا ہے" یہ کہہ کر محی الدین خاں رجعت قہقری کرتا ہوا اپنے مقام پر جا کھڑا ہوا۔

"یعنی وہ باقی رقم دینے سے انکاری ہے۔؟" بادشاہ نے امیر خاں کی طرف معنی خیز نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔

"میرے خیال میں قلعہ سلیم گڈھ وزیر کو پسند آگیا ہے۔ اس لئے تنز

ہیں کچھ تبدیلی ہونی چاہیئے۔" امیر خاں نے مسکرا کر عرض کیا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو امیر خاں! نظام الملک کو سلیم گڑھ سے نکال کر قلعہ گوالیار بھیج دیا جائے۔ وہاں ایک مہینہ میں اس کے ہوش ٹھکانے آجائیں گے۔۔!"

فدوی کی ناقص رائے یہ ہے۔ کہ اگر نظام الملک کے کمرے میں کسی جاہل آدمی کو بند کر دیا جائے۔ تو یہ سزا اس پر گوالیار کی قید سے بھی زیادہ شاق گذرے گی کیونکہ وزیر حد درجہ عالی دماغ اور نازک مزاج ہے۔ وہ جہالت کی باتوں کا کبھی متحمل نہ ہو سکے گا۔" امیر خاں نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

ٹھیک ہے! کسی ایسے کندہ ناتراش کو بھیجو۔ جو وزیر کے سامنے بے تکلف بک سکے ———— !!

"حضور بے فکر رہیں۔ میرے خیال میں اس مقصد کے لئے بدّھو سے زیادہ موزوں اور کوئی آدمی نہیں ہو سکتا۔ میں جا کر اس کو ہی سلیم گڑھ میں بھجوا تا ہوں۔"

امیر خاں کو نظام الملک سے ذاتی عناد تھا۔ اور اس کی وجہ سے ہی اُسے یہ دن دیکھنا نصیب ہوا تھا۔ اس نے نوکر کو بھیج کر بدّھو کو بلوا بھیجا۔

"بدھو" پاگلوں کی طرح واہی تباہی بکتا اور قہقہے لگاتا پیش ہوا امیر خاں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "بدھو آج تمہیں ہم نظام الملک پاس سلیم گڈھ کے قلعہ میں بند کر رہے ہیں۔ جو تیرے جی میں آئے۔ وہاں سب بے تکلف بکتے رہنا اور وزیر کی قدر و منزلت کا کچھ خیال نہ کرنا۔ ساتھ ہی دس اشرفیاں اس کی جیب میں ڈال دیں۔

بدھو نے اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد کہا۔ آپ تسلی کریں۔ اگر نظام الملک کو پاگل نہ بنادوں تو سر اُتار لینا۔ یہ کہہ کر بدھو اپنی عادت کے مطابق لاف و گزاف بکتا خواجہ سرا کے ہمراہ سلیم گڈھ کو چلا گیا۔ بدھو۔ امیر خاں کے دربار سے خفیہ طور پر تنخواہ پاتا تھا۔ اور جان بوجھ کر پاگل بنا رہتا تھا۔ اس سے امیر خاں کو شہر کے چپہ چپہ کی صحیح کیفیت معلوم ہوتی رہتی تھی۔

(۳)

صحبتِ ناجنس ــــــــــ

بدھو نے وزیر کے کمرے میں پہنچتے ہی خلاف قاعدہ کہا۔

"وعلیکم السلام ــــــــ!"

نظام الملک نے حیرت سے سر اٹھا کر نووارد کو دیکھا۔ کہ یہ کون حضرت ہیں جو بجائے سلام کے وعلیکم کہہ رہے ہیں۔ ابھی وہ خاموش ہی تھا۔

کہ بدھو نے پھر زبان کھولی۔ کہا۔

"تو کتنا نادان عہدہ دار ہے۔ کہ مراسیم دربار سے بھی واقف نہیں۔ مناسب تھا۔ کہ جونہی بادولت یہاں تشریف لائے تھے۔ کھڑے ہو کر "السلام علیکم" عرض کرتے۔ لیکن تم نے از روئے جہالت اس امر سے گریز کیا جس پر بندگانِ عالی کو براہِ دعایا پروری وعلیکم السلام کہنا پڑا۔

دوسرا یہ کہ تم بادولت سے اسم گرامی دریافت کرنے تو نہیں وہ بھی نہیں کیا۔ بہر کیف تم بڑے ہی نالائق ہو۔

آخر الامر میں ہی تم سے سوال کرتا ہوں۔ کہ تمہیں لوگ کس نام سے پکارتے ہیں۔

نظام الملک کو جب اور کوئی چارۂ کار نظر نہ آیا۔ تو کہا۔

مجھے لوگ نظام الملک کہتے ہیں۔

"نظام الملک!" نووارد نے ناک بھوں چڑھا کر کہا۔ یہ تو غیر مناسب نام ہے اتنے بڑے آدمی کا اتنا ناموزوں نام! ہم آج سے تمہیں نظام الباقلہ کا پر شوکت لقب عطا فرماتے کیونکہ "ملک" سیاہ رنگ کا چھوٹا سا غلہ کی قسم کا دانہ ہے اور باقلہ لمبے لمبے پات کی گھاس ہے۔ جسے سبزی کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ لمبے آدمیوں کے لئے یہ چھوٹا پنے کے الفاظ حقارت کا باعث ہیں۔

نظام الملک بدھو کی اس تقریر دلپذیر سے اور حیران ہوا۔ وہ اس تذبذب میں تھا کہ ان لغویات کا کیا جواب دے کہ بدھو نے اپنی زبان سراسر زیاں کو پھر جنبش دی۔

اے نظام البافلہ۔ تو بڑا نادان ہے۔ کہ اب بھی اس جانب کا اسم گرامی نہیں پوچھتا۔

نظام الملک نے دبے لفظوں میں کہا۔

"آپ کا اسم گرامی؟"

ہمارا "اسم گرامی"! کھل کھلا کر ہنسا۔ ہاں بھئی سنو! ماں باپ نے تو نام منصور بن موسیٰ رکھا تھا۔ مگر بابدولت نے بخوف طوالت اختصار کر کے اپنا نام الرطل والبوق ابن پشم وپانزدہ تجویز فرمایا۔ کیونکہ من چالیس کا اور رطل اڑھائی سیر کا ہوتا ہے۔ اور صور اسرافیل بہت بڑی ہوگی۔ اس کی جگہ بوق یعنی نرم جو بہ نسبت اس کے بہت چھوٹا ہوتا ہے۔ اور پشم بال سے چھوٹی ہوتی ہے "سی" تیس کو کہتے ہیں۔ اس کے عوض نصف اسکا پانزدہ یعنی پندرہ پسند کیا۔

یہ بکواس سن کر نواب صاحب کے رہے سہے ہوش بھی اڑ گئے اور نہایت فکر لاحق ہوئی۔ بدھو نے پھر گرج کر کہا۔

"بڑے نافہم ہو۔ کہ مجھ سے یہ نہیں پوچھتے۔ کہ تم شعر گوئی میں بھی کوئی

عمل دخل رکھتے ہو یا نہیں۔؟"

اس پر نواب صاحب نے انتہائی بے بسی کے ساتھ کہا۔

"ہاں فرمائیے۔ کہ شعر و شاعری میں بھی آپ شوق فرمایا کرتے ہیں یا نہیں۔؟

اس کے جواب میں ارشاد ہوا۔

"ہاں مجھے پروردگار الشعراء کا خطاب ملنے والا ہے۔ نمونہ کے طور پر ایک شعر عرض کرتا ہوں۔ اگر کچھ مذاق سخن فہمی کا ہوگا۔ تو آپ ضرور داد دیں گے۔ ملاحظہ ہو۔

برآمد آفتاب از فلک چوں طاس ————

قل اعوذ برب الناس ملک الناس الہ الناس من شر الوسواس الخناس الذی یوسوس فی صدور الناس من الجنۃ

نواب صاحب نے مسکرا کر کہا۔ کہ اگر آیت مبارک کو پورا کر کے والناس بھی شامل کر لیتے۔ تو قافیہ درست ہو جاتا۔

بدھو نے جھنجھلا کر کہا۔

عجیب احمق ہو۔ کہ علم عروض سے اتنی شُد بُد بھی نہیں رکھتے۔ کہ مصرعہ ثانی کا وزن اس الحاق سے بڑھ جائیگا۔

اس گفتگو سے نظام الملک اتنا گھبرایا کہ دونا کو کہلا بھیجا۔ اگر میری زندگی

مطلوب ہے۔ تو جس طرح بھی ممکن ہو۔ بقیہ رقم داخل خزانہ اسی وقت کر دو اور بادشاہ کی خدمت میں عرضی لکھو۔ کہ بجائے اسی ہزار کے اسی لاکھ لے لیا جائے۔ یا پھانسی کے تختہ پر لٹکا دیا جائے لیکن اس نابکار کو میری صحبت سے واپس بلا لیا جائے۔

چنانچہ رقم داخل خزانہ ہو گئی۔ اور نواب صاحب کو دوبارہ منصب پر بحال کر دیا گیا۔

طاہرہ

ماٰخذ

ملفوظات مولانا نبی بخش ملتانی

(۱)

طاہرہ نواب احمد خاں والئے جھنگ کی حسین ترین شہزادی تھی ابھی یہ معصوم بچی ہی تھی کہ اس کی نسبت نواب علی محمد خاں صوبہ دار ملتان کے بڑے بیٹے سردار رحمت خاں سے ہو گئی۔ بدقسمتی سے نواب علی محمد حوادث دہر کا شکار ہو گئے۔ اور اُن کا یتیم بچہ کوڑی کوڑی کا محتاج ہو گیا جب رحمت خاں جواں ہوا۔ تو اُس نے تحقیق کی غرض سے ایک عورت اپنی منگیتر کے پاس بھیجی۔ کہ وہ اب بھی اسکے ساتھ شادی کرنے پر آمادہ ہے یا نہیں۔

طاہرہ کے پاس وہ عورت ایسے وقت میں پہنچی جب سہیلیاں اُس سے شادی کے بارے میں چھیڑ چھاڑ کر رہی تھیں۔ طاہرہ نے کہا۔ بہنو! میں نے تو اپنے منگیتر کو نہیں دیکھا۔ خدا جانے وہ کس مزاج کا ہے؟

سہیلیوں نے جواب دیا۔ اے شہزادی! اس میں کچھ شک نہیں کہ تیرا ہونے والا شوہر خوبصورت اور بہادر جوان ہے۔ مگر آج کل وہ بالکل

مفلس اور نادار ہو رہا ہے۔ اس کی جاگیر ضبط ہو چکی ہے اور گزر اوقات کیلئے اس کا کوئی باعزت ذریعہ نہیں رہا۔"

طاہرہ نے ہنس کر کہا "میرا منگیتر غریب ہے تو کیا ہوا۔ میرے لئے یہی فخر کافی ہے۔ کہ وہ خوبصورت ہے اور بہادر ہے۔"

اس عورت نے واپس جا کر رحمت خاں سے یہ تمام ماجرا کہہ سنایا۔ وہ خوشی سے پھولا نہ سمایا۔ فوراً جھنگ کو چل پڑا۔ اور نواب سے شادی کرنے کی درخواست کی۔ نواب احمد خاں نے کہا۔

"برخوردار! مجھے شادی کر دینے میں کوئی عذر نہیں لیکن اس سے پہلے ضروری ہے کہ تم بیس ہزار روپیہ لا کر پیش کرو۔ جس سے مجھے یہ اطمینان ہو جائے۔ کہ واقعی تم میری لڑکی کا خرچ برداشت کر سکو گے جب تک تمہارے پاس اپنی بیوی کے گزارے کے لئے معقول روپیہ نہ ہو شادی کا خیال بے سود ہے۔"

رحمت خاں اتنی بڑی رقم کا مطالبہ سن کر گھبرا گیا۔ اور قریباً قریباً وہ طاہرہ کی شادی سے مایوس ہو گیا۔ سوچتے سوچتے اُسے تلمبہ کے ایک ساہوکار کا خیال آیا جس کے ساتھ اُس کے باپ کے دوستانہ مراسم تھے نا اُمیدی میں اُسے اُمید کی جھلک دکھائی دینے لگی۔ اندھیرے میں اُجالا دیکھ کر اس کا دل باغ باغ ہو گیا۔ وہ بگولے کی سی تیز رفتاری سے تلمبہ پہنچا۔

اور سیٹھ سے بولا۔

"تم میرے خاندان کے دیرینہ مہاجن ہو۔ جب تک میرے والد زندہ تھے۔ تم سے ہزاروں لاکھوں کا لین دین ہوتا تھا۔ لیکن آج نہ میرے پاس ریاست ہے۔ اور نہ کوئی جاگیر۔ پرانی ساکھ پر بیس ہزار مانگتا ہوں۔ اگر دے دو۔ تو میرے والد کی روح تم سے خوش ہوگی۔ اور میں بہت جلد قرضے کا پیسہ پیسہ ادا کر دوں گا۔

سیٹھ نے کہا۔ "رحمت خاں! بیس ہزار دینے میں انکار نہیں لیکن خدا کو حاضر ناظر جان کر یہ عہد کرو۔ کہ جب تک یہ رقم ادا نہ کر دو گے۔ اپنی بیوی کے قریب نہ جاؤ گے۔!"

رحمت خاں سیٹھ کی یہ ستم آفرین شرط سن کر لمحہ بھر کے لئے بحرِ تخیل میں کھو گیا۔ اُسے پھر چاروں طرف وہی ناامیدی اور کبھی نہ ختم ہونے والی تیرگی نظر آنے لگی۔ کافی دیر تک بُت بنا سوچتا رہا۔ بیم و رجا کے اسی عالم میں اُسے طاہرہ کا مغموم چہرہ دکھائی دیا۔ جیسے وہ کہہ رہی ہو۔ کہ اسی غنیمت سمجھو کہ ایک دوسرے کے قریب رہنے کا موقع تو مل رہا ہے۔ ورنہ ممکن ہے کہ ہمارے تمہارے درمیان مفارقت کی کوئی اور خلیج حائل ہو جائے۔ اور ہم عمر بھر ایک دوسرے کا منہ تک بھی نہ دیکھ سکیں۔

رحمت خاں طلسم زدہ پیکر کی طرح کھڑا سیٹھ کے منہ کو تک رہا تھا۔ کہ

سیٹھ نے مسکرا کر کہا "کیوں جوان! اپنے نفس پر قابو نہیں ہے۔ ذرا محبوب الٰہی کے حالات کا جائزہ لو۔ امیر المومنین عمرؓ اور حضرت علیؓ کے ضبطِ نفس کا خیال کرو۔ آخر تم بھی خالد اور قاسمؒ کے بھائی بند۔ وں میں سے ہو۔ کیا تم سال دو تک بھی اپنے وجود پر قابو نہیں رکھ سکتے"؟

رحمت خاں نے ڈوبی ہوئی آواز میں اقرار کیا۔ کہ "میں ہر قیمت پر آپ کی شرط کو پورا کرنے کی کوشش کروں گا"

سیٹھ نے بیس ہزار روپے لا کر آگے رکھ دیئے۔ رحمت خاں نے عقاب کی طرح جھپٹ کر تھیلی اٹھالی۔ اور مہینوں کا سفر دنوں میں طے کر کے جھنگ آ پہنچا۔ اب نواب احمد خاں کے لئے اور کوئی چارہ کار نہ تھا۔ اس نے ایک ساعتِ سعید میں طاہرہ کا نکاح رحمت خاں سے کر دیا۔

(۲)

ہونے کو تو شادی ہو گئی۔ لیکن رات کو جب میاں بیوی ایک پلنگ پر سوتے تو درمیان میں تلوار رکھ دی جاتی۔ طاہرہ سخت حیران تھی۔ کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ جب تین چار دن گذر گئے۔ تو اس نے جرأت کر کے پوچھا۔

میرے سرتاج! جب سے ہماری شادی ہوئی ہے میں دیکھ رہی ہوں کہ تم ہر وقت فکر مند اور اداس رہتے ہو۔ یقیناً تمہیں کوئی نہ کوئی صدمہ پہنچا ہے میں تمہاری خادمہ ہوں۔ مجھ سے دل کا راز چھپانا درست نہیں۔ خدا کے لئے

صاف صاف بتاؤ کہ معاملہ کیا ہے۔ ممکن ہے ہم دونوں کی متفقہ کوشش سے وہ مصیبت ٹل جاتے!"

پہلے تو رحمت خاں نے ٹالنے کی کوشش کی۔ لیکن جب اس کا اصرار حد سے بڑھ گیا۔ تو اُس نے تمام معاملہ کہہ سنایا۔ طاہرہ نے کہا۔ آقا! آپ نے میری بڑی قیمت ادا کی ہے میں آپ کے اِس احسان کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ یہ جگہ ایسی نہیں۔ جہاں سے بیس ہزار روپے مل سکیں بہتر ہے کہ ہم بھیس بدل کر کسی اور ملک کو نکل جائیں۔ تاکہ محنت مزدوری کر کے یہ قرضہ اُتار سکیں۔

آدھی رات کا عمل تھا۔ جھنگ کے امیر و غریب پڑے سوتے تھے کہ طاہرہ نے مردانہ لباس پہن کر اپنے باپ کے اصطبل سے دو گھوڑے نکالے اور میاں بیوی سوار ہو کر کابل کو روانہ ہو گئے۔

(۳)

افغانستان کا رعایا پرور سلطان شاہ تیمور اپنے محل کی چھت پر بیٹھا شہر کی سیر کر رہا تھا۔ کہ اُسے دو بانکے سجیلے نوجوان سوار نظر آئے۔ بادشاہ کو اُن کے چہرے پر شرافت اور بہادری کا پرتو نظر آیا۔ فوراً ملازم بھیج کر طلب کیا۔ اور پوچھا۔

"تم کون ہو۔ کہاں سے آئے ہو۔ اور کہاں جانے کا ارادہ ہے؟"

رحمت خاں نے عرض کی "ہم دونوں پنجابی ہیں۔ میرا نام رحمت خاں اور یہ میرا سالا حامد خاں ہے۔ روزی کی تلاش میں آپ کے دربار کو چلے آ تھے۔ قسمت کی خوبی نے آپ تک باریابی کا موقع دیا۔ آگے کا حال خدا ہی بہتر جانتا ہے۔

بادشاہ نے خوش ہوکر دونوں کو ملازم رکھ لیا۔ چار مہینے گذر گئے لیکن بیس ہزار کی کوئی سبیل نظر نہ آئی۔ برسات کے موسم کے بعد جشنِ نوروز کے موقعہ پر بادشاہ شیر کے شکار کو روانہ ہوا۔ رحمت خاں اور حامد خاں بھی ہمراہ ہو لئے۔ شیر بہت خوفناک تھا۔ اُس نے تڑپ کر بادشاہ کے گھوڑے پر حملہ کیا۔ اور اس کے ماتھے سے گوشت کا ٹکڑا نوچ لیا۔ پیچھے ہٹ کر دوبارہ اُچھلنا چاہتا تھا۔ کہ خوف کے مارے بادشاہ کے ہاتھ سے کمان گر گئی۔ حامد موقع کی تاک میں تھا۔ اس نے لپک کر شیر کا کام تمام کر دیا۔ شیر کے مرنے پر چاروں طرف سے مبارک سلامت کی صدا بلند ہوئی گھوڑا چونکہ زخمی ہو چکا تھا۔ اس لئے بادشاہ دوسرے گھوڑے پر سوار ہوا اور حامد خاں سے پوچھا۔

"پنجابی! شیر کو تو نے مارا ہے؟

حامد خاں نے سر جھکا کر ادب سے کہا۔

"شیر کو تو حضور کے اقبال نے مارا ہے۔ اس بندہ کی کیا مجال۔!"

بادشاہ بولا" پنجابیو! تم شریف اور بہادر معلوم ہوتے ہو۔ آج سے میں تمہیں باڈی گارڈ مقرر کرتا ہوں۔

محل سرائے میں آکر بادشاہ نے اپنی جان کی سلامتی کی خوشی میں تاوان کیا اور حامد خاں کو خلعتِ فاخرہ عطا کیا۔ اس کے بعد رحمت خاں تو رات کو دربار میں رہنے لگا۔ حامد خاں کو محل کی پہرہ داری ملی۔ ساون کے ایّام تھے آسمان پر کالی گھٹا سی چھائی تھی۔ اور بجلی چمک چمک کر ایک عجیب سی کیفیت پیدا کر رہی تھی۔ بادشاہ دربار سے اُٹھ کر محل کو چلا۔ اور رحمت خاں سے کہا۔

"بیٹا تو جا کر آرام کر۔"

پھاٹک پر حامد خاں تعینات تھا۔ اس نے جھک کر سلام کیا۔ جب بادشاہ اندر چلا گیا۔ تو حامد خاں نے اپنی حالت پر غور کرتے ہوئے دبی آواز میں گانا شروع کیا۔

یعقوبؑ اگر شدے شب افروز دلم
دیدے اگر ایوبؑ دمے سوز دلم
در ہر چمنے موسمِ گل وقت بہار
بگریستے او چو شمع بر سوز دلم

رحمت خاں بادشاہ سے فارغ ہو کر اپنے مکان طرف جا رہا تھا۔ کہ

اس کے کانوں میں حامد خاں کے گانے کی دردناک آواز پہنچی۔ غم سے بے قرار ہو گیا۔ جواب میں گا کر کہا ؎

یعقوبٔ بکوئے من اگر روش شدے
وایوبٔ اگر بمن ہم آغوش شدے
آنرا غمِ خود جملہ فراموش شدے
ویں یک زفغاں و نالہ خاموش نشدے

حامد خاں نے رحمت خاں کا راگ سنا تو اس کے دل سے ٹھنڈا سانس نکل گیا۔

(۴)

تیمور شاہ کی ملکہ بہت دانا تھی۔ رحمت خاں اور حامد خاں کے گانوں کی بھنک اس کے کانوں میں جو پڑی تو اس نے کہا۔

جہاں پناہ! یہ پنجابی جو آپ کی خدمت میں رہتے ہیں میاں بیوی ہیں۔ اور یہ آدمی جو پھاٹک پر پہرہ دے رہا ہے۔ بلاشبہ عورت ہے۔ کوئی وجہ ضرور ہے۔ کہ دونوں قریب ترین ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے فراق میں جھلس رہے ہیں۔

بادشاہ قہقہہ مار کر ہنسا۔ اور کہنے لگا۔ تمہیں عجیب خیال آیا۔ یہ تو سالے بہنوئی ہیں۔ اور ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ رہتے ہیں۔ آج یہ شخص پھاٹک

پر مقرر ہے۔ ورنہ ان کا آپس میں اتنا پیار ہے۔ کہ ایک لحظہ بھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتے۔"

ملکہ نے کہا "حضور کا فرمان بجا۔ لیکن بلا کر دریافت کر لینے میں کیا ہرج ہے ——— !"

بادشاہ نے آدمی دوڑا کر اُسی وقت رحمت خاں اور حامد خاں کو محل میں طلب کیا۔ اور پوچھا۔

"سچ سچ بتاؤ۔ کہ تم دونوں مرد ہو۔ یا تم میں سے کوئی عورت بھی ہے۔؟"

دونوں شرم کے باعث خاموش رہے۔ بادشاہ نے ملائمت سے دوبارہ سہ بارہ پوچھا ——— رحمت خاں نے کہا۔

خداوندا! اس وقت آپ ہمارے ماں باپ کی جگہ ہیں۔ آپ سے کوئی بھید چھپا نہیں رہ سکتا۔

پھر اُس نے اپنا سارا قصہ کہہ سنایا۔

بادشاہ نے خادمہ کو بلا کر کہا۔ کہ یہ بہادر لڑکی جو مردانہ لباس میں کھڑی ہے۔ میری بیٹی کی جگہ ہے۔ اسے ملکہ کے پاس لے جاؤ۔ اور زنانہ کپڑے پہنا کر محل میں عمدہ جگہ رہنے کے لئے دو۔ اور ہر طرح سے اس کے آرام و آسائش کا سامان مہیا کرو۔"

طاہرہ بادشاہ کا حکم سن کر اُسی وقت شرم سے سر جھکائے محل میں چلی

گئی۔ ملکہ نے پیار سے اُسے اپنے سینے سے لگایا۔ اور اُس وقت جو زیور اور کپڑے پہن رکھے تھے۔ سب اُس کو پہنا دیئے۔

بادشاہ نے رحمت خاں کو شاباش دی اور کہا۔

"میں تیرے نامور باپ کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ تجھ پر ہزار آفرین کہ سال بھر سے اپنے عہد کو نباہتا چلا آیا ہے۔ صبح سویرے خزانے سے بیس ہزار لے کر تلمبہ جاؤ۔ اور اپنا قرض ادا کرو۔

(۵)

تلمبہ کا ساہوکار رقم ملنے سے ناامید ہو چکا تھا۔ سال بھر کے بعد جب رحمت خاں رقم لے کر حاضر ہوا۔ تو وہ سخت حیران ہوا۔ اور اس نوجوان کے ایفائے عہد پر آفریں کہی۔

رحمت خاں رقم ادا کر کے واپس کابل آیا۔ اور بادشاہ کے قدموں پر گر پڑا۔ اور بولا۔

جہاں پناہ! آپ نے ہم دونوں کو ہمیشہ کے لئے خرید لیا ہے اب ہم اپنی بقیہ عمر آپ کے قدموں ہی میں بسر کریں گے"

کہتے ہیں۔ کہ جب تک تیمور شاہ زندہ رہا۔ طاہرہ اور رحمت خاں کو بھی اولاد کی طرح عزیز سمجھتا رہا۔

ماٰخذ

۱۔ صبح صادق ____________
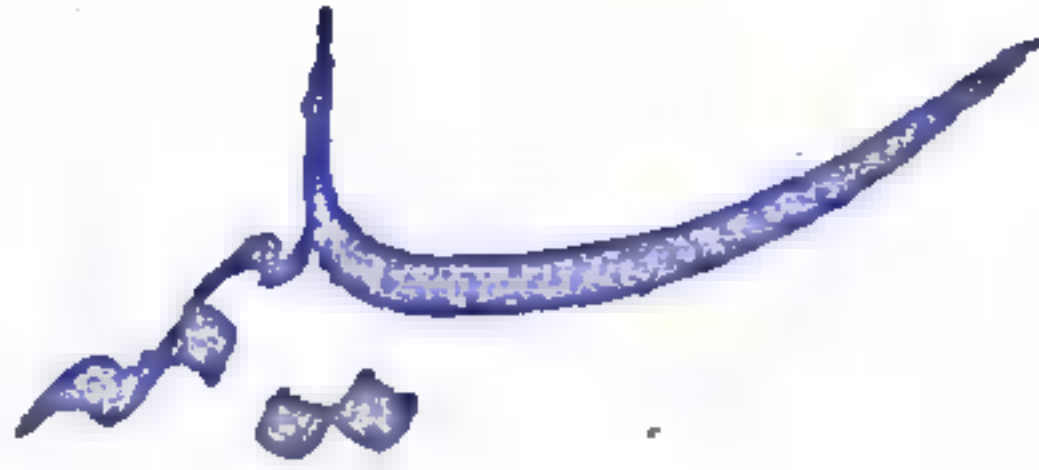
۲۔ تاریخ الوزراء ____________

۳۔ شہادت نامہ ____________

”اری نیک بخت! بلوچوں میں یہ بڑا عیب ہے کہ وہ غیر کفو میں اپنی لڑکیاں نہیں دیتے۔ کتنی بار ان کا غیروں سے تصادم ہو چکا ہے۔ ٹکرا کر پاش پاش ہو گئے ہیں مگر اپنی ہٹ سے باز نہیں آتے۔“

گورگیج بلوچوں کی تباہی و بربادی کی خونیں داستان

یہ افسانہ سلطنت عباسیہ بہاول پور کے اُس عہد کی نقاب کشائی کرتا ہے جبکہ اس قلمرو پہ نواب صادق محمد خاں ثانی کا سکہ چلتا تھا۔ امیرالامرا محمد نصیر خاں گورگیج وزیر اعظم اور فتح محمد خاں غوری اس حکومت کا سپہ سالار تھا۔ چونکہ محمد نصیر خاں بے حد مدبر اور مستعد وزیر تھا اسلئے سپہ سالار سے چرکیب از تاک کسی اہلکار کی مجال نہ تھی کہ وہ کسی فرد رعایا کو بیگار میں پکڑتا۔ یا اس پر ذرا بھی ظلم کرتا۔ یعقوب خاں اور وفادار بخش خاں گھرانی سرکار بہاول پور کی ناک کے بال بنے ہوئے تھے چونکہ دونوں رشوت خوار واقع ہوئے تھے اس لئے محمد نصیر خاں سے در پردہ ناراض رہتے تھے اور چاہتے تھے کہ کسی تقریب سے اس پختہ کار اور مدبر انسان کو ریاست سے نکلوا دیں تاکہ انہیں من مانی کارروائی کرنے کا موقع مل سکے مگر سرکار بہاولپور کو وزیر پر اس قدر اعتماد تھا کہ اُن کا کوئی وار چلتا نہ تھا۔ ۱۸۱۰ء کی ایک شام کو ——

سازش

عین اُس وقت جبکہ سرکار بہاول پور اور اُن کے رفقاء ہرنوں کے شکار سے فارغ ہو کر ڈیرا ور کر گھوڑے اڑاتے چلے جا رہے تھے۔ یعقوب خاں نے قادر بخش خاں کو پکار کر کہا۔ گھوڑا رو کو۔ ہم ذرا آہستہ چلیں گے۔ محمد نصیر خاں وزیر اعظم، فتح محمد خاں غوری، حکیم احسن اللہ خاں اور خلیفہ خدا بخش اور دیگر خدام شاہی سرکار کے ساتھ بڑھے چلے گئے۔ اب صرف دو رفیق اور ان کا راتب دار نوکر اپنی سواریاں روکے کھڑے تھے۔ جب گرد چھٹ گئی تو انہوں نے گھوڑوں کی لگامیں ڈھیلی کر دیں۔ اور آہستہ آہستہ ڈیرا ور کو روانہ ہوئے یعقوب خاں نے کہا۔ "قادر بخش خاں! نصیر خاں کی موجودگی میں اب ہمارا گذارہ نہیں ہو سکتا۔ کوئی ایسی تدبیر سوچو کہ یہ کانٹا ہماری راہ سے ہٹ جاتے۔"

قادر بخش خاں:- یار اِس پیر فرتوت نے سرکار پر کوئی ایسا جادو کر رکھا ہے کہ اس کے آگے اور کسی کی دال نہیں گلتی۔

یعقوب خاں:- مگر آخر کب تک ——————!

قادر بخش خاں:- یہ عزرائیل ہی سے پوچھیے۔!

یعقوب خاں:- (قہقہہ لگا کر ہنستے ہوئے) معلوم ایسا ہوتا ہے کہ وہ بھی اس پر ہاتھ ڈالتے ہوئے ڈرتا ہے۔

قادر بخش:۔ ہاں دیکھو نا ——— ستّر برس سے تو زیادہ عمر کا ہے۔ لیکن ابھی اس کے مرنے کا وقت نہیں آیا ——— ؟

یعقوب خاں:۔ ایک تدبیر ذہن میں آئی ہے۔ اگر طبیعت حاضر ہو تو پیش کروں

قادر بخش خاں:۔ ضرور ——— ! ضرور ——— !!

یعقوب خاں نے گھوڑے کو روک لیا اور دائیں بائیں جھانکتے ہوئے رازدارانہ طور پر اس طرح دھیمی آواز میں بولنا شروع کیا۔ گویا ریت کے تودے بھی کان رکھتے ہیں۔

نصیر خاں کی ایک لڑکی ہے۔ بہت خوبصورت! نواب جوان آدمی ہے۔ اُسے وڈیرے پر رشتہ لینے پر مجبور کیا جائے۔"

قادر بخش خاں ہنس کر بولا" یعنی اس کی جڑیں اور مضبوط ہو جائیں۔"

یعقوب خاں نے سنجیدگی سے کہا" دوست بھولتے ہو۔ تمہارا کیا خیال ہے، کہ نصیر خاں اپنی لڑکی دینی گوارا کرے گا! میں اپنی جان کی بازی لگانے کو تیار رہوں۔ تم نہیں جانتے گر یچ کے بلوچ اس معاملے میں سخت غیور واقع ہوتے نصیر خاں مرنا قبول کر لے گا۔ لیکن نواب صاحب کو بیٹی کا رشتہ دینا کبھی منظور نہ کرے گا۔"

قادر بخش خاں:۔ اگر یہ بات ہے تو پھر سرکار کو اس رشتے پر آمادہ کرنا میرے ذمہ رہا۔ میں کل ہی مائی مہراں کو سرکار کے پاس بھیجوں گا۔ وہ نصیر خاں

کی لڑکی کی اس طرح تعریف کرے گی کہ نواب صاحب اس پر ہزار جان سے فریفتہ ہو جائیں گے۔

یعقوب خاں:۔ مگر اس کام میں دیر نہ ہونی چاہیئے۔

قادر بخش خاں:۔ بے فکر رہو۔ کل پرسوں تک ہو جائے گا۔

یعقوب خاں:۔ پھر ٹھیک ہے۔

اب ڈیراور کی فضا پر گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا چکا تھا۔ قلعہ کے برجوں کی بتیاں جھلملا جھلملا کر دہ نوردوں کو خوش آمدید کہہ رہی تھیں۔ نوبت شاہی پتہ دے رہی تھی کہ سرکار قلعہ میں داخل ہو چکے ہیں۔ اس لئے انہوں نے اپنے گھوڑوں کو ایڑ لگا کر سرپٹ ڈال دیا۔

دائی جھراں

نواب صادق خاں ثانی تیس برس کے نوجوان تھے۔ چہرے پر خشخشی داڑھی اور سر کے لمبے لمبے بال انہیں بہت ہی بھلے لگتے تھے۔ ڈیراور کے شاہی محل میں نہا دھو کر اپنے بالوں میں کنگھی کر رہے تھے کہ محل کی مشہور دائی مائی جھراں حاضر ہوئی۔ پہلے تو اس نے بڑی بیگم کا کوئی پیغام عرض کیا۔ پھر وزیراعظم کی تعریف کی۔ اس کے بعد اس کی خوبصورت صاحبزادی سلیمہ بیگم کا ذکر چھیڑا۔ اور کہا:۔

"اے سرکار! اس وقت دنیا میں تیرے وزیر کی لڑکی سے کوئی

دوشیزہ زیادہ خوبصورت نہیں ہے۔ اگر تو اُسے اپنے محل میں داخل کر لے تو تجھے دُنیا میں ہی بہشت کا مزہ آجائے۔

نواب نے چونک کر کہا۔ "کیا واقعی وہ بہت حسین ہے؟"

مائی مہراں سنبھل کر سیدھی ہو بیٹھی۔ بولی۔

"عالم پناہ! اُس کے حسن کا کیا کہنا محض حسینہ کا لفظ اُس کیلئے کافی نہیں۔ اُسے پرستان کی شہزادی کہنا چاہیئے۔ یا فردوس بریں کی حور۔۔۔! اس کی غزالوں کو شرما دینے والی نشہ بار سرمگیں آنکھیں، پتلے پتلے یاقوتی ہونٹ اور ان کے کناروں پر لرزتا ہوا تبسم، کمر تک لہراتی ہوئی سیاہ عنبریں زلفیں، شوخ و شنگ اُٹھتی جوانی اور اس کے مسحور کن عشوے۔ گورے گورے حسین اعضا کا تناسب، بوٹا سا قد حسین اور لوچدار جسم ۔۔۔۔۔۔ میں بڑھیا کیا عرض کروں۔ اُس کا حسن میری تعریف سے بے نیاز ہے۔ اس کی خوبصورتی تو صرف دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ زبان اُس کی تعریف کا حق کیسے ادا کر سکتی ہے ۔۔۔۔۔۔؟"

نواب :۔ "خوب ۔۔۔۔۔۔! کیا نام ہے اُس کا؟"

مائی مہراں :۔ "سرکار کا اقبال قائم۔ کچھ ایسا سا نام ہے۔ ہاں یاد آگیا۔ سلیمہ ۔۔۔۔۔۔! وزیر صاحب کو وہ تمام بچوں سے پیاری ہے۔ اگلے دن کہہ رہے تھے۔ اب سلیمہ جوان ہو چکی ہے اس کا بیاہ کر دینا چاہیئے۔"

نواب :۔"کہیں نسبت تو نہیں ہوئی۔؟"

مائی مہراں :۔نسبت تو نہیں لیکن وزیر صاحب کا خیال اپنے بھتیجے اکرم خاں کو دینے کا ہے۔ وہ اُسے دل سے چاہتے ہیں۔ اور اکرم خاں ہے بھی اس قابل۔ جہاں پناہ! وہ نہایت حسین اور خوبرو جوان ہے۔ قرآن مجید کا حافظ ہے اور فارسی کی تمام کتابیں اُسے ازبر ہیں فقہ حنفی کا عالم ہے۔ وزیر صاحب اس پر بڑا بھروسہ رکھتے ہیں۔

نواب :۔"ہاں۔ اکرم، فضلی اور جمیل تینوں ہی لائق نوجوان ہیں لیکن کاش! یہ رشتہ نصیر خاں مجھے دے سکتا ——— !!

مائی مہراں :۔"سرکار۔ وہ کیوں نہ دے گا! پہلے اکرم خاں کا کسی دوسری جگہ رشتہ کرا دیجئے۔ پھر سلیمہ بیگم آپ کی ہی ہے۔"

نواب :۔اری نیک بخت! بلوچوں میں یہ بڑا عیب ہے کہ وہ غیر قوم میں اپنی لڑکیاں نہیں دیتے۔ کئی بار ان کا غیروں سے تصادم ہو چکا ہے ٹکرا کر پاش پاش ہو گئے ہیں مگر اپنی ہٹ سے باز نہیں آتے۔ نصیر خاں اس معاملے میں سب سے زیادہ سخت ہے اسلئے کامیابی کی اُمید بہت کم ہے۔"

مائی مہراں :۔"حضور کوشش تو فرمائیں۔ میں بھی لڑکی کی ماں سے ذکر کروں گی امید ہے نصیر خاں ضرور راضی ہو جائے گا۔"

اتنا کہنے کے بعد بڑھیا کو اچانک بڑی بیگم کا خیال آیا۔ ہڑبڑا کر اُٹھی۔ کہا۔ سرکار! بہت دیر ہو گئی۔ بڑی بیگم صاحبہ انتظار میں ہوں گی۔ نواب صاحب نے ہنس کر کہا۔ "جاؤ مگر ہمیں بھول نہ جانا۔"

مائی مہراں مسکراتی اور دعا دیتی روانہ ہو گئی۔ اور بہاول پور کے تاج و تخت کا مالک کسی گہرے فکر میں کھو گیا۔

عجیب مطالبہ ــــــــــ!

دوسرے دن سرکار بہاول پور کی سواری احمد پور شرقیہ کو روانہ ہوئی۔ نصیر خاں کا گھوڑا پہلو میں چل رہا تھا۔ نواب صاحب کی نظر معمول کے خلاف بار بار اس کے چہرے پر مرکوز ہو کر رہ جاتی تھی۔ اُسے نصیر خاں کی نورانی داڑھی پہلے سے زیادہ خوبصورت دکھائی دے رہی تھی۔ وہ رشتہ کے بارے میں کچھ تحریک کرنا چاہتا تھا۔ مگر نصیر خاں کی باوقار شخصیت کا رعب غالب آجاتا تھا۔ نواب صاحب نے وزیر اعظم کے سراپا پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالتے ہوئے کہا:۔

"خان! تجھے فوجی لباس بے حد بھلا معلوم ہوتا ہے۔ اور اس پر ہتھیار سونے پر سہاگہ کا کام دے رہے ہیں۔"

"ہاں عالم پناہ! سپاہی فوجی لباس ہی میں بھلا لگتا ہے۔" نصیر خاں نے مسکرا کر جواب دیا۔ "اور پھر یہ تلوار ذکری کا ہتھیار ہے کہ خدا معلوم آقا کو اسکی

کب ضرورت پڑے ——— !

"ہاں۔ درست ہے۔ مگر خلوت و جلوت میں ہر وقت باوردی اور آلاتِ حرب سے مسلح رہنا کہاں مناسب ہے ——— ! نواب صاحب نے دوبارہ کہا۔

نصیر خاں نے مؤدب پیرائے میں عرض کیا۔

"آقا کو جو صورت بھلی نظر آئے۔ نوکر کے لئے وہی موزوں ہے"

نواب صاحب کے چہرے پر اس جواب سے تبسم کھیل گیا۔ کہا۔

"خان صاحب! ہمارا منشا یہ ہے کہ آپ جب ہمارے حضور میں آئیں تو بے تکلف ہو کر آئیں۔ یعنی ہتھیار آپ کے بدن پر نہ ہوں"

نصیر خاں نے معاً کہا "ایسا ہی ہو گا عالم پناہ!"

یہاں یہ باتیں ہو رہی تھیں۔ اور کچھ دور پیچھے یعقوب خاں اور قادر بخش خاں گذشتہ واقعہ سے متعلق سرگوشیاں کرتے چلے آتے تھے۔ قادر بخش نے مائی مہراں کا سارا واقعہ دوہرایا۔ یعقوب خاں نے خوش ہو کر کہا۔ بس خوب ہے اب ڈراما شروع ہی سمجھو۔ اس کے بعد انہوں نے نصیر خاں پر نظریں گاڑ دیں۔

اگرچہ سرکار اور نصیر خاں کے مکالمہ کو وہ سُن نہیں سکتے تھے۔ مگر اُن کی حرکات سکنات سے کئی قسم کے اُلٹے سیدھے اندازے لگا رہے تھے۔

انہی دلچسپ مصروفیات میں یہ قافلہ سفر طے کر رہا تھا ———

فرار

سرکار بہاول پور کے اس عجیب وغریب حکم سے نصیر خاں کی طبیعت فکر مند ہو رہی تھی۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ دربار پر اس کے بدخواہوں کا قبضہ ہے لیکن چونکہ سپاہی آدمی تھا اس لئے اس نے بغیر ہتھیاروں ہی کے ڈیرہ مبارک کو جانے کا فیصلہ کر لیا۔ بڑے صاحبزادے افضل خاں نے خلافِ معمول انہیں اس طرح بغیر اسلحہ کے دربار شاہی کو جاتے دیکھا تو اس کے دل میں کئی خیالات پیدا ہوتے کہا۔ "ابا جان! آج میرا بھی ساتھ چلنے کو جی چاہتا ہے۔ نصیر خاں پہلے ہی سے کسی کو ہمراہ لے چلنے کا ارادہ کر چکا تھا چنانچہ اس نے اجمل خاں کو بلا کر گھر پر رہنے کی ہدایت کی۔ اور یہ دونوں باپ بیٹے محل شاہی کو روانہ ہوئے۔

محل سلطانی کے قریب وہ لوگ سوار رک گئے۔ نصیر خاں نے افضل خاں سے فرمایا۔ کہ تم یہاں ٹھہر کر میرا انتظار کرو۔ اگر دو گھنٹوں تک میں واپس نہ آؤں تو سمجھنا میری خیریت نہیں۔ فوراً جا کر اپنے خاندان کو خبر کرنا۔ یہ کہہ کر نصیر خاں محل سلطانی میں داخل ہو گیا۔

نواب صاحب یعقوب خاں کے ساتھ باتیں کر رہے تھے کہ چوبدار نے حاضر ہو کر عرض کی۔

"جہاں پناہ! وزیراعظم محمد نصیر خاں باریابی کا شرف چاہتے ہیں۔"

نواب صاحب نے یعقوب خاں کو تو دوسرے کمرے میں بھیج دیا۔ اور خود نئے ملاقاتی کے لئے تیار ہو بیٹھا۔ اس نے یعقوب خاں کے ساتھ مشورہ کر کے یہ طے کر لیا تھا۔ کہ وہ آج ضرور نصیر خاں پر اپنا مافی الضمیر پیش کر دیگا۔

نصیر خاں داخل ہوا۔ اور بموجب مراسم سینے پر ہاتھ رکھ کر جھک گیا۔

"آیئے خان صاحب! تشریف رکھئے ——— آہا ہا ملکی لباس کتنا اچھا لگتا ہے ——— "! نواب صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

نصیر خان نے ادائے شکر کے لئے سر جھکا دیا۔ اور پاس کی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

سرکار کی یہ کمال ذرہ نوازی ہے کہ اپنے غلاموں پر اس قدر نیک نگاہی رکھتے ہیں۔ اس سے ہم نیاز مندوں کی فدویت اور جاں نثاری میں اضافہ ہوتا ہے۔

نواب صاحب نے مسکرا کر کہا۔

"نصیر خاں! یہ حقیقت ہے کہ آپ کو ہم دل سے چاہتے ہیں۔

نصیر خاں نے عرض کی۔

"نمک حلال جاں نثاروں پر قدردان آقا اسی طرح شفقت فرمایا کرتے ہیں"

چند منٹوں کے سکوت کے بعد نواب صاحب پھر گویا ہوئے۔

"نصیر خاں! اگر شہد اور مکھن کو آپس میں ملا دیا جائے تو کچھ ہرج ہے؟"

"غلام سرکار کا منشا نہیں سمجھا" نصیر خاں نے فکر مند ہو کر کہا۔

نواب صاحب سنجیدہ ہو کر بولے "خان اعظم! تمہارا خداوند مجازی تم سے لڑکی کا رشتہ طلب کرتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ تمہاری صاحبزادی کو اپنے محل کی رانی بنائے اور اس سے جو اولاد ہو۔ اُسے عبا سیہ تخت و تاج کا وارث قرار دے۔"

نصیر خاں اس غیر متوقع مطالبہ سے گھبرا اُٹھا۔ اُسے لمحہ بھر کیلئے دنیا وما فیہا کی خبر نہ رہی۔ مگر بہت ہی جلد سنبھلا اور سنبھل کر بولا۔

"جہاں پناہ! یہ ناکارہ کس لائق تھا۔ سرکار نے اسے نوازا۔ اور فرش خاک سے اٹھا کر اوجِ ثریا تک پہنچا دیا۔ غلام کی یہ انتہائی عزت افزائی تھی کہ لونڈی محل سرائے شاہی میں داخل ہوتی۔ مگر افسوس ہے اس کی نسبت ہو چکی ہے۔"

نواب کی حالت اس جواب سے کچھ ایسی متغیر ہو گئی۔ گویا وہ اس جملہ کو سننے کے لئے قطعًا تیار نہ تھا۔ دانا وزیر موقع کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے فورًا دوزانو ہو گیا اور ادب سے بولا۔

صاحبزادہ مبارک خاں کے قتل کے سلسلے میں حضور والا نے غلام پر جس ناراضگی کا اظہار فرمایا تھا۔ وہ محض ریاست کا ردِ عمل تھا۔ کیونکہ کم از کم حضور یہ نہیں کہہ سکتے کہ صاحبزادہ کا قتل حضور کے ایما کے بغیر ہوا۔ اور جب مصلحت ملکی

پیشِ نظر قاتل سے قصاص لینا ضروری سمجھ لیا گیا۔ تو غلام نے عثمان خاں کو پیش کر دیا۔ اگرچہ وہ میرا چچیرا بھائی تھا۔ لیکن میں نے اُسے بچوں کی طرح پرورش کیا تھا۔ اور مجھے وہ افضل سے بھی زیادہ عزیز تھا۔ مگر میں نے خداوند مجازی کی خوشنودیٔ مزاج کے پیشِ نظر اُسے موت کے گھاٹ اتارا جب وہ قتل ہونے کے لئے جا رہا تھا۔ میں نے اُس سے آبدیدہ ہو کر پوچھا۔

"عثمان خاں! اگر کوئی آخری خواہش ہو تو بیان کر۔"

"عثمان خاں نے ڈوبی ہوئی آواز میں کہا کہ "اگر حضور میری خدمات کا کچھ صلہ دینا چاہتے ہیں تو صرف ایک خواہش عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ اگر وہ پوری ہو جائے تو یہ بے قرار روح سکون و اطمینان سے عالم بقا کو رخصت ہو سکے گی۔"

یہاں تک کہہ چکنے کے بعد نصیر خاں نے سرکار بہاول پور کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھا۔ نواب صاحب پوری توجہ سے یہ ٹریجڈی سن رہے تھے۔ نصیر خاں نے اپنے بیان کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"اے ولی نعمت! میں نے عثمان خاں سے وعدہ کیا کہ اس کی خواہش ضرور پوری کی جائے گی۔" اس پر عثمان خاں نے اپنے بیٹے اکرم خاں کو بُلا کر میرے حوالے کیا اور کہا۔

"میری صرف یہی تمنا ہے کہ اس یتیم کو اپنی فرزندی میں لے لیجئے۔"

نصیر خاں نے پھر سرکار کی طرف دیکھا اور کہا۔

"اے عالم پناہ! اس غلام نے عثمان خاں کی خدمات اور قریبی رشتہ کے پیش نظر اکرم خاں کو اپنی گود میں لے لیا۔ اور اپنی لڑکی اس سے منسوب کر دی۔ اگر یہ مجبوری نہ ہوتی تو بندہ اپنی معصومہ کو محل سرائے سلطانی میں داخل کرنے سے ہرگز ہرگز گریز نہ کرتا۔"

نصیر خاں اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔ اس کا بیان ختم ہو چکا تھا۔ نواب صاحب نے اپنے چہرے پر تبسم کے آثار پیدا کر کے کہا۔

اے محترم سردار! ہم آپ کی راست بیانی سے بہت خوش ہوئے۔ اکرم بھی ہمارا عزیز ہے۔ اس کی شادی کا ہم بہترین انتظام کر سکتے ہیں۔ آپ پر اولوالامر کی خواہش کا پورا کرنا فرض ہے۔

نصیر خاں کی طبیعت دفعتہً بگڑ گئی۔ وہ نواب صاحب کے اس جملے کو برداشت نہ کر سکا۔ فوراً اٹھ کر باہر نکل آیا۔

افضل خان نے خان اعظم کو پسینے میں تر بتر دیکھ کر اندازہ کیا کہ کوئی خاص سانحہ پیش آیا ہے اسلئے بلاتوقف سواری کا گھوڑا پیش کیا۔ خان نے ایڑ لگا کر اسے سرپٹ ڈال دیا۔ افضل خاں نے بھی ایڑ لگائی اور دونوں گھوڑے ہوا سے باتیں کرنے لگے۔

اَلرّحِیل

نصیر خاں کا اصلی گھر زندہ گور گنج میں تھا۔ جہاں اُس کے خاندان کے باقی ارکان آباد تھے۔ یہ چند سالوں سے احمد پور شہر قبیہ میں مقیم تھا یہاں اُس نے اپنے لئے خوبصورت محل تعمیر کر لیا تھا۔ پاس ہی وسیع و عریض مسجد بنوائی تھی جس میں پانچوں وقت نمازیوں سے رونق رہتی تھی جس وقت نصیر خاں سوار ہو کر قلعے کو روانہ ہوا۔ سرکار کے ایما سے مائی مہراں خان بیگم کے پاس سلیمہ کے رشتہ کے لئے پہنچ گئی تھی۔ مگر اس جہاندیدہ خاتون نے یہ کہہ کر دائی کا منہ بند کر دیا کہ "شرفا زندگی میں ایک دفعہ لڑکی کا رشتہ کرتے ہیں۔ اور ہم یہ کر چکے ہیں"۔ اس پر مائی مہراں کو مزید کہنے سننے کی جرأت نہ ہوئی۔ ابھی وہ وزیر اعظم کے محل میں بیٹھی ہی تھی کہ باہر سے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز آئی خان اُتر کر محل کو آرہا تھا کہ مہراں اُٹھ کر چل پڑی۔ خان کو کچھ شبہ ہوا اُس نے للکار کر کہا۔ "او خبیثہ! تُو ادھر کیوں آئی تھی۔ نکل ورنہ تلوار سے کاٹ کر رکھ دوں گا"۔

اجمل خاں سے کہا۔ "گھر کے آدمیوں کو جمع کرو۔ دس بارہ افراد جو اس وقت موجود تھے جمع ہو گئے۔ اُسی وقت اکرم خاں کا سلیمہ سے نکاح کر دیا اور کہا۔ تم دونوں کی زندگی یہاں خطرے میں ہے فوراً گھوڑے پر سوار ہو کر دریا خیر پور کو روانہ ہو جاؤ۔ اجمل خاں سے فرمایا کہ تم ان کے ساتھ چلو اور جس قدر

جلد ممکن ہو انہیں ریاست کی حدود سے باہر کردو۔ ہم تمہارے پیچھے چلے آتے ہیں۔"

خان اعظم نے باہر نکل کر اصطبل سے چار گھوڑے منگائے۔ دو پر اکرم خاں اور اس کی بیوی کو تیسرے پر اجمل خاں کو سوار کیا۔ چوتھا گھوڑا ایک ملازم کے حوالے کیا۔ اور یہ سب کچھ اتنی جلدی سے ہوا کہ ایک گھنٹہ کے اندر ہی اندر یہ مختصر سا قافلہ شہر سے باہر نکل چکا تھا۔

اس کے بعد خان اعظم نے اونٹ طلب کرائے۔ گھر کا ضروری سامان لدوا کر اپنے دس جاں نثاروں کی حفاظت میں روانہ کیا۔ اور پھر خود گھر کے آدمیوں کو سوار کر کے خیرپور کو چل دیا۔ افضل خاں کے ساتھ اصطبل کے جانور کر دیئے۔ اور کہا کہ دریا کے ساتھ ساتھ لے کر چلو۔ تاکہ چارے کی تکلیف نہ ہو۔ چنانچہ وہ بھی خان کی روانگی کے گھنٹہ بھر بعد تمام جانوروں کو ہمراہ لے احمد پور شرقیہ سے روانہ ہو پڑا۔ شہر کے لوگ حیران تھے کہ کیا ہو گیا۔ اور وہ شخص جو تمام ریاست کے سیاہ و سفید کا مالک بنا ہوا تھا اس طرح دفعتہً کیوں چلا گیا۔ ایک ایک سے دریافت کرتے تھے مگر یہ عقدہ کسی پر نہ کھلتا۔

تعاقب

نصیر خاں کے چلے آنے پر یعقوب خاں پھر سرکار کے پاس آ بیٹھا۔ وہ دل ہی دل میں خوش تھا۔ کہ اب بادشاہ اور وزیر میں پھوٹ پڑ چکی ہے

اور نصیر خاں جو اس طرح بلا اجازت گیا ہے۔ اس کی زیادہ دیر تک اس سلطنت سے نبھ نہ سکے گی۔ نواب صاحب دم بخود چپ بیٹھے رہتے۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنی جسارت پر متاسف ہیں اور انہوں نے بلوچیوں کی غیرت کے بارے میں جو اندازہ لگایا تھا۔ وہ غلط نہیں تھا۔ یعقوب خاں نے مہر سکوت کو توڑتے ہوئے کہا۔ "نصیر خاں نے آج بڑی گستاخی کی! مجھے اس جیسے مدبر انسان سے ایسی اُمید نہ تھی۔!"

نواب صاحب نے کہا۔ "یعقوب خاں! میں سمجھتا ہوں کہ نصیر خاں نے آج بڑا حوصلہ کیا ہے۔ یہ لوگ رشتے کے معاملے میں حق واقع ہوئے ہیں۔ میں نے اسی لئے تو نصیر خاں کو بغیر ہتھیاروں کے آنے کا حکم دیا تھا۔"

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ قادر بخش خاں گھمرانی مائی مہراں کو لے کر حاضر ہوا۔ نواب صاحب نے پوچھا۔

"مائی مہراں! بول کیا جواب لائی!"

"مائی مہراں خاموش رہی۔ نواب صاحب پھر گویا ہوئے۔

"کیا وزیر کی بیوی نے بھی تجھے ٹھکرا دیا۔"

مہراں نے جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔

سرکار! زندگی باقی تھی کہ بچ آئی۔ ورنہ نصیر خاں تو ننگی تلوار لے کر میرے قتل کرنے کو دوڑ پڑا تھا۔"

نواب صاحب یہ سن کر بے اختیار ہنس پڑے فرمایا۔
"تجھے کس نے کہا تھا کہ نصیر خاں سے جا کر مل۔!"
"سرکار! میں ملی کہاں تھی۔ میں وزیر صاحب کی بیوی سے مل کر آرہی تھی کہ دروازے پر ٹکراؤ ہو گیا۔"
"اچھا۔! وہاں سے کیا جواب ملا۔!؟"
"یہی کہ شرفا اپنی لڑکیوں کو ایک خاوند دیا کرتے ہیں۔ اور وہ ہم دے چکے ہیں۔"
قادر بخش خاں نے مسکرا کر کہا۔ کہ اگر ان کا جواب یہی ہے تو اکرم خاں ٹھکانے لگایا جا سکتا ہے۔ نہ سر ہو گا۔ اور نہ درد ہو گا۔
چوبدار حاضر ہوا۔ عرض کی "محبوب علی حاضر ہونے کی اجازت چاہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ سرکار سے ضروری کام ہے۔"
"اچھا آنے دو۔"
مائی مہراں اٹھ کر زنان خانے میں چلی گئی۔ اور تیس برس کا گرانڈیل نوجوان فوجی لباس پہنے اندر داخل ہوا۔ اس نے آتے ہی جھک کر سلام کیا اور پھر ادھر ادھر دیکھ کر بولا۔
"سرکار غضب ہو گیا ــــــــــ!"
"کیوں! کیا ہے!!"

"قبلہ عالم! آپ کا وزیرِ اعظم بال بچوں کو لے کر خیرپور کی طرف جا رہا ہے اس کا محل ویران پڑا ہے۔ اور اس کے خاندان کا کوئی آدمی یہاں موجود نہیں ہے۔"

نواب صاحب نے گھبرا کر یعقوب خاں سے کہا۔

"یہ بہت بُرا ہوا۔ کئی سالوں سے ریاست خیرپور کے ساتھ ہماری لڑائی چلی آتی ہے۔ فتح خاں غوری پہلے بدعہدی کر کے ریاست چھوڑ چکا ہے۔ اب وزیرِ اعظم نکلا جا رہا ہے۔ اگر ایسا رازدار آدمی ریاست خیرپور کے ہاتھ آ گیا۔ تو بہاولپور کی اینٹ سے اینٹ بج جائے گی لپک کر پہنچو۔ اور جس قیمت پہ بھی وہ راضی ہو۔ انہیں منا کر واپس لے آؤ۔"

یعقوب خاں اور فادر بخش خاں کی تو آرزو یہی تھی۔ کہ نصیر خاں ریاست سے نکل جائے۔ آج عرصہ ہائے دراز کا خواب پورا ہوتا نظر آ رہا تھا۔ وہ کیونکر مناتے۔ اور اگر منا لے جاتے بھی تو نصیر خاں ان کے کہنے میں آنے والا کہاں تھا۔ یہ محض تعمیل حکم کی خاطر محل سرائے سلطانی سے نکلے۔ اور تین چار کوس تک گھوڑے دوڑا کر واپس لوٹ آئے۔ کہا کہ نصیر خاں بہت دُور نکل چکا ہے۔ بہتیری کوشش کی ہے۔ مگر اس وقت تک پہنچ نہیں سکے۔"

خیرپور میں

اُن دنوں سندھ پہ میر غلام علی تالپر کا طوطی بول رہا تھا۔ اس نے ۱۸۱۱ء

میں جارحانہ اقدام کر کے کرٹ سنزل کا علاقہ چھین لیا تھا۔ اور ابھی تک وہ ریاست پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ جب نصیر خاں کا بڑا فرزند محمد افضل خاں حاضر دربار ہوا۔ اور خانِ اعظم کی آمد سے مطلع کیا۔ تو وہ بہت خوش ہوا۔ اس نے میر کرم علی خاں تالپر کا بنگلہ شاہی ان کے لیے خالی کرا دیا۔ اور میر غلام حسین خاں تالپر اور اسمٰعیل شاہ ابدالی کو استقبال کے لیے روانہ کیا۔ نصیر خاں شب و روز کی مسافت سے تھک کر چور چور ہو چکا تھا۔ اور پھر عالم پیری فرما پا رہا تھا۔ مگر خوش آمدید کہنے والوں کو جواں مردوں کی طرح ملا۔ اور اُن سے اس طرح ہنس ہنس کر باتیں کیں۔ گویا ایک امیر کبیر سیر و سیاحت کی غرض سے ملک کا دورہ کر رہا ہے۔ اور جب دربار شاہی میں باریاب ہوا۔ تو میر غلام علی اُس سے بغلگیر ہو کر ملا۔ اسے اپنے پاس تخت کے اوپر جگہ دی۔ نہایت ہمدردی اور دلسوزی سے حالات دریافت کیے۔ خلعت فاخرہ اور کئی تھیلیاں اشرفیوں کی مرحمت کیں۔ وزارت عظمیٰ کا قلمدان پیش کیا۔ لیکن اس نمک حلال ملازم نے ریاست بہاولپور کی لاج رکھتے ہوئے جو بیان دیا۔ وہ ہمیشہ یادگار رہیگا۔ کہا۔

"اے سندھ کے بادشاہ! میں آپ کی خدمت میں اس لیے حاضر ہوا ہوں کہ آپ بلوچوں کے قابل فخر سردار ہیں۔ میں آپ کے ہاں رہ کر اپنی عمر بسر کر سکتا ہوں لیکن جب تک آپ کے تعلقات ریاست بہاولپور سے خوشگوار نہیں ہوتے۔ آپ کی ریاست کا کوئی عہدہ قبول نہیں کر سکتا۔

میر غلام علی منصف مزاج حکمران تھے۔ انہوں نے نصیر خاں کی نمک حلالی کی تعریف کی اور پھر بھول کر بھی اس امر کا اعادہ نہ کیا۔ چند ماہ اسی نہج پر گزر گئے کہ ایک دن خان اعظم کا قریبی رشتہ دار عمر خاں بہاول پور سے آیا۔ اس نے نواب صاحب کی طرف سے مراسلہ پیش کیا۔ جس میں اسے واپس آنے کی دعوت دی گئی تھی۔

نصیر خاں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ اے عمر خاں! اپنے نواب سے کہو۔ کہ مجھے یہاں اطمینان کی زندگی بسر کرنے دے۔ مجھے نوکری کی ہوس نہیں ہے۔ اور نہ میں اب سرکار بہاولپور کی کوئی خدمت انجام دے سکتا ہوں ہاں اس امر کا حلف اٹھانے کو تیار ہوں کہ جب تک زندہ ہوں۔ ریاست بہاولپور کے خلاف کسی قسم کی تخریبی سرگرمیوں میں حصہ نہ لوں گا۔ عمر خاں مایوس ہو کر واپس چلا گیا۔

عزت خاں پر جانی

یعقوب خاں کی تمنا پوری ہو چکی تھی۔ اب وہ فتح خاں غوری کی جگہ سپہ سالار بنا ہوا تھا۔ البتہ قادر بخش خاں ابھی تک وزارت کے خواب دیکھ رہا تھا۔ دونوں نے مل کر کئی بار سرکار سے عرض کی۔ کہ نصیر خاں کا خیال تک دل میں نہ لائیے۔ اور کسی دوسرے قابل امیر کو وزیر بنا لیجئے۔ مگر خدا معلوم کیوں سرکار کو ہر وقت نصیر خاں کا فکر دامنگیر رہتا تھا۔ ممکن ہے کہ سلیمہ کو شریک زندگی

بنانے کے خوشگوار خواب دیکھ رہا ہو۔ کیونکہ نواب کے قریب رہنے والوں کا بیان تھا کہ جب سے نصیر خاں اس دیار کو چھوڑ کر گیا ہے۔ نواب صاحب کا کھانا پینا چھوٹ چکا ہے۔ اور وہ اکثر گوشۂ عزلت میں پڑے سوز و گداز کے اشعار پڑھتے رہتے ہیں۔ اسی عالم میں عمر خاں نے واپس آ کر نصیر خاں کا پیغام کہہ سنایا۔ جس سے نواب صاحب کے دل کی کائنات سونی ہو گئی ہر طرف وہی ختم نہ ہونے والی تیرگی نظر آنے لگی اور وہ سوچنے لگے۔ کہ کیا وہ سلیمہ کو ہمیشہ کے لئے کھو چکے ہیں۔۔! کیا فردوس ارضی کی وہ حور پھر انہیں کبھی نہ مل سکے گی۔۔! اس کے ساتھ ہی مائی جیراں کے الفاظ بھی اُن کے کانوں میں گونجنے لگے۔

غزالوں کو شرما دینے والی نشہ بار سرمگیں آنکھیں ——————

نیلے پتلے باقوتی ہونٹ اور ان کے کناروں پر لرزتا ہوا تبسم ——————

کمر تک لہراتی ہوئی سیاہ عنبریں زلفیں ——————

شوخ و شنگ اٹھتی جوانی اور اسکے مسحور کن عشوے ——————

گورے گورے حسین اعضا کا تناسب ——————

بوٹا سا قد ——————

حسین اور لچکدار جسم ——————

نواب صاحب کے قلب و دماغ پر سلیمہ کا خیالی پیکر مستولی ہو گیا۔ اس نے

گھڑیال پر موگری مارنی شروع کی۔ خدام دوڑ کر حاضر ہوئے۔ عزت خاں پرچانی مصاحب خاص گھبرا کر اندر آیا۔ نواب صاحب کا چہرہ اس وقت حد درجہ غمگین نظر آ رہا تھا۔ اس نے خدام کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ اور عزت خاں سے کہا۔

"اے مرد دانشور! نصیر خاں کے ساتھ تیرے ہمیشہ دوستانہ تعلقات رہے ہیں جس طرح بھی ہو۔ اُسے منا کر لا۔" عزت خاں نے دست بستہ عرض کی کہ نصیر خاں کا واپس لے آنا کوئی مشکل کام نہیں ہے حضور مجھ سے وعدہ فرمائیں کہ اس کی جان و مال کو نقصان نہیں پہنچے گا۔ نیز یہ کہ وزارت عظمیٰ کا عہدہ پھر اسے تفویض کر دیا جائیگا۔ اور ساتھ ہی مجھے پندرہ ممتاز امراء ساتھ لے جانے کی اجازت ہو۔

نواب صاحب نے کہا مجھے سب کچھ منظور ہے۔ تم جاؤ۔ اور نصیر خاں کو مع اہل و عیال لے کر آؤ۔

واپسی

عزت خاں نہایت ہوشیار آدمی تھا۔ اُس نے تزنڈہ گور گیج سے نصیر خاں کے چند قریبی رشتہ داروں کو بلوا لیا۔ کچھ امرائے دربار ہمراہ لئے۔ اور عمر خاں کو ساتھ لے کر خیرپور جا پہنچا۔ عمر خاں اور دوسرے گور گیج سرداروں نے نصیر خاں کی اتنی منت سماجت کی کہ شرم و حیا کا وہ حسین پیکر انکار نہ کر سکا۔

عزت خاں نے کہا بزرگوں نے ہمہ یاراں بہشت وہمہ یاراں دوزخ اسی خیال کے پیش نظر کہا ہے یہ کہاں کی مروّت ہے کہ آپ تو عیش اُڑائیں اور آپ کا سارا خاندان جو آپ کے پسینے پر خون بہانے کو ہر وقت کمربستہ رہتا ہے۔ وہاں آپ کی وجہ سے مصیبتیں برداشت کرے۔ اہوش مند۔ انسانوں کا مرنا جینا اپنے آدمیوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ آپ کے عزیز بڑی امیدوں کے ساتھ آپ کو لینے کے لئے حاضر ہوتے ہیں۔ انہیں مایوس نہ کیجئے۔ اور اُن کے ساتھ اپنے وطن عزیز کو تشریف لے چلئے۔

نصیر خاں مسند پر اُٹھ بیٹھا اور عمر خاں سے بولا کہ میں اس شرط پر تمہارے ساتھ جانے کو تیار ہوں کہ تم قرآن کو اس امر کا ضامن دو۔ کہ اگر مجھ پہ وہاں کوئی مصیبت آئی۔ تو تم لوگ میرا ساتھ دو گے۔ ساتھ ہی افضل خاں مصحف مقدس لے کر حاضر ہوا۔ نصیر خاں نے سر آنکھوں سے لگا کر آگے بڑھایا کہ ہاں بسم اللہ کیجئے۔ سب سے پہلے عمر خاں نے ہاتھ رکھ کر حلف اُٹھایا۔ اس کے بعد۔ دوسرے بلوچوں نے قسمیں کھائیں کہ ہم سب کا مرنا جینا ایک ساتھ ہوگا اس پر نصیر خاں کھڑا ہو گیا۔ اس نے میر غلام علی سے جا کر رخصت چاہی۔ جن امراء نے قیام خیرپور میں اس سے مروت کی تھی، ان سب کا شکریہ ادا کیا۔ اور اپنے تمام کنبے اور سامان کو لے کر بہاولپور چل پڑا۔

جعلی چٹھی

نصیر خاں کے واپس آجانے سے یعقوب خاں اور قادر بخش خاں کے ارادوں پر بظاہر اوس سی پڑ گئی۔ لیکن انہوں نے اپنی تخریبی سرگرمیوں کو جاری رکھا۔ نواب صاحب نے گو نصیر خاں کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ نصیر خاں سلیمہ کا نکاح کر چکا ہے۔ تو اس کے دل میں نصیر خاں کے ساتھ پہلا سا اخلاص نہ رہا۔ اور بادشاہ و وزیر دونوں ایک دوسرے سے کھچے کھچے سے نظر آنے لگے۔

یعقوب خاں اور قادر بخش خاں نے اب سرکار پر یہ ظاہر کرنا شروع کیا کہ نصیر خاں حکومت خیرپور سے سازش کر کے آیا ہے۔ اور یقیناً ان کے درمیان بہاولپور کی تباہی و بربادی کا کوئی خفیہ پروگرام ضرور طے پا چکا ہوگا۔ ہر چند بساط سیاست کے یہ شاطر سرکار کو یقین دلانے کی کوشش کرتے مگر نواب صاحب ہنسی مذاق میں اُڑا دیتے۔ ایک دن کرم علی نامی ایک نیم خواندہ مُلّا کو پکڑ لاتے۔ اور ایک خط پیش کرتے ہوئے کہا کہ یہ چٹھی کرم علی کی کتاب کی جلد سے برآمد ہوئی ہے۔ نواب صاحب نے خط ہاتھ میں لے کر پڑھا۔ تو اس میں لکھا تھا۔ کہ

"نواب صاحب بہاولپور کو آج سے ٹھیک ایک ماہ بعد دارالسرور بہاولپور تشریف لے جانا ہے۔ آپ اپنی فوجیں جیسلمیر کی سرحد کے ساتھ

ساتھ ڈیرا اورکو اس طرح لے آئیں کہ کسی کو خبر تک نہ ہو سکے۔ اور قلعہ پر قبضہ کر لیں۔ کوٹ بھاگلہ میں گندم، باجرہ اور چاول کی کافی مقدار پڑی ہے۔ جس سے فوج تازہ دم ہو سکتی ہے۔

نواب صاحب نے کہا کہ میرا تو بہاولپور جانے کا کوئی ارادہ نہیں۔ پھر یہ خط کیا معنی رکھتا ہے۔ دستخط ملا نصرت کے تھے۔ جو وزیر اعظم کا میر منشی تھا۔ یعقوب خاں نے کہا۔ کہ بادشاہ کا ارادہ تو وزیر کا ارادہ ہے اگر آج ہی بہاولپور سے ایسی وحشت خیز رپورٹ منگوالی جائے جس پر سرکار کا وہاں جانا ضروری ہو تو کیا حضور والا تشریف نہیں لے جائیں گے۔!"

قادر بخش خاں نے تائید کرتے ہوئے کہا کہ وزیر کے ذہن میں کوئی ایسی تدبیر ضرور ہو گی جس سے وہ یقین رکھتے ہیں کہ ایک ماہ بعد ضرور آپ کو بہاولپور بھجوا سکیں گے۔

یعقوب خاں نے معاً کہا۔ حضور نے فوج کا راستہ بھی تو ملاحظہ فرمالیا ہے۔ کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا۔ کہ حملہ آور کو یہ راستہ وزیر نے ہی بتایا ہے۔ ورنہ کسی کو کیا علم ہو سکتا ہے کہ بھاگلہ میں اجناس کی اتنی مقدار پڑی ہے۔؟"

نواب صاحب نے فکر مند ہو کر کہا۔ کہ آپ کو یہ خط کیسے ملا؟

یعقوب خاں نے عرض کی۔ یہیں کہاں ملا سرکار۔ یہ تو قبلہ عالم کے بخت

کی یاوری کا کرشمہ ہے۔ ورنہ ایسی خطرناک چٹھی ہمارے ہاتھ کیسے آسکتی تھی صورت حال یہ ہے کہ یہ شخص الہ آباد کے تھانے سے گذر رہا تھا کہ صوبیدار احمد علی نے اس کی بغل میں مجلد کتاب دیکھ کر بلا لیا۔ صوبیدار ندوی علم دوست آدمی ہے۔ وہ کتاب دیکھنا چاہتا تھا۔ مگر اس نے کتاب دکھانے سے انکار کر دیا۔ لیکن اس نے لپک کر چھین لی۔ دیکھا تو گلستان نکلی۔ چونکہ یہ عام درسی کتاب ہے۔ اس لئے اس نے پڑھنے کی جگہ اس کی کتابت اور جلد بندی کا جائزہ لینا شروع کیا۔ جیسا کہ حضور دیکھ رہے ہیں۔ اس کا خط پاکیزہ اور جلد مُذہّب ہے۔ صوبیدار کو خیال گذرا۔ کہ یہ کتاب اس کی نہیں ہو سکتی اور پھر اُسے غور سے دیکھنے پر کچھ شبہ گذرا۔ کیونکہ جلد کا زیریں حصہ کچھ زیادہ دبیز تھا۔ صوبیدار نے اُلٹا کر دیکھنے کی کوشش کی۔ تو اس شخص نے واویلا شروع کر دیا۔ کہ آپ کتاب کی بے حرمت کر رہے ہیں۔ خدا کیلئے واپس کر دیں۔ اس پر صوبیدار نے اس سے اتہ پتہ دریافت کیا۔ تو وہ بھی اُس نے درست نہ بتایا۔ صوبیدار کو یقین ہو گیا۔ کہ یہ کتاب اسرار سے خالی نہیں اس نے اسے تو پولیس کے حوالے کر دیا اور خود گھنٹہ بھر اس کی جلد بندی پر غور و فکر کرتا رہا۔ آخر الامر وہ یہ خط اس میں سے نکال لینے میں کامیاب ہو گیا۔"

سرکار نے غضب آلود نگاہوں سے مُلّا کرم علی کو دیکھا وہ تھر تھر کانپ

رہا تھا۔ پوچھا "کمبخت! سچ بول۔ یہ خط تجھے کس لے دیا۔ اور تو کہاں جا رہا تھا؟"

مُلّا کرم علی سرکار کے آگے دوزانو ہو کر جھک گیا۔ بولا۔

"جہاں پناہ! جان کی امان پاؤں تو سچ سچ عرض کروں"۔

نواب صاحب نے فرمایا۔ کہ جان کی سلامتی کا ہم ذمہ نہیں لیتے تیری مرضی ہے۔ خواہ جھوٹ بول کر منہ کالا کر۔ یا سچ سچ کہہ کر اصل حقیقت بیان کر۔ اگر تو نے سیدھی طرح اصل ماجرا نہ کہہ سُنایا تو ہمیں سچ اُگلوانے کا ڈھنگ بھی آتا ہے"۔

"مُلّا کرم علی نے روتے ہوئے کہا۔

"اے بادشاہ! میں بے قصور ہوں۔ مجھے وزیر نے یہ کتاب دی تھی۔ کہ اسے خیرپور کے وزیر کو دے آؤ۔ مجھے قطعی کوئی علم نہ تھا کہ اس کے اندر کوئی چٹھی بھی ہے ——!"

نواب نے دانتوں کو پیستے ہوئے کہا "نمک حرام!"

یعقوب خاں نے موقع پا کر کہا کہ حضور! کوٹ سبزل جان بوجھ کر دلایا گیا ہے۔ نصیر خاں کی برادری خیرپور کی طرف سے لڑتی تھی۔ اور نصیر خاں سرکار کی فوج کو لڑنے سے روکتا تھا۔ خیرپور کا یہ اقدام جانی بوجھی سازش کے ماتحت تھا ورنہ سندھیوں کی کیا مجال تھی کہ آوچ تک بڑھے چلے آتے"۔

نواب صاحب نے قادر بخش خاں کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ "فوراً

آدمی بھیج کر نصیر خاں اور مُلّا نصرت کو طلب کرو۔"

قادر بخش خاں نے باہر نکل کر محبوب علی خاں کو دو سپاہیوں کے ساتھ وزیر کو بُلانے کے لیئے روانہ کیا۔

ترنانڈہ گورنگج

نصیر خاں کے محلات اگرچہ احمد پور شرقیہ میں بھی موجود تھے۔ مگر خیر پور سے واپس آنے کے بعد اُس نے مستقل طور پر ترنانڈہ گورنگج میں ہی سکونت رکھ لی تھی۔ محبوب علی خاں احمد پور سے وزیر کو لانے کے لیئے روانہ ہوا ہی تھا۔ کہ قادر بخش خاں اور یعقوب خاں نے پھر سرکار کو بھڑکانا شروع کیا۔ کہ

خداوند نعمت! نصیر خاں ایک متفنّی اور مکّار آدمی ہے، وہ اس خط کو کبھی تسلیم نہیں کریگا۔ بہتر ہے کہ اُسے واپس جانے کا موقعہ ہی نہ دیں اور اُسے یہیں ختم کرا دیں۔ ورنہ وہ خیر پور بھاگ جائیگا۔ اور تالپوروں کی بہت بڑی فوج اس ملک پر چڑھا لائے گا۔ نواب صاحب نے کہا یعقوب خاں میں نصیر خاں کے بارے میں فکرمند ضرور ہوں۔ مگر اُسے بلا کر اپنے محل میں قتل کرنا پسند نہیں کرتا۔

قادر بخش خاں نے دست بستہ التماس کی کہ خداوند کا اشارہ چاہیئے نصیر خاں تو آج ہی راستے میں ٹھکانے لگایا جا سکتا ہے۔ یعقوب خاں بولا۔

اس غلام کی مخلصانہ رائے یہی ہے کہ دشمن کو زیادہ کھل کھیلنے کا موقعہ نہ دیا جائے۔ فوج کا ایک دستہ جنگل میں متعین کر دیا جائے جو اس فتنہ کو راستے

ہیں ہی ختم کر دے۔

نواب صاحب۔ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ مجرم کو اپنی صفائی کا موقعہ دیا جائے۔ اور آخر وہ بھاگ کر کہاں جائے گا۔ اس پہ آج ہی خفیہ پولیس مقرر کی جا سکتی ہے۔

قادر بخش خاں۔ حضور والا۔ وزیر بہت خطرناک شخص ہے، دربار، پولیس اور فوج میں اس کے راز دار بھرتی ہو چکے ہیں۔ جو اُسے دم دم کی خبریں پہنچاتے ہیں اگر جہاں پناہ نے موقعہ کھو دیا تو پھر اس کا مداوا نہیں ہو سکے گا۔

نواب صاحب۔ اگر تمہاری مصلحت کا تقاضا یہی ہے تو اجازت ہے لیکن اگر بلوچوں نے بغاوت کر دی۔ تو اس کی ذمہ داری تمہارے سر ہو گی۔

قادر بخش خاں۔ بلوچ —— ! وہ پہلے سے کب خیر خواہ ہیں۔ وہ کھانے تو سرکار کا ہیں۔ مگر دم خیر پور کا بھرتے ہیں۔ پھر ان کی بساط ہی کیا ہے کہ حضور سے بغاوت کریں۔ تر تیرہ میں صرف دس پندرہ جوان ایسے ہیں۔ جو تلوار چلا سکتے ہیں باقی تو سب جولاہے، موچی اور کمہار ہیں۔ لڑنا کیا جانیں ——!"

نواب صاحب نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ اور سر جھکائے کچھ سوچتے رہے۔ قادر بخش خاں نے موقعہ کو غنیمت سمجھا۔ اُسے وزارت کا خواب پورا ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔ اُسے یہ خطرہ گذرا۔ کہ کہیں نواب صاحب اپنا حکم واپس نہ لے لیں۔ تیر کی طرح باہر نکل گیا۔ اور اس کے ساتھ ہی یعقوب خاں بھی

اجازت لے کر روانہ ہوا۔

طلبی

نصیر خاں آج غیر معمولی طور پر فکر مند تھا۔ سلیمہ اُس کے سامنے بیٹھی رومال پر کشیدہ کر رہی تھی۔ افضل خاں مہمانوں کو کھانا بھجوا رہا تھا۔ اکرم خاں اور اجمل خاں باہر ڈیرے پر بیٹھے ملاقاتیوں سے بات چیت کر رہے تھے نصیر خاں یہ سب کچھ خاموشی سے دیکھ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زمانے ہائے دراز کی عقل و دانش اس کے چہرے کی جھریوں میں بل کھائے بیٹھی ہے۔ وہ متاسف ہو کر سلیمہ اور افضل خاں کے شاداں و فرحاں چہروں کا مطالعہ کر رہا تھا۔ اور شاید اس راز سے آشنا تھا کہ یہ فرحت و شادمانی عارضی اور چند روزہ ہے۔ اسی اثنا میں افضل خاں نے آکر عرض کی کہ احمد پور شہر قبیلہ سے محبوب علی خاں حاضر خدمت ہوا ہے۔ کہتا ہے کہ سرکار نے وزیر صاحب کو اسی وقت طلب کیا ہے۔

خان اعظم نے سر اُٹھا کر آسمان کی جانب نظر کی۔ چاروں طرف گھنگھور گھٹا چھائی ہوئی تھی۔ خان بیگم نے کہا۔ یہ وقت نہ جانے کیلئے موزوں نہیں۔ راستے میں ہی شام ہو جائے گی۔ افضل خاں نے کہا۔ عرضی لکھ کر اطلاع بھجوا دیجئے۔ کہ آج موسم خراب ہے۔ کل حاضر ہونگا۔ مگر خان اعظم نے فرمایا۔

"نواب صاحب بہت حساس واقع ہوتے ہیں۔ اگر میں وقت مقررہ پہ نہ پہنچا تو انہیں بڑا رنج ہوگا۔"

یہ سُن کر افضل خاں نے خود ہمراہ چلنے کی اجازت چاہی مگر خانِ اعظم نے انکار کر دیا۔ اور خود لباس بدل کر ایک خادم کو ہمراہ لے احمد پور شرقیہ کو روانہ ہوئے۔

قتل

نصیر خاں کوئی دو میل چلا تھا کہ مغرب کی طرف سے بادل گرجنے کی آواز سنائی دی۔ خانِ اعظم نے آسمان کی طرف دیکھا۔ بادلوں کے تاریک سلسلے درختوں کی چوٹیوں پر جھکے پڑتے تھے۔ جلد ہی ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگی۔ خانِ اعظم نے نوکر کو آواز دے کر کہا۔ بیٹا ابھی چودہ میل کا سفر کرنا ہے گھوڑے کو سرپٹ ڈال دو۔ خان نے بھی رہوار کو ایڑ لگائی۔ دونوں گھوڑے ہوا پر اُڑنے لگے۔ احمد پور سے چار میل کے فاصلے پر ہوں گے کہ مینہ کی چادر نے جو اوچ کی طرف سے بڑھتی چلی آتی تھی۔ انہیں لپیٹ لیا۔ پہلے سڑک اور پھر پاس کے درخت بھی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ یہ دیکھ کر خانِ اعظم نے گھوڑے کی باگ کھینچ لی۔ بائیں جانب ایک بلند اور گھنا درخت نظر آرہا تھا۔ اُس کی جانب گھوڑا لے گئے گھنٹہ بھر دونوں سوار گھوڑے لئے کھڑے رہے۔ عصر کے قریب مینہ تھم گیا۔

لیکن آسمان پر بادل بدستور چھا رہا تھا۔ آہستہ آہستہ گھوڑوں نے سڑک پر چلنا شروع کیا۔ مگر کئی بار خان کا گھوڑا نرم زمین میں کھب کھب گیا۔ مغرب کے قریب احمد پور کا قلعہ نظر آیا۔ خان نے مسکرا کر کہا "الحمدللہ بخیریت آ پہنچے"۔ جب سرکار بہاولپور اس عالم میں بڈھے نوکر کو دروازے پر حاضر پائینگے تو ان کی حیرانی کی انتہا نہ رہے گی۔ اور وہ دل میں کہیں گے کہ نصیر خان میرا کس قدر مخلص اور وفادار ملازم ہے ——— جب بدخواہ میرے خلاف زہر افشانی کرنے لگیں گے۔ تو وہ انہیں جھڑک کر کہیں گے کہ او بدبختو! تم مجھے ایسے نمک حلال ملازم کے خلاف بھکاتے ہو۔ جو دھواں دھار بارش میں بیس میل کی مسافت طے کر کے میرے سلام کو حاضر ہوتا ہے۔ خبردار اگر آیندہ اس پیرمرد کے خلاف ہرزہ سرائی کی تو میں دار پر کھچوا دونگا! ———

اس وقت خان اعظم ایک باغ کے قریب سے گذر رہے تھے۔ ابھی یہ الفاظ منہ میں ہی تھے کہ گھوڑے نے کان کھڑے کئے اور خوب زور سے ہنہنایا۔ ساتھ ہی باغ سے بیک وقت کئی فائر ہوئے اور خان چھلنی چھلنی ہو کر گھوڑے سے نیچے گر پڑا۔ نوکر کود کر قریب پہنچا۔ اور اپنے سردار کو کیچڑ سے نکال کر ایک تودۂ خاک پر لے آیا۔ خان اعظم نے کراہتے ہوئے کہا۔

بیٹا! میری جان نکل رہی ہے۔ تم میرے قتل کے گواہ رہنا۔ اور جب میں مر جاؤں میری لاش کو تنہا چھوڑ کر کہیں نہ جانا۔ ایسا نہ ہو کہ دشمن اسے

کہیں چھپا دیں یا ضائع کر دیں۔ اس کے بعد خانِ اعظم نے لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں کلمہ پڑھنا شروع کیا۔ اللہ کا اسم پاک منہ میں تھا۔ کہ طائرِ روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گیا۔

انتقام

محمد افضل خاں گھر میں بیٹھا سوچ رہا تھا۔ کہ اتنی شدید بارش میں خان احمد پور کیسے پہنچے گا۔ کہ اچانک باہر سے گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز آئی افضل خاں اچھل کر لپکا۔ دیکھا کہ دروازے پر خانِ اعظم کا مشکی گھوڑا پڑا دم توڑ رہا ہے۔ حیرت سے اس کی چیخ نکل گئی۔ گھر کے سب آدمی گھبرا کر باہر نکل آئے۔ افضل خاں نے پکار کر کہا۔ "اجمل بھائی ذرا لپک کر چراغ لے آنا۔" اجمل خاں دوڑ کر لیمپ لے آیا۔ روشنی میں گھوڑے کے بدن سے خون کے فوارے بہتے نظر آئے۔ افضل خاں نے چلا کر کہا "ہائے ابّا ————!" ساتھ ہی گھر کے سب آدمیوں نے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ خان بیگم نے للکار کر کہا۔ کہ "رونا دھونا موقوف کرو۔ فوراً گھوڑوں پر سوار ہو کر احمد پور پہنچو۔ اگر واقعی خان مارا گیا ہے تو اس کا انتقام لو۔"

خان بی بی نے بپھری ہوئی شیرنی کی طرح پھر گرج کر کہا۔

"افضل خاں! دیکھو! میں نے زندگی بھر تمہارے باپ کی امانت میں خیانت نہیں کی۔ اور بغیر وضو کے تمہیں دودھ نہیں پلایا۔ تم اپنے باپ

کے سچے بیٹے ہو۔ ہر قیمت پر قاتل سے باپ کا انتقام لو۔"

بے وقت کی چیخ پکار نے ترنڈہ کی چولیں ہلا ڈالیں تمام گاؤں دوڑا دوڑا آیا۔ اور خانِ اعظم کے محل کے آگے اک جم غفیر جمع ہو گیا۔

افضل خاں اور اجمل خاں گھوڑوں پر زینیں رکھوا چڑھنے کو ہی تھے کہ گل نواز خاں کا آدمی گھوڑا دوڑا کر پہنچا اور چلا کر بولا کہ ملوچہ! تمہارا سردار قتل ہو چکا ہے اور اس کی لاش زبانِ حال سے انتقام انتقام پکار رہی ہے۔

محمد افضل خاں یہ سن کر ماں کے پاس آیا۔ اور قدموں میں گر کر بولا اے مخدومہ! اجازت دے۔ تاکہ میں اپنے باپ کے قاتلوں سے جا کر بدلہ لوں۔ اس کے ساتھ ہی اجمل خاں اور اکرم خاں بھی آ کر قدم بوس ہوئے اور کہا۔ "ابا کے بعد جینا بیکار ہے۔ ہمیں بھی رخصت دے کر بھائی کے ساتھ جا کر داد مردانگی دیں۔"

عمر خاں نے ڈیوڑھی پر سے پکار کر کہا۔

"ترنڈہ کے سب نوجوان اپنے آقا زادوں کے ہمراہ خانِ اعظم کے قاتلوں کے ساتھ لڑنے کو تیار کھڑے ہیں۔ خان بی بی نے قدرے تامل کے بعد فرمایا۔ "اے خانِ اعظم کے مایہ ناز سپوتو! تم بوڑھے باپ کے خون کا بدلہ لینے ضرور جاؤ۔ لیکن جانتے ہو ایک طرف کار آزمودہ شاہی فوج ہے توپیں اور بندوقیں ہیں اور دوسری جانب چند ٹوٹی پھوٹی تلواریں پر دالوں

کا عقابوں سے مقابلہ ہے۔ زندگی کی آس فضول ہے۔ تم سب مرنے کیلئے جا رہے ہو۔ اور کل تم میں سے کوئی زندہ بچ کر نہ آئیگا۔ مناسب ہے کہ جانے سے پہلے اپنی عزت و آبرو کے بچاؤ کا انتظام کر کے جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارے ناموس پر ہاتھ ڈالیں۔ اور نصیر خاں کی بہو بیٹیاں دشمنوں کے شبستان عشرت کی زینت بننے پر مجبور ہوں۔ اسلئے ضروری ہے کہ روانگی سے پہلے گھر کی تمام عورتوں کو ٹھکانے لگا دو۔ تاکہ لڑائی میں تمہیں ان کا فکر لاحق نہ ہو۔

افضل خاں نے کہا۔ ماں! تم ٹھیک کہتی ہو۔ پہلے گھر کا سارا اثاثہ نکالو۔ تاکہ اُسے آگ لگا دیں۔

۴ر صفر ۱۲۲۷ھ کی صبح کو گوریج بلوچوں نے مل کر بڑے خشوع خضوع سے نماز ادا کی۔ اس کے بعد تمام عورتوں نے ایک دوسرے سے کہا سُنا معاف کرایا۔ سلیمہ کو اچھی طرح علم تھا کہ تباہی و بربادی کی یہ گھٹا کس طرف سے اُٹھی ہے۔ اس لئے وہ ہر وقت روتی رہتی تھی۔ خیر لوپ سے واپس آنے پر وہ ایک دن بھی کسی سے مسکرا کر نہ بولی تھی۔ اکرم خاں الگ محجوب تھا۔ وہ بھی جانتا تھا کہ اگر سلیمہ سے شادی کر لنے پر آمادگی ظاہر نہ کرتا۔ تو آج یہ منحوس ساعت پیش نہ آتی۔ سلیمہ خاموشی سے اکرم خاں کے پاس آئی۔ اور بولی۔

اے سرتاج! مجھ بدبخت نے آپ کی کوئی خدمت انجام نہیں دی۔ اور نہ آپ کو خوش رکھ سکی۔ اگر دل میں کوئی ملال ہو تو اس وقت جبکہ ہم سب ہلاکت

دنیا ہی کے گڑھے کی طرف کھچے جا رہے ہیں۔ خدا اور رسول کیلئے معاف فرمادیں۔ ساتھ ہی اس کی نرگسی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے جن سے اکرم خاں کے پاؤں بھیگ گئے۔ اسی طرح اکرم خاں نے ہمدردی اور غمخواری کے فقرات کہے۔ دونوں نے رو رو کر ایک دوسرے کو کہا سنا معاف کیا۔ بلوچوں کے دوسرے گھروں میں بھی یہی کیفیت تھی۔ ہر جگہ سے الفراق الفراق کی دردناک صدا بلند ہو رہی تھی۔ گھنٹہ بھر میں سب عورتیں مرنے کے لئے تیار ہو گئیں۔

خان بی بی نے قیمتی جواہرات جن میں سے ہر ایک ایک لاکھ کی مالیت کا تھا۔ آہنی صندوقوں سے نکال کر بہوؤں کے حوالے کئے جنہوں نے انہیں ہتھوڑوں سے کوٹا اور پھر چکی میں ڈال کر پیس ڈالا۔ اس کے بعد ریشم کمخواب۔ بانات۔ سمور۔ چھینٹ اور ململ کے بیش بہا کپڑے نکالے۔ جن پر طلائی کا کام کرایا گیا تھا۔ ان سب کو مکان کے صحن میں جمع کرنا شروع کیا۔ سلیمہ نے بھی اپنا جہیز لاکر اس ڈھیر پر رکھ دیا۔ تمام قلعہ کے ہر گھر سے کپڑوں کے گٹھے کے گٹھے لائے جا رہے تھے۔ جب سب کپڑے آچکے۔ تو افضل خاں نے اس ڈھیر کو آگ لگا دی۔ کروڑوں روپے کے بیش بہا کپڑے جنہیں نصیر خاں کی بہو بیٹیوں نے بڑے چاؤ سے کناری، گوٹے کے ساتھ سجایا تھا جل کر راکھ ہوتے جا رہے تھے۔ شعلے اٹھ اٹھ کر آسمان سے باتیں کر رہے تھے

اسی عالم میں خان بی بی نے گھر کے زیورات منگائے۔ اور وہ بھی اسی آگ میں ڈال دیئے۔ بیش بہا قالین نادر و روزگار فرنیچر سب نذر آتش کر دیا گیا۔ اس کے بعد افضل خاں نے اصطبل سے گھوڑے منگوائے۔ جوانوں کو پکار کر کہا کہ جس جس کو مرنے مارنے میں ہمارا ساتھ دینا ہو۔ وہ ایک ایک گھوڑا چن لے۔ اسلحہ خانے سے بندوقیں اور تلواریں لائی گئیں۔ وہ بھی اسی طرح جنگ آزما بہادروں میں تقسیم کر دی گئیں۔ جو گھوڑے بچ رہے پاؤں کی رگیں کٹوا کر انہیں بے کار کر دیا گیا۔ اس کے بعد چارپایوں کی باری آئی۔ گاؤں کے غربا کو بلا کر کہا۔ کہ ہمارے سامنے حلال کر کے گوشت بانٹ لو۔ تمہیں کپڑے اور سامان اس لئے نہیں دیا کہ حکومت ہمارے مرنے پر تم سے ایک کے چار وصول کرتی۔ جب سب سامان ٹھکانے لگ چکا۔ تو بلوچوں نے مکانوں کو بھی آگ لگا دی۔ نصیر خاں کے حسین و جمیل محل، بلوچوں کی فردوس تمثال کوٹھیں، اکرم خاں اور عمر خاں کے خوبصورت دو منزلہ سہ منزلہ مکانات جنہیں ہزاروں ارمانوں کے ساتھ تعمیر کیا گیا تھا۔ جن کے لئے سکھر اور حیدرآباد سے کاریگر بلوائے گئے تھے جن پر ہزاروں روپے کی نقاشی کی گئی تھی۔ آج ان کے سامنے مٹ رہے تھے۔ پہر دن چڑھے تک تقریباً سارا گاؤں ختم ہو چکا تھا۔ تونڈہ کا دلفریب اور دلنشیں گاؤں جو رشک فردوس بنا ہوا تھا جلنے کے بعد جہنم بن کر رہ گیا۔

عورتوں کا قتل

دوپہر کو پیاس کے مارے سب کے حلق سوکھ چکے تھے۔ جب گھر ہی نہ رہا تھا تو پانی کہاں سے ملتا۔ خان بی بی نے عورتوں کو پکار کر جمع کیا۔ غم نصیب شریف زادیاں دوڑ کر اس مخدومۂ روزگار کے پاس اکٹھی ہوگئیں۔ خان بی بی نے کہا۔

"اب تم مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ ہر عورت اپنی شلوار کے پائنچوں کو تاگے سے مضبوطی کے ساتھ باندھ لے تاکہ مرنے کے بعد ستر پوشی قائم رہے برقعوں سے اپنے چہروں کو اس طرح چھپا لو کہ کوئی تمہیں پہچان نہ سکے"

اب افضل خاں اور اجمل خاں کنوئیں کے پاس کھڑے ہو گئے باری باری برقعہ میں لپٹی ہوئی ایک ایک عورت کنوئیں کے پاس آتی۔ اور اپنا سر کنوئیں میں جھکا دیتی۔ افضل خاں تلوار کا ایسا بھرپور ہاتھ مارتا کہ سر کٹ کر کنوئیں میں جا پڑتا اور دھڑ کو اجمل خاں اُٹھا کر کنوئیں میں پھینک دیتا۔

اسی طرح بلوچوں کی تمام جوان اور ادھیڑ عمر کی عورتیں برقعے اوڑھ اوڑھ کر آتی رہیں۔ اور نصیر خاں کے غیور فرزند انہیں قتل کر کے کنوئیں میں پھینکتے رہے۔ یہاں تک کہ نہ خان بی بی بچی جس نے افضل خاں اور اجمل خاں جیسے شجاع اور غیور بیٹوں کو جنا تھا۔ اور نہ سلیمہ بیگم بچ سکی جس کے حسن عالم سوز نے یہ دن دکھایا تھا۔

لاشوں سے کنواں قریباً پٹ چکا تھا۔ اور لالہ گوں پانی ابھر کر سطح زمین تک آ گیا تھا۔ کنوئیں سے صدائے عفیف سنائی دے رہی تھی۔ افضل خاں نے آواز دے کر گردو پیش جوانوں کو بلایا۔ کہ آؤ اپنی ماؤں بہنوں اور عورتوں کی لاشوں کو دفن کرو۔ سب جوان کدال اور پھاوڑے لے کر کنوئیں کی منڈیر کو گرانے لگے۔ یہاں تک کہ کنواں مٹی سے بھر گیا۔ افضل خاں نے اس پر قبر کا نشان بنا دیا۔ ان کی یاد میں گرم گرم آنسو بہا کر خوب دل کھول کر رو دیا۔ اور کہا۔

اے مادرِ مہربان! تو نے ہم سے پہلے اپنا فرض ادا کر دیا۔ اب دعا کرو کہ ہم بھی اپنے فرض کو خوش اسلوبی سے انجام دے سکیں ——— !

"اے ترنڈہ کی عفت مآب خاتون! اب آرام سے سوؤ۔ جب تک یہ عالم آباد ہے۔ دنیا میں تمہاری پاکدامنی اور بہادری کا چرچا رہے گا۔ اس کے بعد سب نے مل کر بے وقت مرنے والی مخدرات پر فاتحہ پڑھی۔ مکان ابھی تک پوری شدت سے جل رہے تھے۔ دیواریں شق ہو ہو کر نیچے گر رہی تھیں اور ان میں سے منقش شہتیر اور کڑیاں جل جل کر زبانِ حال سے عزت و آبرو پر مر مٹنے کی دعوت دے رہی تھیں۔ افضل خاں نے نیم باز آنکھوں سے ان پر نظر ڈالی اور پھر لباس کو عطر سے بسا کر گھوڑے پر سوار ہوا۔ شمشیر جوہر دار گلے میں حمائل تھی۔ اور زبان رب بے نیاز کی حمد و ستائش میں مصروف بجا تیوں

اور دوسرے بلوچ سرداروں کو پکارا اور احمد پور کو روانہ ہوا۔

فوجی دستہ ـــــــــــــ

گل نواز خاں نصیر خاں کی لاش کو بڑی شان و شوکت سے ہزاروں آدمیوں کے مجمع کے ساتھ اٹھوا کر خان اعظم کے سکونتی مکان میں لے آیا۔ سر شام ہی سے وزیر کے شہید کے ہونے کی خبر شہر بھر میں پھیل چکی تھی۔ ہر طرف رنج و غم کی ایک لہر دوڑ گئی۔ محل سلطانی میں بھی اطلاع پہنچ چکی تھی۔ نواب صاحب بہت فکر مند تھے۔ قادر بخش نے عرض کی کہ نصیر خاں کی لاش کو سرکاری طور پر جلد دفن کرا دیجئے۔ جلوس نکالنے کا اگر موقع دیا گیا تو شہر میں غدر برپا ہو جائے گا۔ چنانچہ سرکار نے گل نواز کو کہلا بھیجا کہ فتنے کو ہوا نہ دو۔ اور جس قدر جلد ممکن ہو لاش کو دفن کرادو۔ گل نواز خاں نے کہا جب تک مرحوم کے وارث نہیں آچکتے۔ لاش کو دفن کیسے کیا جا سکتا ہے؟ اس پر سرکار نے قادر بخش خاں کو بھیجا تا کہ لاش گل نواز خاں سے لے کر شاہ شمس کے قبرستان میں دفن کرادے۔ ابھی قادر بخش خاں سرکار کے پاس ہی کھڑا تھا کہ محبوب علی خاں کے آنے کی اطلاع ہوئی۔

محبوب علی خاں کا چہرہ گرد آلود ہو رہا تھا۔ اسکے کپڑوں پر مٹی کی تہیں جم رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دُور دراز کی مسافت طے کر کے آیا ہے اس نے دوزانو ہو کر عرض کی۔

جہاں پناہ! میں وزیر کو اطلاع دے کر چینی گوٹ چلا گیا تھا اور اپنے آدمی نزنماڈہ کے نواح میں پھیلا دیئے تھے تاکہ مجھے لحظہ لحظہ کی خبریں پہنچاتے رہیں۔ اب آخری ہولناک خبر یہ ہے کہ نصیر خاں کے لڑکوں نے مکانات کو آگ لگا دی ہے اور اپنی عورتوں کو قتل کر کے کنوئیں میں ڈال دیا ہے اس وقت سترہ نوجوان بندوقوں اور تلواروں سے مسلح ہو کر احمد پور کو لپکے چلے آتے ہیں۔"

نواب صاحب نے گھبرا کر کہا۔

"یعقوب خاں! قادر بخش خاں اور سپاہیوں کا دستہ لے کر فوراً پہنچو اور ان سر پھرے جوانوں کا راستہ روکو۔ خدا کی قسم اگر یہ طوفان شہر میں داخل ہو گیا تو پھر حالات پر قابو پانا دشوار ہو جائے گا۔ چلو۔ چلو۔ دیر نہ ہونے پائے جس طرح بھی ممکن ہو۔ انہیں روکو۔ مگر اُس وقت تک تلوار میان سے نہ نکالو جب تک وہ تم پر حملہ نہ کریں۔

قادر بخش خاں اور یعقوب خاں نے سر جھکا کر سرکار کو سلام کیا اور اُلٹے پاؤں باہر نکل آئے۔

لڑائی

قادر بخش خاں وغیرہ احمد پور سے بمشکل تین چار کوس چلے ہوں گے کہ چینی گوٹ کی طرف سے گرد غبار آتے دکھائی دیئے۔ یعقوب خاں نے کہا۔

کہ "راستہ روک کر کھڑے ہو جاؤ" ——— سپاہیوں نے سڑک پر پڑا جما لیا۔
اب بلوچ قریب آ چکے تھے۔ ان کی آنکھیں فرطِ غیظ سے شعلۂ جوالہ بن رہی تھیں۔ افضل خاں نے آتے ہی یعقوب خاں کو پکار کر کہا۔
"او احمد پور کی کربلا کے شمر! مقابلے کے لئے تیار ہو جا۔!"
یعقوب خاں نے کہا۔
"بھتیجے! لڑنے کا کافی وقت پڑا ہے۔ لڑ لینا۔ پہلے میری بات سن لے"
افضل خاں نے گھوڑے کی باگ کھینچ لی۔ کہا۔ جو کچھ کہنا ہے۔ جلدی جلدی کہہ ڈال!"
یعقوب خاں نے قادر بخش خاں کی طرف دیکھا۔ اور کہا کہ "سرکار کا پیغام تم ہی کہہ سناؤ!"
قادر بخش نے گھوڑا بڑھا کر کہا۔
اے عزیز! تقدیر غالب ہے۔ خانِ اعظم ہمارے دوست تھے انکی موت کا ہمیں بہت صدمہ ہے۔ سرکار کو ہم سے بھی زیادہ رنج ہے۔ قاتلوں کا سُراغ لگایا جا رہا ہے۔ وہ ریاست سے بھاگ کر کہاں جائیں گے نہیں یقیناً کیفر کردار کو پہنچایا جائے گا۔ تم جلد بازی نہ کرو۔ اپنی جوانی پر رحم کرو۔ ہمارے ساتھ محلِ سلطانی میں چلو۔ تاکہ جہاں پناہ وزیرِاعظم کی تجہیز و تکفین کے بعد تمہیں وزارتِ عظمیٰ کا قلمدان عطا فرمائیں"

افضل خاں نے کہا۔

"خان صاحب! تقدیر الٰہی سے چارہ نہیں۔ میرے باپ کو اسی طرح مرنا تھا۔ وہ مر گیا۔ لیکن دنیا کی آنکھوں میں تم دھول نہیں جھونک سکتے۔ تم نے جس طرح کریم دین لاہوری سے جعلی خط تیار کرایا۔ اور جس طرح مُلّا نصرت کے دستخط ثبت کر کے چٹھی الٰہ آباد میں پکڑوائی۔ وہ خانِ اعظم کو بھی معلوم ہو چکا تھا۔ مگر وہ بڑے حوصلہ کے انسان تھے۔ وہ تمہاری طرح لالچی اور فریبی نہ تھے کل چلنے سے پہلے اُنہیں یہ بھی معلوم ہو چکا تھا۔ کہ تم مُلّا کرم علی کو ہمراہ لے کر نواب صاحب سے ڈیڑھ گھنٹہ خفیہ بات چیت کرتے رہے ہو۔ مگر انہیں یقین نہ تھا کہ نواب بغیر سوچے سمجھے اتنا بڑا قدم اُٹھائیگا۔ وہ یہ ستے یلنے ہیں اس لئے گھر سے روانہ ہوتے تھے کہ نواب صاحب پر اپنے اخلاص کا سکّہ جمائیں۔ لیکن زندگی نے وفا نہ کی۔ اور وہ دنیا کے بدترین آدمیوں کے ہاتھوں قتل ہو گئے۔ اب چلو ہمارا راستہ صاف کرو۔ تا کہ ہم اپنے باپ کی لاش کو جا کر دفن کریں ——— !"

یعقوب خاں بولا۔

"برخوردار! تمہارا راستہ کھلا ہے۔ ہم بھی تمہارے ساتھ ہیں۔ مل کر خانِ اعظم کے جنازہ کو کندھا دیں گے۔ اور اعزاز سے دفن کریں گے۔ مگر شرط یہ ہے کہ ہتھیار ہمارے حوالے کر دو۔"

افضل خاں نے کہا۔

"یعقوب خاں! تمہیں محبوب علی خاں کی زبانی یہ تو معلوم ہی ہو چکا ہوگا کہ ہم اپنے آشیانے کو جلا کر اور اپنی ماؤں بہنوں اور عورتوں کو مٹا کر یہاں پہنچے ہیں۔ زندگی کی خواہش اس واقعہ کے بعد کس کافر کو ہو سکتی ہے۔ تم لوگوں نے ہی وزارت کے لالچ میں ہمیں پہلی بار ریاست سے نکلوایا۔ اور ہمارے ہفتاد سالہ بوڑھے باپ کو بے دردی سے قتل کرایا اور اب ہمیں حرام موت مارنا چاہتے ہو۔ اگر بازوؤں میں کچھ دم خم ہے! اگر مکر و فریب کے ساتھ ساتھ لڑنے لڑانے کا کچھ ڈھنگ بھی جانتے ہو!! تو آؤ۔ بہادری کے جوہر دکھاؤ۔ ہم چند آدمی آخر کب تک لڑیں گے۔ ہمارے ساتھ بہادروں کی طرح لڑو۔ اور ہمیں ختم کردو تمہارا یہ بڑا احسان ہوگا۔ لیکن اگر تم یہ چاہو کہ ہم تلواریں تمہارے حوالے کر دیں تو تمہارا یہ مطالبہ قبل از وقت ہے۔ جب ہم مر جائیں۔ یہ تلواریں بھی لے لینا اور ہمارے یہ کپڑے بھی جو ہم نے اس وقت پہن رکھے ہیں۔ کیونکہ مردوں کے مقابلے میں زندوں کو ان کے پہننے کا زیادہ حق ہے!"

یہ کہہ کر افضل خاں نے گھوڑے کو ایڑ لگائی ——— یعقوب خاں نے بڑھ کر روکا۔ اور تلوار نکال کر وار کیا۔ افضل خاں نے لپک کر تلوار اور بندوق چھین لی۔ یہ دیکھ کر قادر بخش خاں نے بندوق سے فائر کیا۔ افضل خاں فوراً گھوڑے سے لگ گیا۔ اور وار خالی گیا۔ اسی اثنا میں اجمل خاں نے

بڑھ کر تلوار کا ایسا بھرپور ہاتھ مارا۔ کہ قادر بخش خاں کا کان کٹ کر دور جا پڑا۔ کہا چچا لو۔ تمہارے لئے اتنا کافی ہے۔ اکرم خاں نے بائیں جانب سے حملہ کیا۔ تلوار زرہ کو کاٹتی ہوئی بدن میں گھس گئی۔ قادر بخش خاں کی چیخ نکل گئی۔ اور گھوڑے سے نیچے گر پڑا۔

افضل خاں سپاہیوں سے دو دو ہاتھ کرتا ہوا اس نرغہ سے صاف نکل گیا۔ باقی جوانمرد ——— بھی اپنے حریفوں کو گھائل کر کے اس سے آ ملے۔ یہ قافلہ پھر آگے کو روانہ ہوا۔

قادر بخش خاں کو اتنی مہلت ملی کہ وہ گھر پہنچ سکا۔ مگر وہاں جاتے ہی مر گیا۔ لیکن یعقوب خاں سنبھل کر پھر تعاقب میں دوڑا۔ احمد پور سے پانچ سو سواروں کا دوسرا دستہ مع توپ کے بھی کمک کو آ پہنچا۔ گوریج بہادر دونوں طرف سے دشمنوں میں گھر گئے۔ افضل خاں اور اکرم خاں نے پلٹ کر پچھلے سپاہیوں کا صفایا کر دیا۔ اور پھر بڑی ثابت قدمی سے آگے بڑھے۔ پہلے بندوقوں سے فائر کرتے رہے اور کئی سپاہی مار گرائے۔ لیکن جب کارتوس ختم ہو گئے تلوار سونت کر دشمنوں پر پل پڑے۔ اگرچہ یعقوب خاں نے بڑی بے جگری سے مقابلہ کیا۔ مگر اس کے سپاہی گوریجوں کے مقابلے میں نہ ٹھہر سکے اور ٹھہرتے بھی کیسے۔ انہیں زندگی عزیز تھی۔ جان کا بچاؤ کر کے لڑتے تھے۔ مگر گوریج موت سے کھیل رہے تھے۔ افضل خاں گرجتا برستا بڑھتا چلا گیا۔ یہاں تک

کہ توپ کے پاس جا پہنچا۔ اور بڑھ کر ایسا وار کیا۔ کہ توپ کا دہانہ کٹ گیا۔ یعقوب خاں ذراہٹ کر برابر فائر کر رہا تھا۔ افضل خاں نے دائیں بائیں نظر کی تو صرف پانچ جاں باز دکھائی دیئے باقی گولیوں کا نشانہ بن چکے تھے افضل خاں نے یعقوب خاں کی طرف گھوڑا بڑھایا۔ ایک سپاہی پڑا دم توڑ رہا تھا۔ گھوڑے سے اُتر کر اُس کے گلے سے کارتوسوں کی پیٹی اتار لی اور پھر دشمنوں پر فائر کرنا شروع کئے۔ اسی عالم میں ایک گولی افضل خاں کے دل کے قریب لگی۔ وہ زخمی ہو کر گر پڑا۔ اس کے جسم سے خون کے فوّارے چھوٹنے لگے۔ اور وہ مرغِ بسمل کی طرح تڑپنے لگا۔ اتنے میں اجمل خاں کو بھی کسی نے گولی کا نشانہ بنا دیا۔ اس نے اللہ اکبر کا نعرہ لگایا۔ اکرم خاں اُسے سنبھالنے کے لئے بڑھا ہی تھا کہ یعقوب خاں نے اس کا بھی خاتمہ کر دیا۔ افضل خاں میں ابھی رمقِ حیات باقی تھی۔ اُس نے سر اُٹھا کر اِدھر اُدھر نظر ڈالی۔ سب دوست اور رفیق ختم ہو چکے تھے۔ کہا۔ الحمدللہ ہم سب اپنے امتحان میں کامیاب ہو گئے۔ اسکے ساتھ ہی ایک ہچکی لی۔ اور ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔ یہ منظر اتنا دردناک تھا کہ آفتاب بھی اسے نظر بھر کر نہ دیکھ سکا۔ اور شفق کے خون میں غوطہ لگا کر غروب ہو گیا۔

لیلیٰ

ماخذ

"تلوار کے دھنی" از احمد حسین خاں

ع

مردان بکوشید تا جامۂ زنان نپوشید

(۱)

"کیوں خاں! دیکھا ——— !! ہمارا اصطبل کیسا ہے ——— !؟"
مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ابراھیم خاں کو اپنا اصطبل دکھاتے ہوئے کہا۔
"اچھا ہے۔ مگر محمد خاں کے اصطبل کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔"
"کیا تم سچ کہہ رہے ہو ابراھیم خاں ——— !" مہاراجہ نے چیخ کر کہا
"تو کیا جھوٹ کہہ رہا ہوں۔ تیرا سارا اصطبل اور محمد خاں کی ایک گھوڑی لیلیٰ ——— !!"
"کیا کہا ——— ! میرا سارا اصطبل اور محمد خاں کی ایک گھوڑی !!"
غصہ سے راجہ کی آنکھ لال انگارا سی ہو گئی اور منہ سے کف بہنے لگا۔
"تم لوگ مبالغہ میں حد سے بڑھ جاتے ہو۔ کیا محمد خاں کی حیثیت مجھ سے زیادہ ہے۔ میں نے ہی اُسے پشاور کی سرداری عطا کی ہے اس کا اصطبل کیا اور اس کی بساط کیا ——— !"
"مہاراج! تم حکومت کے نشے میں حد سے بڑھے جا رہے ہو۔ مجھ سے بھول ہوئی۔ کہ تیرے اصطبل کو اس کی لیلیٰ کے برابر کہہ بیٹھا۔ میں نے محمد خاں

سے بے انصافی کی مہاراجہ صاحب! تو نے تو گدھی گھوڑیاں جمع کر رکھی ہیں۔ یہ اصطبل کیا چیز ہے۔ تیری سلطنت کی تمام گھوڑیاں مل کر بھی لیلیٰ کا معاوضہ نہیں ہو سکتیں ــــــ!"

یہ کہہ کر ابراہیم خاں کرسی پر بیٹھ گیا۔ اُسے یہ احساس بھی نہ رہا۔ کہ مہاراجہ سامنے کھڑا کھول رہا ہے۔ رنجیت سنگھ کے لئے یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ اس طرح کے کئی بے تکلف نواب زادے اس کے پاس آجاتے تھے۔ جن کی لن ترانیاں اُسے سننا پڑتی تھیں۔ ابراہیم خاں بھی کوئی معمولی امیر نہ تھا۔ عمر خاں یوسف زئی کا چھوٹا بھائی تھا۔ اسلئے مہاراجہ اس کی کڑوی کسیلی باتوں کو کڑوے گھونٹ کی طرح پی گیا۔ ابراہیم خاں ابھی تک بھرا بیٹھا تھا اور اس کا چہرہ غصہ سے لال چقندر ہو رہا تھا مہاراج کے درباری سہمی نظروں سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ راجہ طلائی کرسی کو ابراہیم خاں کے قریب کھینچ کر بیٹھ گیا اور بڑی ملائمت سے بولا۔

"کیوں نواب صاحب! اگر لیلیٰ اس اصطبل میں آجائے تو پھر؟"

ابراہیم خاں نے بے تحاشا قہقہہ لگایا۔ کہا لیلیٰ اور یہاں ــــــ!

"میں حکومت کو بازی پر لگا دوں گا" مہاراجہ نے "بازی" کے لفظ پر زور دے کر کہا۔

ابراہیم خاں پھر کھل کھلا کر ہنسا۔ کہا

راجہ! خدا معلوم تم حکومت کیسے کر رہے ہو۔ ذرا یہ تو سوچ جس شخص نے اس کا نام لیلیٰ رکھ چھوڑا ہے۔ وہ اسے تیرے حوالے کیونکر کر سکتا ہے ——— مجنوں سے لیلیٰ کا مطالبہ ——— یہ کیسی حماقت ہے ———!!"

مہاراجہ کھسیانا ہو کر بولا۔ نواب صاحب! آپ نے سچ کہا۔ مگر آپ کو معلوم نہیں۔ محمد خاں میرے اشاروں پر رقص کرتا ہے اس کا بھائی یار محمد خاں بھی میرا خاص آدمی تھا۔ انہوں نے میرے ہی ایما پر سید احمد کو راستے سے ہٹایا۔ اور وہ کچھ کر گذرے جس کی اُمید مجھے خواب میں بھی نہ تھی"۔

"یہ سب صحیح ہے۔ مگر "لیلیٰ" کی اُمید نہ رکھیے!"

مہاراجہ نے جھلا کر سوہن سنگھ کو سلطان محمد خاں کے نام خط لکھنے کا حکم دیا۔ کہ وہ لیلیٰ نامی گھوڑی کو حامل ہذا کے حوالے کر دے۔ اس کے معاوضہ میں منہ مانگا انعام دیا جائے گا۔ میر منشی نے اُسی وقت خط لکھ کر قاصد کے حوالے کیا۔ اور وہ فوراً پشاور کو روانہ ہو گیا۔

(۲)

۱۸۳۰ء میں سید احمد نے جب پشاور کو فتح کیا تھا۔ تو سلطان محمد خاں نے اپنے وکیل فیض اللہ خاں کی معرفت شاہ صاحب سے معافی مانگی تھی جس پر سید صاحب نے افعال ماغیہ سے تائب ہونے اور اپنے علاقے میں شرعی قانون رائج کرنے کے وعدے پر پشاور کا علاقہ اُسے بخش دیا۔ مولانا

سید مظہر علی پشاور کے قاضی مقرر ہوتے۔ اور احکام شرع کا نفاذ ہوا بھنگ چرس۔ افیون کی دوکانیں بند کر دی گئیں۔ چکلے اٹھائے گئے۔ کنواری عورتیں جو بیٹھی بیٹھی بڑھی ہو جاتی تھیں۔ سب کی شادیاں کر دی گئیں۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ نے بہت سے کارندے لوٹے پیسے کے لالچ سے خرید لیے۔ سلطان محمد خاں کو کہلا بھیجا کہ اگر تم سید صاحب کا خاتمہ کرا دو تو تمہیں کابل کا تخت دلا دونگا۔ گویا محمد خاں کی آنکھوں پر بھی حرص کی پٹی باندھ دی گئی۔ اس نے حشر نشر کے خوف سے بے پرواہ ہو کر شاہ صاحب کی حکومت کو مٹانے کا فیصلہ کر لیا۔ ملک سمہ کے خوانین کو ساتھ ملا کر سازش کی گئی۔ کہ جس قدر مجاہدین بغرض تحصیل عشر جا بجا متعین ہیں۔ انہیں ایک ہی رات میں قتل کر دیا جائے۔ جس رات کو قتل عام کے لئے تجویز کیا گیا تھا اس شام کو فیصلہ کے مطابق ہر گاؤں میں نقارے بجائے گئے۔ اور اونچے اونچے مکانوں پر آگ جلائی گئی۔ رات کو جب خدا کا یہ مقدس گروہ نماز ادا کرنے میں مصروف تھا۔ ان کا قتل شروع ہوا۔ کوئی سجدے میں کوئی رکوع میں اور کوئی قیام میں گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیا گیا کسی گاؤں میں آدھی رات کو اور کسی میں طلوع فجر سے پہلے اور بعض بستیوں میں نماز فجر میں یہ مردان خدا جو ملک ہندوستان کے چوٹی کے عالم مفسر۔ محدث اور فقیہ تھے۔ پٹھانوں کے ہاتھوں گاجر اور کیوں

کی طرح ذبح کر دیئے گئے۔

شاہ صاحب کو اس حادثہ نے مایوس کر دیا۔ وہ بچے کھچے رفقا کو ایک محفوظ مقام بالاکوٹ میں لے گئے۔ جس کے تین اطراف میں پہاڑ اور ایک جانب دریائے اٹک پڑتا تھا۔ مگر یہاں بھی افغانوں نے غداری کی اور سکھوں کو اس مخفی مقام کی اطلاع کر دی۔ مہاراجہ نے یہ مہم اپنے بیٹے شیر سنگھ کے سپرد کر رکھی تھی۔ وہ دلیرانہ اکالیوں کا ایک لشکر جرار لے کر ۶ مئی ۱۸۳۱ء کو بالاکوٹ پر چڑھ دوڑا۔ درمیان میں دریائے سندھ حائل تھا۔ اُسے مشکوں کے ذریعے عبور کیا۔ اور شاہ صاحب کی جمعیت پر ایسے عالم میں حملہ کیا۔ کہ انہیں ان کا وہم و گمان بھی نہ تھا۔ سید صاحب اور مولانا محمد اسمٰعیل نے مردانگی کے خوب جوہر دکھائے۔ لیکن اکالیوں نے انہیں اصل فوج سے کاٹ دیا تھا۔ لشکر سپہ سالار کے بغیر اچھی طرح نہ لڑ سکا اور منتشر ہو گیا۔ سید احمد صاحب پر ہتھیاروں کے کوئی سو وار ہو چکے تھے۔ بدن کے ہر عضو سے خون ٹپک رہا تھا۔ یہی کیفیت مولانا محمد اسمٰعیل مولوی خیر دین اور ارباب بہرام خاں کی تھی۔ ٹھیک اس وقت جبکہ سید احمد زخمی ہو کر زمین پر گرے پڑے تھے۔ افغانوں کا ایک گروہ مسٹر گارڈنر کے ہمراہ چند سو گز کے فاصلے سے پہاڑ پر بیٹھا تماشا دیکھ رہا تھا۔ اگر اس وقت افغان ان مٹھی بھر مجاہدین کا ساتھ دینے سے گریز نہ کرتے تو آج ہندوستان

کی تاریخ ہی کچھ اور ہوتی۔

سید احمدؒ اور ان کی فوج کی تباہی سے مسلمانوں میں حیاتِ ثانیہ کی جو اُمید پیدا ہو چلی تھی۔ وہ ختم ہو گئی۔ قوم پرور مسلمان محمد خاں اور اس کے خاندان کو انسانیت کے دامن پر بدنما داغ تصور کرنے لگے۔ ابراہیم خاں بھی اگرچہ اُس خاندان کا ایک فرد تھا۔ جس نے محمد خاں کے ساتھ مل کر سید احمدؒ کے کارندوں کو قتل کرنے میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ مگر یہ اس سازش میں شریک نہ تھا۔ اس نے بھائی کو بڑے اصرار سے منع کیا۔ مگر جب وہ باز نہ آیا۔ تو یہ لاہور چلا آیا۔ جس رات سید احمدؒ کی حکومت کے عہدیدار شہید ہوئے تھے۔ یہ لاہور میں ہی تھا۔ بالاکوٹ کے واقعہ کے بعد اس نے پنج تر[1] جانے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا۔ کہ "وہاں کی سرزمین اب دوسری کربلا بن چکی ہے اور عمر خاں و محمد خاں یزید و شمر کا جامہ اوڑھ چکے ہیں۔ میں اس خطہ میں قدم رکھنے اور اس کردار کے آدمیوں کا منہ دیکھنے کا بھی روادار نہیں۔"

مہاراجہ کے دربار میں کبھی کبھی آتا تھا۔ اور شہزادوں کے مجمع میں راجہ کو جلی کٹی سنا کر چلا جاتا۔ اس نے تھوڑی بہت جو پونجی جمع کر رکھی تھی۔ اس پر سادگی سے گذر اوقات کرتا تھا۔ لیکن خالصہ دربار سے گذر اوقات کے لئے اس نے ایک پائی بھی قبول نہ کی تھی۔ اور نہ ہی پنج تر سے اسے کوئی امداد پہنچی تھی۔

[1] پنج تر یوسف زئی خاندان کا صدر مقام

لیلیٰ کا ذکر چھیڑنے سے اس کا دلی مقصد ہی یہی تھا کہ کسی طرح سکھوں کی محمد خاں سے لڑائی ہو۔ اور وہ مردود قلعہ جو بالاکوٹ کے مجاہدین کی ہڈیوں پر تعمیر ہوا ہے تہس نہس ہو کر صفحۂ دہر سے کالعدم ہو جائے.... جس وقت مہاراجہ کا ایلچی پشاور میں داخل ہوا۔ محمد خاں اور فیض اللہ خاں دارالامارہ میں بیٹھے کابل کے تخت کا خواب دیکھ رہے تھے۔ ملازم نے حاضر ہو کر عرض کی :-

حضور والا! دارالسلطنت لاہور سے ایک قاصد آیا ہے۔ اور حضور میں باریاب ہونے کا آرزومند ہے۔

محمد خاں۔ ممکن ہے کابل پر چڑھائی کا ارادہ ہو۔

فیض اللہ خاں۔ مجھے تو ایسی اُمید نہیں۔

محمد خاں۔ مہاراجہ نے وعدہ کیا تھا۔ کہ اگر سید احمد کو راستے سے ہٹا دو۔ تو کابل کا تخت دلا دوں گا۔ افسوس! ہم نے سید احمد سے صالح حکمران کا خاتمہ کرا دیا۔ ورنہ اگر ہم اس سے تعاون کرتے تو آج کابل سے بنگال تک حکومت الٰہیہ کا ڈنکا بجتا نظر آتا۔

فیض اللہ خاں جب میں سفارت کے سلسلے میں ان کی خدمت میں

---

[1] کی میرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

حاضر ہوا۔ تو انہوں نے صاف الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ مجھے ملک گیری کی ہوس نہیں ہے میں تو اسلام کو سربلند دیکھنے کا متمنی ہوں۔ اگر تم اسلامی نہج پر حکومت چلانے کا اقرار کرو۔ تو زمامِ امارت تمہیں تفویض کرنے کو تیار ہوں۔!"

محمد خاں۔ یہ تو انہوں نے مجھ سے بھی کہا تھا کہ میں تحصیلِ عشر اور انتظام ملک کے لئے جو مجاہدین مقرر کر رہا ہوں۔ یہ سلسلہ عارضی ہے۔ میں تو صرف آپ لوگوں کے لئے زمین ہموار کر رہا ہوں۔ جونہی شرعی احکامات اچھی طرح سے نفاذ پا گئے ہیں جملہ اختیارات آپکو منتقل کردونگا۔ افسوس کہ ہم رنجیت سنگھ کے چکمے میں آ گئے۔ اور ایک ہی رات میں ہزاروں ایسے علماء اور مشائخ کو تہ تیغ کرا دیا۔ جو علم و فضل کے لحاظ سے اپنے زمانہ کے جنیدؒ اور شبلیؒ تھے۔

فیض اللہ خاں۔ آج وہ عہد زرین یاد آتا ہے۔ تو سینہ پر سانپ سا لوٹ جاتا ہے کہ ہائے کیا سے کیا ہو گیا۔ اور ہم اپنی غفلت سے کتنا ناقابل تلافی نقصان کر بیٹھے۔

اسی اثنا میں مہاراجہ کا سفیر حاضر ہوا۔ اور آداب شاہی بجا لانے کے بعد سربمہر لفافہ پیش کیا۔ سلطان محمد خاں نے بیتابی سے لفافہ چاک کر کے خط نکالا اور اُسے جلدی جلدی پڑھنا شروع کیا۔ فیض اللہ خاں محمد خاں

کے چہرہ سے خط کے نفس مضمون کا اندازہ لگا رہا تھا۔ دفعتہً محمد خان کا چہرہ لال بھبوکا ہو گیا۔ غصہ سے دانت پیسنے لگا۔

فیض اللہ خاں "خیر باشد ——— ؟"

محمد خاں۔ راجہ لیلیٰ مانگتا ہے۔

محمد خاں کا جواں لڑکا یحییٰ خاں پاس کھڑا تھا۔ چیخ کر بولا۔

"لیلیٰ"

فیض اللہ خاں نے گھبرا کر کہا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے۔!"

محمد خاں۔ یہ ہماری غدّاری کا نتیجہ ہے"

فیض اللہ خاں۔ "استغفر اللہ۔!"

محمد خاں نے منشی کو بلا کر جواب لکھنے کا حکم دیا۔

"پنجاب کے مغرور راجہ کو معلوم ہو۔ کہ اگر ہم سید احمد کے راستے میں روڑے نہ اٹکاتے۔ اور اس کی منصوبہ بندی کو فیل نہ کر دیتے۔ تو وہ بالاکوٹ میں شہید نہ ہوتے۔ بلکہ اُن کا جھنڈا اکبری قلعہ پر لہراتا نظر آتا۔ اور سکھ قوم صفحہ دہر سے حرفِ غلط کی طرح مٹا کر رکھ دی جاتی۔ ہم نے اپنوں سے غدّاری کی۔ اور تیرے اقتدار کے لئے تقویت کا موجب بنے ہمیں اُمید تھی۔ کہ آپ اپنے وعدوں کو بہت جلد پورا کرینگے۔ مگر جونہی وہ مردِ مجاہد بالاکوٹ میں شہید ہوا۔ ہمارے ساتھ کئے ہوئے وعدے بھی طاقِ نسیاں پر رکھ دیئے

گئے اور آج مجھ سے ایسا مطالبہ کیا جا رہا ہے جس کا پورا کرنا میرے امکان سے باہر ہے۔

اے مہاراجہ! اگر تجھے معلوم نہیں تو سُن۔ لیلیٰ ہیں محمد خاں کی جان ہے۔ کیا مجنوں لیلیٰ کسی قیمت پر بھی دوسروں کے حوالے کر سکتا ہے۔! آپ کے اصطبل کی کیا حیثیت ہے۔ اگر دنیا بھر کی گھوڑیاں اور قارون کا خزانہ بھی پیش کیا جائے۔ تو بھی لیلیٰ کا بال تک نہیں دیا جا سکتا۔ میں آپ کی شاہانہ تمکنت سے توقع رکھتا ہوں کہ آپ پھر ایسا مطالبہ نہ کرینگے

خط لکھ کر قاصد کے حوالے کیا گیا۔ اور وہ روانہ ہو گیا۔

(۳)

جنرل ونٹورہ ———

محمد خاں کو یقین تھا۔ کہ مہاراجہ اپنے اس ارادے سے باز آجائیگا اس لئے وہ بےفکر ہو کر بیٹھ رہا۔ مگر راجہ کو جب محمد خاں کا خط پڑھ کر سنایا گیا۔ تو وہ غصہ سے بےقابو ہو گیا۔ فوراً جنرل ونٹورہ کو طلب کر کے حکم دیا کہ "بیس ہزار لشکر سے پشاور پر اس طرح جا پڑو۔ جیسے کوئی باز اپنے شکار پر جھپٹتا ہے۔ اگر محمد خاں لیلیٰ سے انکار کرے۔ تو اس کے شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دو ———!"

ونٹورہ ایک فرانسیسی افسر تھا۔ اس کے تجربہ کی بڑی دھوم تھی۔

حکم پاتے ہی بڑے ٹھاٹھ سے پشاور کو روانہ ہوا۔

(۴)

ایک دن محمد خاں ظہر کی نماز پڑھ کر مسجد سے نکل رہا تھا۔ کہ دیدبان سے نقارے کی آواز آئی۔ نقارہ خوفناک سے تے میں بج رہا تھا۔ جو شدید خطرے کی علامت تھی۔ اس کے ساتھ ہی ایک نوجوان ہانپتا کانپتا حاضر ہوا۔ حاضر ہوا۔ عرض کی

"حضور! سکھوں کا عظیم لشکر گھٹا کی طرح بڑھا چلا آتا ہے"۔ محمد خاں نے حکم دیا۔ کہ "دمدمے پر خطرے کی توپ سر کی جائے"۔ ساتھ ہی دیوان خانے پر نقارہ بجوانے کا اشارہ کیا۔ ہر طرف نقاروں پر چوٹ پڑنی شروع ہوئی محمد خاں لپک کر دیدبان پر پہنچا۔ دُور سے دشمن کا ٹڈی دل لشکر نظر آیا۔ جلدی جلدی نیچے اُترا۔ مینار کے پاس یحییٰ خاں کھڑا تھا۔ سلام کے لئے جُھک گیا۔ بولا

"مخبر نے اطلاع دی ہے کہ لشکر بیس ہزار پر مشتمل ہے۔ وہ جنرل ونٹورہ اس کی کمانڈ کر رہا ہے"۔

"برخوردار! تم خاصہ فوج کو تیار رکھو۔ اور جو فوجیں باہر سے آئیں۔ وہ فیض اللہ خاں کی تحویل میں رہیں۔ میں محل سے ہو کر ابھی آتا ہوں"۔

محمد خاں محلسرائے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ایوان خاص کے قریب

در میں برآمدے میں لیلیٰ کھڑی تھی۔ نوکروں نے صف باندھ کر فوجی سلام کیا۔ محمد خاں نے لیلیٰ پر ہاتھ پھیرا۔ لیلیٰ ہنہنائی گویا یہ مالک کے پیار کا جواب تھا۔

محمد خاں نے محل میں جا کر مستورات کو کچھ ہدایات دیں۔ ڈیوڑھی پر پہرے کا انتظام کیا اور پھر باہر نکل آیا۔ عصر کی نماز میں لوگوں کا بے پناہ ہجوم تھا۔ امام چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔ کہ

"لوگو! ہم نے سید احمدؒ کی امداد نہ کر کے جس گناہ کا ارتکاب کیا ہے۔ یہ صورت حال اسی لغزش کا ردِ عمل ہے۔ ہم سکھوں سے دبنے والے نہیں ہیں۔ عبد الصمد خاںؒ اور میر منوؒ کی قوم اب بھی ان سے نپٹنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ لیکن لڑنے سے پہلے ہمیں چاہیئے۔ کہ ہم مولیٰ سے اپنی اس لغزش کی معافی چاہیں۔ تاکہ تائیدِ الٰہی ہمارے شاملِ حال ہو سکے"۔

مسلمان دیر تک بارگاہ رب العزت میں گڑگڑا کر توبہ استغفار کرتے رہے۔ نماز سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ قاصد جنرل ونٹورہ کا یہ پیغام لایا۔ کہ

"اب بھی اگر لیلیٰ ہمارے حوالے کر دو۔ تو یہ بڑھتا ہوا سیلاب روکا جا سکتا ہے ——— !

صبح صبح مضافات کے آدمی شہر میں آنے شروع ہو گئے اور انہوں نے رو رو کر بیان کیا۔ کہ سکھوں نے ہمارے گھروں کو لوٹ لیا ہے اور

جوان لڑکیاں پکڑ کر ہمراہ لے گئے ہیں فیض اللہ خاں جوش سے اُبل پڑا کہا "نواب صاحب! مجھ سے زیادہ صبر نہیں ہو سکتا۔ اجازت دیجئے۔ تاکہ میں جا کر دشمن کو اس ایذا رسانی کا مزہ چکھا دوں"۔ محمد خاں نے کہا "ذرا صبر کیجئے۔ پہلے یحییٰ خاں کو جانے دیجئے۔ اس کے بعد ہم دونوں مل کر چلینگے"۔ اُسی وقت یحییٰ خاں کو دو ہزار سواروں کے ساتھ محاذ پر روانہ کیا۔ اور خود مضافات سے آئی ہوئی قبائلی افواج کا جائزہ لینے لگا۔

جنرل ونٹورہ کی فوج سیلاب کی طرح بڑھی چلی آتی تھی۔ یحییٰ خاں نے دو ہزار کی قلیل جمیعت سے اس کے ساتھ جا کر ٹکر لگائی۔ اور دشمن کو عارضی طور پر پسپا کر دیا۔ عقب سے محمد خاں بھی فیض اللہ خان کے ساتھ پانچ ہزار جانباز ہمراہ لے آ پہنچا۔ پٹھانوں نے بہادری کے وہ جوہر دکھائے۔ کہ سکھوں کو چھٹی کا دودھ یاد آ گیا۔ جنرل ونٹورہ نے توپ خانہ سے پٹھانوں کو پامال کرنا چاہا۔ مگر محمد خاں کی حکمت عملی کے آگے اس کی کوئی چال کامیاب نہ ہو سکی۔ آخر الامر عصر کے قریب پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گیا۔ محمد خاں اسے دباتا اور ہٹاتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ آبادی سے کافی دور پیچھے دھکیل دیا۔

رنجیت سنگھ لاہور میں بیٹھا پل پل کی خبریں منگوا رہا تھا۔ اسے جب ونٹورہ کی ہزیمت کی اطلاع ملی تو بوکھلا اُٹھا۔ فوراً کھڑک سنگھ کو تازہ دم لشکر دے کر روانہ کیا۔ جنرل ونٹورہ نے آگے بڑھنے کی بڑی کوشش کی۔ مگر

تمام ناکوں پر پٹھانوں کا قبضہ تھا۔ کامیابی نہ ہوئی۔ آخر کھڑک سنگھ نے سیاسی جوڑ توڑ شروع کیے۔ اور روپیہ پانی کی طرح بہا کر محمد خاں کے کئی رفیقوں کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ دو مہینے اس سازش میں گذر گئے۔ محمد خاں فیض اللہ خاں اور یحییٰ خاں کی راتیں دمدموں پر ہی بسر ہوتی تھیں کشمیری دروازے پر ناصر خاں کا پہرہ تھا۔ اس غدار نے ایک دن شام کے وقت کھڑک سنگھ کو کہلا بھیجا۔ کہ پچھلی نصف شب کو آپ اس دروازے پر حملہ کر دیں معمولی سی جھڑپ کے بعد دروازہ کھول دیا جائیگا۔ جو راستہ سکھوں کے آنے کا تجویز ہوا۔ وہاں بھی ناصر خاں نے اپنے رازدار پہرے پر لگا دیے۔

(۶)

محمد خاں عشاء کی نماز کے بعد کابلی دروازے کی طرف دیکھ بھال کرتا پھرتا تھا کہ کشمیری دروازے کی طرف سے اچانک اُسے لال بتی دکھائی دی۔ یہ خطرے کا نشان تھا۔ محمد خاں گھوڑا دوڑا کر وہاں پہنچا۔ مگر اس کے پہنچنے سے پہلے ناصر خاں کھڑک سنگھ کے لیے دروازہ کھول چکا تھا۔ محمد خاں سارے معاملے کو بھانپ گیا۔ وہ بُری طرح دشمن کے نرغے میں گھر چکا تھا۔ اس وقت ایک متنفس بھی اس کے ہمراہ نہ تھا۔ مگر اس نے اوسان خطا نہ ہونے دیے۔ فوراً گھوڑے سے اترا اور لپک کر دیدبان پر پہنچا۔ یہاں کا پہرے دار ابھی تک لال بتی ہلا رہا

تھا۔ محمد خاں کو دیکھ کر قدموں میں آ گرا۔ بولا "سرکار! آپ یہاں کہاں! دشمن شہر میں داخل ہو چکا ہے۔ کوئی محفوظ جگہ تلاش کیجیے۔!"

محمد خاں نے برہم ہو کر جواب دیا "چپ رہو۔ مسلمان موت سے اس طرح کھیلتا ہے۔ جیسے بچہ ماں کے پستان سے! فوراً نقارے پر چوٹ لگاؤ۔ اور برابر لگاتے جاؤ۔ پھر دیکھو کہ ہم کافروں سے کس طرح مقابلہ کرتے ہیں" پہرے دار نے خطرے کا نقارہ بجانا شروع کیا۔ پٹھان ہڑبڑا کر اُٹھے اور تلواریں سونت کر سکھوں پر آ پڑے۔

محمد خاں نے للکار کر کہا۔

"اے مرداں! بکوشید! تا جامۂ زنان نپوشید!!!"

بھائیو! تم اس قوم سے معرکہ آرا ہو۔ جو رحم اور مروّت سے عاری ہے۔ ۱۸۲۲ء میں رنجیت سنگھ نے بھنگیوں سے زمزمہ توپ طلب کی تاریخ کے اوراق شاہد ہیں۔ کہ بھنگیوں نے کٹ کر مرنا منظور کر لیا۔ مگر لوہے اور لکڑی کی بنی ہوئی توپ اس کے حوالے نہ کی۔ نواب مظفر خاں سے ملتان مانگا۔ اس نے بھی جان دے دی۔ جوان بیٹے ذبح کرا دیئے۔ مگر شہر کی چابیاں سکھوں کے حوالے نہ کیں۔ اے بہادرو! ہمیں یہ کہاں زیب دیتا ہے کہ اپنی محبوب سواری سکھوں کو دے دیں۔ رنجیت سنگھ نے ہمارے جذبات کو کچلنا چاہا۔ اس لیے ہمیں ایک خوددار قوم کی طرح

لڑنا ہوگا۔ مجھے دیکھو۔ میں تمہارے ساتھ ہی ہوں"۔ یہ کہہ کر محمد خاں بجلی کی سی سرعت سے نیچے اُتر آیا۔ ایک سکھ کو تلوار کے وار سے مار گرایا۔ اور اس کا گھوڑا چھین کر چڑھ بیٹھا۔ گھمسان کی لڑائی ہونے لگی۔ کھڑک سنگھ پسپا ہونے پر مجبور ہو گیا۔ محمد خاں اسے دھکیلتے دھکیلتے دروازے سے باہر نکل گیا۔ اس اثنا میں ناصر خاں نے چالاکی سے دروازے کے کواڑ بند کر دیئے۔ محمد خاں نے بڑا واویلا کیا۔ مگر اس کی آواز اسکے جان نثاروں تک نہ پہنچ سکی۔ وہ لاہوری دروازے پر پہنچا۔ مگر یہاں کا نقشہ ہی بدل چکا تھا۔ جنرل ونتورہ محلسرائے سلطانی کے دمدمے پر پہنچ کر اندھا دھند گولہ باری کر رہا تھا۔ فیض اللہ خاں یحییٰ خاں۔ سربلند خاں بڑی بہادری اور جوانمردی سے دادِ شجاعت دیتے ہوئے مارے گئے۔ محمد خاں خفیہ راستے سے شہر میں گھسنا چاہتا تھا۔ کہ تیر سنگھ نے بندوق سے فیر کیا۔ محمد خاں وہیں ڈھیر ہو گیا۔ سارے پٹھان ایک ایک کر کے سردار کی عزت پر کٹ مرے۔ جنرل ونتورہ اور کھڑک سنگھ نے فوج کو عام لوٹ مار کا حکم دے دیا۔ مکانات جلنے لگے۔ اور صدہا سال کی جمع کی ہوئی پونجی سکھوں کی دست برد کا نشانہ بن گئی۔ جنرل ونتورہ نے محل میں داخل ہو کر لیلیٰ کو اپنے قبضے میں لے لیا۔ اور پٹھانوں کے محلات کی تمام قیمتی چیزیں اونٹوں پر لاد کر لاہور کو روانہ ہوا۔

لیلیٰ گویا ابر کی طرح لاہور کو اُڑی جاتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے آقا کی خبر پا کر اُسے لینے جا رہی ہے۔ جب یہ نادرِ روزگار گھوڑی خالصہ دربار میں پیش ہوئی۔ تو رنجیت سنگھ بہت خوش ہوا۔ حکم دیا کہ اسے اصطبل شاہی میں داخل کیا جائے۔ سائیس لیلیٰ کو اصطبل میں لے گئے دوسرے دن صبح کو مہاراجہ نے لیلیٰ پر سوار ہونا تھا۔ چنانچہ مقررہ وقت پر اُسے آراستہ کر کے مہاراجہ کے پاس لے آئے۔ مگر جونہی مہاراج نے رکاب پر ہاتھ رکھا۔ لیلیٰ نے گر کر جان دے دی۔

وَالعَافِینَ عَنِ النَّاسِ

ماخذ

۱۔ پیمانِ وفا ــــ از ایم سلیم ــــــــــ

۲۔ ایفائے عہد ــــ از فانی مرادآبادی ــــــــ

میری وفا کی باتیں، تیری جفا کے قصّے — مجھ کو نہیں ہیں بھولے تجھ کو بھی یاد ہوں گے
میری وفا پہ رونا اب تک ہے اک زمانہ — تیری روش سے کتنے دل ہیں جو شاد ہوں گے

شاہد زمینِ اندلس ہے میری نیکیوں کی
تیرے ستم کی لیکن ہے دے رہی گواہی

(پیمانِ وفا)

خواجہ حسن

خواجہ حسن کو دمشق آئے آج بارہواں روز تھا۔ وہ خلیفہ اندلس کیلئے علامہ ابوالفرج اصفہانی سے ان کی مشہور تصنیف کتاب الاغانی لینے گئے تھے۔ چونکہ انہوں نے اپنے واسطے سامانِ تجارت بھی خریدنا تھا۔ اسلئے چند دنوں کے واسطے اس شہر میں رہ پڑے۔ گو ان کا قیام اپنے اندلسی دوست شیخ عبدالعلی کے ہاں دیر جیکب کے پاس تھا۔ مگر صبح کی نماز ہمیشہ جامع امویہ میں ادا کیا کرتے تھے۔ ایک دن وہ حسب معمول فقرا میں خیرات بانٹ رہے تھے۔ کہ ان کی نظر ایک نوجوان پر جا پڑی جو پھٹا پرانا لحاف اوڑھے مسجد کے ایک کونے میں دبکا بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے سے شرافت اور نجابت کے آثار ظاہر تھے۔ خواجہ حسن نے اس کی مسکینی پر ترس کھا کر چپ چاپ پانچ دینار دینے چاہے مگر اس نے لینے سے انکار کر دیا یہ بتا

"اس میں کچھ شک نہیں کہ میں ایک غریب آدمی ہوں۔ لیکن میں اس شخص کی اولاد سے ہوں جس کے دسترخوان پر روزانہ ہزاروں آدمی کھانا کھاتے تھے۔ میں یہ پانچ دینار قبول کر کے اس کا نام میلا کرنا نہیں

چاہتا۔ ہاں اگر آپ میری کچھ امداد کرنا چاہتے ہیں۔ تو مجھے اپنے ہاں ملازم رکھ لیں۔!"

خواجہ حسن نے اس نوجوان پر متجسّسانہ نظر دوڑاتے ہوئے کہا۔ آپ کا نام ——— !

"میرا نام ادریس ہے اور میں عرب کے مشہور قبیلہ طے سے تعلق رکھتا ہوں ——— !"

"تو گویا آپ حاتم کی اولاد ہیں ——— !" خواجہ حسن نے اُسے گھورتے ہوئے کہا۔

"جی۔ اسی لئے مجھے لوگ ادریس طائی کہہ کر پکارتے ہیں۔"

"بہتر!" اپنے ملازم عارف سے کہا۔ "اس نوجوان کو اپنے ہمراہ ڈیرہ پر لے چلو۔" اور خود اپنے خلیفہ کے جد امجد معاویہ بن عبد الملک کی قبر پر فاتحہ پڑھنے کے لئے گورستان بنو اُمیہ کی طرف روانہ ہو گیا۔

(۲)

نیا ملازم ———

ادریس کو خواجہ کے ملازم شیخ عبد العلی کے مکان پر لے گئے۔ شیخ کا دیوان خانہ اندلسی لوگوں سے بھرا پڑا تھا۔ سب سامانِ سفر درست کرنے میں مصروف تھے۔ ادریس ایک گھڑی تک ان کی چہل پہل سے لطف اندوز

ہوتا رہا۔ اتنے میں خواجہ کے زور زور سے بولنے کی آواز آئی۔ ادریس نے اُٹھ کر دیکھا۔ تو خواجہ حسن ساربانوں سے اُلجھتے بگڑتے آتے نظر آتے۔ معلوم ہوا۔ کہ خواجہ ان سے طنجہ[1] تک کا معاملہ طے کرنا چاہتا ہے۔ مگر وہ مصر سے آگے جانے پر رضامند نہیں ہوتے۔ شیخ عبدالعلی نے بھی انہیں بہتیرا سمجھایا۔ مگر وہ اتنے طویل سفر پر جانے کے لئے راضی نہ ہوتے۔ آخر مصر تک کا ہی فیصلہ ہو گیا۔

ادریس کو دیکھتے ہی خواجہ نے دُور سے سلام کیا۔ اور کہا۔

نوجوان! میں سرزمین اندلس کا ایک تاجر ہوں۔ مجھے اپنے علم دوست بادشاہ نے ایک کتاب خریدنے کے لئے اِدھر کو روانہ کیا تھا۔ الحمدللہ کہ ایک ہزار اشرفی میں کام بن گیا۔ اور اب میں وہ کتاب لئے واپس اندلس جا رہا ہوں۔ اگر تم میں اپنے وطن کو چھوڑنے کی ہمت ہے۔ تو میں تمہیں اپنے ہاں ملازم رکھنے کو تیار ہوں۔ ہاں کچھ کام کرنا بھی آتا ہے ——!

ادریس نے مسکراتے ہوئے کہا۔" اے امیر التجارت میرا خاندانی ورثہ ہے۔ گھوڑ اسواری اور نیزہ بازی میرا محبوب مشغلہ ہے ——!"

بس بس۔ میرے لئے یہی دو اُمور کافی ہیں۔ تو کیا پھر تم چلنے کو تیار ہو ——؟" خواجہ نے متجسسانہ نظروں سے ادریس کے اُتار چڑھاؤ کا

---

[1] مراکش کا ایک ساحلی شہر

جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"ضرور۔ !" یہاں میرے لئے کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی۔ میں بھی خلیفہ عبدالرحمٰن کی طرح اپنی قسمت آزمانا چاہتا ہوں ——— !"

"انشاء اللہ تمہاری قسمت یاور ہے۔" خواجہ نے متبسم ہو کر کہا۔ رات کو ہمارے قافلہ نے کوچ کرنا ہے۔ عارف کے کپڑے لے کر پہن لو۔ اور دمشق کو خوب جی بھر کر دیکھ لو۔ ممکن ہے تمہیں اس جانب پھر آنے کا اتفاق نہ ہو۔"

ادریس خواجہ کو سلام کر کے عارف کے ساتھ اس کے خیمے کو لوٹ آیا اور نوکروں کے ساتھ اس طرح گھل مل گیا۔ گویا وہ اندلس سے ہی ان کے ساتھ آیا ہے۔

۲

واپسی ———

ادریس کپڑے پہن، چند دینار جیب میں ڈال شہر گھومنے چلا گیا تھا۔ باب المکہ کی جانب اس کا ماموں زاد بھائی رہتا تھا۔ اُسے جا کر ملا۔ اور کہا۔ "بھائی! میں اندلس جا رہا ہوں۔ میری بوڑھی ماں کو میرے آخری سلام عرض کرنا اور یہ چند دینار بھی دے دینا۔ اگر خدا نے میری زندگی رکھی۔ تو اندلس پہنچ کر اپنی خیریت سے اطلاع کروں گا۔ اس کے بعد بازار سے

ضرورت کی چیزیں خریدتا جامع اُمویہ آیا۔ یہاں عصر کی نماز پڑھی اور شکرانے کا دوگانہ ادا کیا۔ پھر پھرا کر جب واپس ڈیرہ پر پہنچا۔ تو وہاں عجیب نقشہ نظر آیا۔ بے شمار اونٹ کھڑے بلبلا رہے تھے۔ نوکر چاکر سامانِ تجارت لادنے میں مصروف تھے اور خواجہ حسن چل پھر کر سامان کا جائزہ لیتے پھرتے تھے ادریس کو آتا دیکھ کر خندہ پیشانی سے بولے۔

"برخوردار! یہ قافلہ خدا اور رسول اور آپ کے سپرد ہے۔" تلوار کو نیام سے نکال کر ایک بار اُلٹ پلٹ کر دیکھا۔ اور ادریس کو مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہا۔ بیٹا۔ یہ تلوار خلیفہ مرحوم کی نشانی ہے اس مجاہد نے مجھے مراکش کی جنگ میں انعام کے طور پر مرحمت کی تھی۔ خدا شاہد ہے کہ میں نے اس کا حق خوب ادا کیا۔ لو اب یہ تاریخی یادگار تیرے حوالے کرتا ہوں عارف کو اشارہ کیا کہ سوڈانی سرخ اونٹ جو میں نے اپنی سواری کے لئے خریدا تھا۔ اسے آراستہ کر کے لے آؤ۔ عارف لپک کر گیا اور اس اونٹ پر پالکھڑا رکھ کر لے آیا۔ خواجہ نے اس کی مہار ادریس کے حوالے کی۔ اور ساتھ ہی ایک فولادی نیزہ جو اس کا دوسرا خادم یوسف لئے کھڑا تھا۔ ادریس کو پکڑوایا۔ کہا جب قافلہ روانہ ہو۔ اس کے عقب میں رہو۔ اور جب منزل پر اُترے اس پر پہرہ دو۔!"

ادریس نے جھک کر شکریہ کے طور پر سلام کیا اور کہا "میرے آقا۔

اگر خدا نے چاہا۔ تو آپ مجھے ہر طرح سے قابل اعتماد پائینگے۔"

سامان تقریباً لد چکا تھا۔ خواجہ نے عشا کی نماز ادا کی۔ اور اس کے بعد کوچ کا حکم دیا۔

شب خون

خواجہ حسن کا یہ مختصر سا قافلہ جس میں کئی اندلسی مسافر بھی شامل تھے اطمینان سے منزلیں طے کرتا چلا جا رہا تھا۔ بالعموم رات کے پچھلے پہر کوچ ہوتا اور پھر دن کو آرام کرنے کیلئے کسی پڑاؤ پر ٹھہر جاتا۔ ادریس نہایت دیانتداری سے اپنے فرائض انجام دیتا چلا آ رہا تھا کہیں خواجہ کو شکایت کا موقعہ نہ دیا ایک ماہ کے بعد برقہ اور مکناسہ سے ہوتا ہوا یہ قافلہ طلیطلہ جا پہنچا۔ چونکہ ابھی جہاز کے چلنے میں کئی دن رہتے تھے۔ اس لئے ساحل کے قریب ہی خواجہ نے پڑاؤ ڈال دیا۔ ظہر کے قریب ساحل کے فوجی افسر کا پیغام ملا کہ مجوسیوں کے جہاز بالعموم رات کو اتر کر ساحلی علاقے پر حملہ کیا کرتے ہیں اگرچہ ہماری پولیس بھی ہوشیار رہتی ہے تاہم آپ لوگوں کا چوکنا رہنا بھی ضروری ہے۔ خواجہ حسن نے اپنے قافلے کے چیدہ چیدہ نوجوانوں کو جمع کر کے پہرہ پر لگا دیا۔ اور ادریس کو ان سب کا نگران مقرر کیا۔ یہ مقام جہاں خواجہ حسن کا قافلہ خیمہ زن تھا شہر سے فرلانگ بھر کے فاصلہ پر تھا۔ اسلئے انہیں بحری قزاقوں کی تاخت کا چنداں خوف نہیں تھا کبھی کبھی ادریس

کا "احد، احد" کا نعرہ ٹیلہ کی پرسکون فضا میں گونج اٹھتا۔ دوسری جانب بحری پولیس کی "قوموا، کم تناموا" کی پکار سنائی دے رہی تھی۔ پچھلی رات کو خواجہ حسن اور اہل قافلہ بھی تہجد کے لئے جاگ پڑتے تھے۔ اسی عالم اور کیفیت میں ایک ہفتہ گذر گیا۔ مسافروں کی آنکھیں جہاز کی راہ دیکھتے دیکھتے تھک گئیں۔ ایک دن غروب آفتاب کے وقت سطح سمندر پر جہاز کے مستول نظر آئے۔ سب کی جان میں جان آئی۔ ہر شخص سامان باندھنے لگ گیا۔ مگر عشا تک یہ جہاز ساحل پر لنگر انداز نہ ہوا۔ پولیس افسر خود گشت کرتا ہوا قافلہ میں آیا۔ اور خواجہ حسن سے بولا۔ دیکھئے حضرت! کہیں یہ جہاز زرمندیوں کا نہ ہو۔ آپ آج ذرا زیادہ ہوشیار رہیں۔ انہیں خبردار کرتا پولیس افسر مراکشی مسافروں کے ہاں روانہ ہو گیا۔ جو تھوڑے سے فاصلے پر اگاڑ پڑا اور ڈالے پڑے تھے۔ آدھی رات کے قریب اچانک مراکشی خیموں سے "حرامی، حرامی" کا شور بلند ہوا۔ پولیس ادھر متوجہ ہوئی۔ خواجہ کے من چلے نوجوان پہرے دار بھی انہیں بچانے کے لئے لپک کر پہنچے۔ خواجہ حسن نے خادموں کو پکار کر کہا۔ کہ تم بھی تیار رہو۔ ایسا نہ ہو کہ مجوسی انہیں چھوڑ کر ہم پر آ پڑیں۔ خواجہ کا خدشہ صحیح ثابت ہوا۔ ابھی تھوڑی دیر ہی گذری تھی کہ مجوسیوں کا زبردست لشکر چکر کاٹ کر صحرا کی جانب سے قافلے پر آ پڑا۔ اور اسے لوٹنے لگا۔ زرمندیہ کے سردار نے اپنی زبان میں چلا کر کہا۔ کہ

"جو غلام میرا ساتھ دینگے۔ میں انہیں آزاد کردونگا۔ اور لوٹ
کے مال سے بھی بہت کچھ دوں گا۔"

اس آواز کے جواب میں کئی ایک خیموں سے "ہم تمہارے ساتھ ہیں" کی آوازیں آنے لگیں اور ساتھ ہی نمک حرام حبشی غلام لٹیروں کے ساتھ مل کر اپنے قافلے میں ہی لوٹ مار کرنے لگے۔ خواجہ حسن تلوار ہاتھ میں لئے خیمہ کے دروازہ پر کھڑا تھا۔ کہ اس کے حبشی غلاموں نے دفعتہً اسے دبوچ لیا۔ اور مشکیں باندھ کر وہیں خیمہ کے ایک کونے میں ڈال دیا۔ ادریس دوسرے خیمہ میں سامانِ تجارت پر پہرہ دے رہا تھا۔ چھ سات مجوسی بھالے ہاتھ میں لئے اس پر حملہ آور ہوئے۔ لیکن ادریس نے ان کا کوئی وار کارگر نہ ہونے دیا۔ اور آن کی آن میں دُور سے ہی دو تین لٹیروں کو نیزے کی انی سے چھید ڈالا اور باقیوں کو بھگا دیا۔ ادریس کو اپنے مالک کی بڑی فکر تھی۔ باز کی طرح جھپٹ کر اس کے خیمہ میں پہنچا۔ یہاں حبشی غلام لٹیروں کے ساتھ مل کر خواجہ کے زر و جواہر کے صندوق خیمے سے باہر نکال رہے تھے۔ خواجہ اوندھے منہ زمین پر پڑا تھا۔ ادریس نے پھرتی سے رسیوں کے بند کاٹ کر خواجہ کو آزاد کیا۔ اپنی تلوار اس کے حوالے کی اور خود نیزہ تان کر چیتے کی طرح نمک حرام غلاموں اور لٹیروں پر پل پڑا۔ عارف بھی مجوسیوں کے پھندے سے نکل آیا تھا۔ تینوں نے انتہائی جگری سے مقابلہ کیا۔ کہ لٹیرے پسپا ہو کر پیچھے ہٹ گئے

اتنے میں بحری پولیس اور شہر کے آدمی بھی امداد کو آپہنچے۔ اہلِ قافلہ کا حوصلہ بڑھ گیا۔ ہر طرف سے برچھے بھالے چمکنے لگے۔ نورمندی بوکھلا اُٹھے۔۔ ان کے آدمی گاجر مولی کی طرح کٹ رہے تھے ــــــــ سردار نے جب یہ کیفیت دیکھی تو ناقوس بجا کر انہیں واپس لوٹنے کا حکم دیا۔ چنانچہ جو مال اُن کے ہاتھ میں تھا۔ اُسی کو غنیمت جان قزاق رات کی تاریکی میں گم ہو گئے۔

اس حادثہ میں اہلِ قافلہ کے آٹھ دس آدمی مارے گئے تھے۔ اور چھ سات زخمی پڑے تھے۔ مسافروں کا کافی نقصان ہوا تھا۔ مگر خواجہ حسن کا سامان نورمندیوں کی لوٹ کھسوٹ سے صحیح سالم بچ گیا تھا۔ اور یہ سب کچھ ادریس کی نمک حلالی اور جان نثاری کے طفیل تھا۔ خواجہ حسن نے سب لوگوں کے سامنے اس کی بہادری اور وفاداری کی تعریف کی اور اسی دن سے اُسے اپنا مصاحب بنا لیا۔

خلیفہ الحکم کے دربار میں ــــــــ

خواجہ حسن کا قافلہ بخیر و خوبی قرطبہ میں پہنچ چکا تھا۔ ادریس کو یہ مینو سواد خطہ بہت پسند آیا۔ اسکی سرسبزی اور شادابی دمشق سے کچھ کم نہ تھی۔ شہر کے باہر خواجہ کے کئی باغات اور عالیشان مکانات تھے۔ قرطبہ میں اس سے زیادہ اور کوئی متمول سوداگر نہیں تھا۔ دو تین دن آرام لینے کے بعد خواجہ ادریس کو ہمراہ لے کر اندلس کے علم دوست شہنشاہ خلیفہ الحکم کے دربار میں حاضر ہوا۔

ادریس اگرچہ دمشق جیسے متمدن شہر سے آیا تھا۔ اور وہ اموی محلات اور ان کی سج دھج کو بھی دیکھ چکا تھا۔ مگر مدینتہ الزہرا کی چکا چوند سے اسکی آنکھیں خیرہ ہو گئیں خواجہ حسن نے محل کے سنتری کو اپنی انگوٹھی دکھائی۔ جس پر اس نے ادب سے سلام کرنے کے بعد ایک سپاہی ساتھ کر دیا۔ کہ انہیں شہنشاہ کے حضور میں لے جاؤ"

خواجہ حسن نے ادریس کو پارے کا حوض دکھایا۔ جو دیوان عام کے وسط میں بنا ہوا تھا۔ ادریس آبنوس اور ہاتھی دانت سے بنے ہوئے دروازے دیکھنے کے لئے رُک گیا۔ خواجہ نے مسکرا کر کہا کہ ان دروازوں پر جو جواہرات ٹکے ہیں۔ یہ میں نے فراہم کئے تھے۔ ادریس نے متعجب ہو کر کہا آخر اس اس اسراف کی غرض و غایت۔؟"

خواجہ نے کہا" ادریس بھائی! ایسا نہ کہو۔ خلیفہ کا مقام اسراف سے ورا الورا رہے۔ یہاں کوئی چیز حکمت سے خالی نہیں۔ مثلاً اسی تالاب کو ہی لے لیجئے۔ آپ دیوان عام کے اندر جا کر دیکھیں گے کہ دن کی تابش سے بچنے کے لئے اُسے کچھ ایسا گھٹا ٹوپ سا بنایا گیا ہے کہ اگر یہ تالاب نہ ہو تو دن کو بھی اُس میں کچھ نظر نہ آتے۔ لیکن جب سورج کی شعاعیں دروازوں سے گذر کر اس حوض پر پڑتی ہیں۔ تو پارے میں جنبش سی پیدا ہوتی ہے اور شعاعیں منعکس ہو کر کمرے میں اس انداز سے پڑتی ہیں۔ کہ وہ جگمگا اُٹھتا ہے الغرض خواجہ اور ادریس اس طلسماتی محل میں داخل ہوئے جس میں ساٹھ برس کا خضر

معرفت سلطان دربگاہ مرصع تخت پر بڑے ٹھاٹھ سے اجلاس کر رہا تھا اسکے دائیں بائیں اندلس کے بڑے بڑے امراء اور وزراء اپنے اپنے مرتبے کے مطابق کھڑے تھے۔ خواجہ نے چند قدم آگے بڑھ کر کتاب "الاغانی" کا بیش قیمت نسخہ پیش کیا۔ اور ساتھ ہی ادریس کو سامنے کرتے ہوئے عرض کی۔ کہ اگر یہ نوجوان ہمراہ نہ ہوتا تو خادم زندہ و سلامت حاضر حضور نہ ہو سکتا۔" خلیفہ نے ادریس پر شفقت سے نظر کی۔ اور فرمایا۔ میرے وطن کے قابل فخر نوجوان! ہم تمہیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ ابن عامر وزیر اعظم سے فرمایا کہ خواجہ حسن اور اس نوجوان کو خلاع فاخرہ اور ایک ایک ہزار دینار سے سرفراز کیا جائے اور خود کتاب کی ورق گردانی میں مصروف ہو گیا۔ خواجہ حسن اور ادریس خلاع فاخرہ اور انعام سے شادکام ہو کر رجعت قہقری کرتے ہوئے واپس لوٹ آئے۔

خواجہ حسن بستر مرگ پر

خواجہ حسن نے اپنا تمام کاروبار ادریس کے سپرد کر دیا۔ اس نوجوان پر اس قدر اعتماد تھا کہ اس نے حساب کتاب کی جانچ پڑتال تک ترک کر دی۔ روزانہ ہزاروں روپے کی آمد ہو رہی تھی۔ دیانتداری۔ رحمدلی اور معاملہ کی صفائی نے ادریس کو اندلس بھر میں مشہور کر دیا تھا۔

خواجہ حسن پر اب ضعیفی کا عالم طاری ہو چکا تھا۔ اس نے اولاد کیلئے

پے بہ پے پانچ شادیاں کی تھیں۔ مگر پھر بھی اس کی گود اولاد نرینہ سے خالی ہی رہی۔ ساٹھ سال کی عمر میں وہ ایسے مرض میں مبتلا ہوا کہ اس سے جانبر نہ ہو سکا مرتے وقت اس کی صرف ایک بیوی زندہ تھی۔ اور وہ بھی اپنی عمر کی پچاس منزلیں طے کر چکی تھی۔ اس نے وصیت کی۔ کہ کل جائداد کا چوتھا حصہ مذہبی امور پر صرف ہو۔ ایک حصہ بیوی کو دیا۔ باقی تمام جائیداد منقولہ و غیر منقولہ ادریس کو تملیک کر دی۔ خواجہ کے ملنے جلنے والے ادریس کی قسمت پر رشک کر رہے تھے۔ لیکن وہ خواجہ کے قدموں پر سر رکھے رو رہا تھا۔

شیخ ادریس احمد

اندلس کا علم دوست شہریار خلیفہ الحکم اور ادریس کا مربی خواجہ حسن دونوں سرائے فانی سے عالم جاودانی کو انتقال کر چکے تھے۔ ۳۶۶ھ میں جبکہ ہشام بن الحکم کی عمر صرف دس سال تھی۔ اُسے اورنگ نشین کر کے محمد بن ابی عامر وزیر اعظم سیاہ و سفید کا مالک بن بیٹھا۔ اور خلیفہ کے نام کے بعد خطبہ میں اپنا نام بھی پڑھوایا۔ دمشق کا غریب الحال مسافر اب شیخ ادریس احمد کے نام سے پکارا جا رہا تھا۔ اس نے اپنے آقا کی وصیت کو حرف بحرف پورا کیا۔ ایک وسیع اور دلکشا باغ میں خواجہ حسن کا حسین و جمیل مقبرہ تعمیر کرایا۔ بے شمار زر و مال ایصال ثواب کے لئے خدا کی راہ میں خرچ کر ڈالا۔ کئی غلام آزاد کئے۔ خواجہ کی بیوی کو ہمیشہ مثل ماں کے تصور کرتا رہا۔ شیخ نے اب تک شادی

نہیں کی تھی۔ خواجہ کی بیوی زینب نے ایک متمول گھرانے میں اس کی شادی
کرادی۔ اس سے خدا نے ایک چاند جیسا بچہ عنایت کیا۔ جس کا شیخ نے اسحاق
نام رکھا۔

ادریس احمد مولود کو نہلا دھلا کر خواجہ کی بیوی کے پاس لے گیا اور
اس کی گود میں ڈال کر کہا۔ کہ یہ آپ کا ہی بچہ ہے۔ اور اس کی تربیت کا فرض
بھی آپ ہی نے ادا کرنا ہے۔ زینب اسحاق کو گود میں لے کر بہت خوش ہوئی
اور اسے اولاد کی طرح پالنے لگی۔ جب اسحاق پانچ برس کا ہوا تو زینب نے قرطبہ
کے بہت بڑے عالم مولانا محمد الیاس کو اس کا اتالیق مقرر کیا۔ انہوں نے اس
شفقت اور توجہ سے اسحاق کو تعلیم دی۔ کہ وہ چند ہی سال میں قرآن مجید کا
بہترین قاری صحاح ستہ اور علوم متداولہ کا عالم بن گیا۔ اسکی دستار بندی کی رسم
خود وزیر اعظم المنصور نے ادا کی۔ جو اندلس کے سیاہ و سفید کے مالک ہونے
کے باوجود اپنے زمانے کا بہترین عالم بھی تھا۔ گھوڑ اسواری اور نیزہ بازی
اسحاق کا موروثی فن تھا۔ وہ فارغ وقت میں عارف سے اس کی تربیت
بھی لیا کرتا تھا۔ اس وقت اسحاق اپنی زندگی کی اکیس بہاریں دیکھ چکا تھا
شیخ ادریس پر بڑھاپا چھا گیا تھا۔ اب وہ اسحاق کی شادی کی فکر میں تھا
اس کا نسبتی بھائی شیخ عبد الکریم اندلس کا بہت بڑا سوداگر تھا۔ اس نے
کئی شادیاں کی تھیں لیکن سوائے ایک لڑکی کے اس کی اور کوئی اولاد

نہ تھی۔ یہ شیخ ادریس احمد نے اپنی بیوی کی معرفت اسحاق کے لیے رشتے کی تحریک کی وہاں کیا دیر تھی۔ فوراً قبول کر لی گئی۔ اور ایک سعید ساعت میں شیخ ادریس اپنے جگر گوشے کو لے کر گئے۔ اور عمائدین شہر کی موجودگی میں میاں اسحاق کی نسبت طے پا گئی۔

اسحاق

اسحاق نہایت بہادر اور منچلا نوجوان تھا۔ اس نے صلیبی جنگوں میں بڑے کارنامے انجام دیئے تھے۔ دو تین مرتبہ تیر اندازی کے مقابلے میں بازی لے گیا تھا۔ اسکا نام غیر معمولی شجاعت کے سبب اندلس، فرانس اور مراکش تک مشہور ہو چکا تھا۔ ہر سال عید الفطر کے موقعہ پر مردانہ کھیلوں کی نمائش ہوتی تھی۔ عرب گھوڑ دوڑ، تیر اندازی اور نیزہ بازی کے عاشق تھے اس تقریب پر ان چیزوں کا خاص طور پر مظاہرہ ہوتا تھا۔ ۳۹۰ھ میں بھی خلیفہ کی طرف سے حسب معمول صراحی اور طشت خالص سونے سے تیار کرائی جا چکی تھی۔ اس امر کی بھی شہرت تھی کہ اس میں قیمتی جواہرات بھی جڑے گئے ہیں اور یہ مرصع کار صراحی کسی صورت بھی کئی ہزار روپوں سے کم قیمت نہیں۔

شیخ ادریس اپنے بیٹے کی بہادری کی داستانیں سن سن کر دل ہی دل میں خوش ہوتا تھا۔ مگر وہ اپنے رفیقوں اور دوستوں سے بالعموم کہا کرتا تھا کہ میں نے گمنامی میں ہی سربلندی حاصل کی ہے۔ جب کوئی شخص منظر عام

پر آجاتا ہے۔ تو اس کے لیے ثمار رقیب پیدا ہو جاتے ہیں۔ جو اس کی ترقی کی راہ میں سنگِ گراں بن کر رکاوٹیں ڈالتے رہتے ہیں۔ چنانچہ وہ اسحاق کا ایسے مقابلوں میں حصہ لینا دور اندیشی کے خلاف سمجھتا تھا لیکن چونکہ شیخ عبدالکریم ذرا وجاہت پسند واقع ہوئے تھے۔ اور اسحاق کی طبیعت کا رجحان بھی اسی طرف تھا۔ اس لیے وہ نہ چاہنے کے باوجود بھی سب کچھ کر گذرتے تھے۔ جمعتہ الوداع کے موقعہ پر شیخ عبدالکریم جب ان سے ملنے آتے۔ تو انہوں نے رازدارانہ طور پر اسحاق کی موجودگی میں ان سے کہا۔

"بھائی! میں چراغِ سحری ہو رہا ہوں۔ اب تم جانو اور تمہارا اسحاق! مگر بڈھے کی ایک سُن لو۔ کہ ابی عامر دستورِ اعظم اپنی کامیابی اسی میں سمجھتا ہے کہ عربوں کا اقتدار گھٹ جائے اور بربری بساط سیاست پر چھا جائیں اسی لئے اس لے صنہاجہ، مغراوہ، بنی نفیزن، بنی بزدال اور مکناسہ کے ماہرین فن بھرتی کر کے فوج کو عربوں سے یکسر پاک کر دیا ہے۔ چنانچہ وہ اسحاق کی کامیابیوں کو بھی تخدوش نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ لہٰذا بہتر ہے کہ آپ لوگ تجارت کو چھوڑ کر حرب و ضرب کے میدان میں کودنے کی کوشش نہ کریں ——————!"

عبدالکریم کو شیخ ادریس احمد کی حکمت اور دانش سے بھری ہوئی یہ باتیں بے حد پسند آئیں۔ اس نے کہا۔

حضرت یہ تقریب تو خوش اسلوبی سے گذار دیجیے۔ دعا فرمایئے کہ بدستور سابق اس دفعہ بھی اسحاق دنیا کی نظروں میں سربلند و سرفراز ہو، آئندہ کے لیئے میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اسحاق اس طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے گا۔ اسحاق نے بھی مامون کے خیال کی تائید کی جس پر شیخ مسکرا کر چپ ہو رہا۔ اور اسحاق افطاری کا انتظام کرانے کے لیئے محلسرائے کو چلا گیا۔

عید الفطر کا جشن

۷ شوال ۳۹۰ھ

آج عید الفطر کے جشن کا آخری دن تھا۔ لاکھوں کی تعداد میں تماشائی مدینۃ الزاہر کے سامنے پریڈ کے میدان میں جمع ہو چکے تھے۔ نیزا انداز مسند شاہی کے قریب گھوڑوں پر چڑھے نیزے سنبھالے خلیفہ کا انتظار کر رہے تھے۔ ٹھیک دس بجے کوکبہ شاہی نمودار ہوا۔ روشن چوکی میں نقاروں پہ چوٹ پڑی اور شہنائی و نفیریوں کی بلے ہنگم صدا نے آسمان سر پر اٹھا لیا آگے آگے عرب نوجوان گھوڑوں پر سوار تھے ان کے پیچھے بربری اپنے مشکی گھوڑوں کو اڑائے چلے آتے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں زنگا زنگ کے وہ

جھنڈے تھے۔ جو مجاہدین اسلام نے عیسائیوں سے متعدد لڑائیوں میں چھینے تھے۔ ان کے پیچھے امرائے دربار اور شہزادے اپنے اپنے مرتبہ کے مطابق چلے آتے تھے۔ ان کے بعد شاہی باڈی گارڈ کا دستہ چل رہا تھا۔ جن کے جھرمٹ میں ملک المنصور محمد بن ابی عامر وزیر اعظم اور خلیفہ ہشام نہایت تمکنت اور وقار سے گھوڑوں پر سوار تھے۔ بادشاہ نوجوان آدمی تھا۔ اپنے وزیر کی زبان سے بولتا اور اسی کی آنکھ سے دیکھتا تھا جب وہ میدان میں داخل ہوا۔ تمام لوگ ادب سے کھڑے ہو گئے۔ بادشاہ گھوڑے سے اتر کر وزیر کی راہنمائی میں تخت کی طرف بڑھا۔ دو رویہ افریقہ کے دیوزاد حبشی بڑے بھاری گرز کندھوں پر لئے کھڑے تھے اور مسند پر رعب سپاہیوں کا پہرہ تھا۔ بادشاہ کے جواہر نگار مسند پر بیٹھتے ہی وزیر اعظم کی ایک گرج سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی تیر انداز پہلوان ترتیب سے بادشاہ کے حضور میں پیش ہونے شروع ہوئے۔

سب سے پہلے اسحٰق عربی لباس میں پیش ہوا۔ جب اس نے جھک کر سلام کیا تو بادشاہ نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ کہا۔

"نوجوان! پچھلے سال تو تم نے سب کو پچھاڑ دیا تھا۔ لیکن اس سال مقابلہ بہت سخت ہے۔ بڑے نامی گرامی پہلوان تمہارے مقابلے کو آئے ہیں۔"

اسحٰق آداب بجا لانے کے لئے دوبارہ جھک گیا۔ اور کہا۔

"اگر خدا کا فضل اور خلیفۃ المسلمین کی نظر عنایت شامل حال رہی تو اب بھی انہیں بازی نہیں جیتنے دونگا۔"

خلیفہ اسحٰق کی ہمت سے بہت خوش ہوا۔ اور اُسے دعا کی۔ اس کے بعد اندلس، قشتالہ اور پرتگال کے دوسرے قادر انداز پیش ہوئے خلیفہ سب کا سلام لیتا اور ان سے خوش طبعی کی باتیں کرتا رہا۔

ایک سرکاری منصب دار انعام کی صراحی ہاتھ میں لئے لوگوں کو دکھاتا پھرتا تھا۔ یہ اس زمانہ کی صناعی کا لاجواب شاہکار تھی۔ یہ خالص سونے کی تھی۔ اور اس پر جواہرات کی جڑاوٹ اس نفاست سے کی گئی تھی۔ کہ عقل دنگ رہ جاتی تھی۔

ٹھیک گیارہ بجے نقارے پر چوٹ پڑی اور تیر انداز پہلوان ایک طرف صف باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ رومال ہلنے پر مقابلہ شروع ہوا۔ ساٹھ اُمیدواروں میں سے صرف دس کا نشانہ درست آیا۔ اب میدان میں ایک بڑا لمبا بانس کھڑا کر دیا گیا۔ اس کی چوٹی پر ریشم کی بنی ہوئی ایک خوبصورت چڑیا بیٹھی تھی۔ جو اپنی جگہ پر ہوا کے ذریعے پر ہلا ہلا کر سرعت سے چکر لگا رہی تھی۔ ہر تیر انداز کو تین تین تیر دیئے گئے۔ پہلے پہل پانچ عیسائی نوجوان میدان میں آئے۔ مگر چڑیا کو گھائل کرنے میں ایک بھی کامیاب نہ ہوا۔ ان کے بعد

عرب اور بربر قسمت آزمانے کے لئے بڑھے لیکن وہ بھی ناکام رہے۔ اسحاق چونکہ گذشتہ سال مقابلے میں اول رہا تھا۔ اس لئے اس کا نمبر سب سے آخیر تھا۔ اس نے چلہ چڑھا کر کمان کو کھینچا۔ اور تاک کر ایسا نشانہ مارا کہ تیر چڑیا کے دونوں بازوؤں کو چھیدکر نکل گیا۔ ہر طرف سے "اسحٰق زندہ باد" کا شور بلند ہوا۔ لیکن چونکہ ابھی چڑیا زمین پر نہ گری تھی۔ اس لئے اسحٰق نے پھر چلّہ چڑھایا۔ اس دفعہ تیر چڑیا کے سینہ کو چیرتا ہوا نکل گیا۔ قرطبہ کی فضا ایک دفعہ پھر تحسین و آفرین کے نعروں سے گونج اُٹھی۔ اب چڑیا آہستہ آہستہ گھوم رہی تھی۔ تیسری دفعہ اسحٰق نے جو نشانہ مارا۔ وہ سلاخ جس پر چڑیا بیٹھی تھی۔ ٹوٹ گئی۔ اور چڑیا زمین پر آگری۔ ہر طرف سے مبارک باد کا شور برپا ہوا۔ شیخ عبدالکریم نے لپک کر اسحٰق کو گلے سے لگا لیا۔ اور خادم سے پھولوں کے ہار لے کر اس کے گلے میں ڈالے۔ اس کے بعد دوسرے احباب اور رفقا نے بھی اتنے ہار ڈالے۔ کہ اسحٰق ان سے لد گیا۔ اسحٰق نے یہ تمام ہار اُتار کر خلیفہ کے قدموں میں ڈال دیئے اور گھٹنے کے بل جھک کر آداب بجا لایا۔ بادشاہ کا چہرہ مسرت و شادمانی سے چمک رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ عرب کی کامیابی نے اس کی تمنّاؤں کو کھول دیا ہے۔ وہ اسحٰق کی فتحمندی کو اپنے لئے مبارک فال خیال کر رہا تھا۔ اس نے بے اختیار ہو کر "مرحبا یا اسحٰق" کا نعرہ بلند کیا۔ بایاں ہاتھ اس کے سر پر رکھے

دائیں ہاتھ سے اس کی پیٹھ پر تھپکیاں دینے لگا۔ وزیر اعظم نے طشت میں طرح رکھ پیش کی۔ خلیفہ نے اپنے ہاتھ سے اسحٰق کے حوالے کی۔ اسحٰق نے بائیں ہاتھ میں انعام تھام لیا۔ اور دائیں ہاتھ سے امرائے دربار اور شہزادگان کو سلام کرتا ہوا واپس لوٹا۔ اور پھر ملازموں کے ہمراہ گھوڑے پر سوار ہو کر اپنے محل کو روانہ ہو آیا۔

فتحمند بیٹا باپ کی خدمت میں

شیخ ادریس احمد اگرچہ محل کے ایک حجرے میں بیٹھا اللہ اللہ کر رہا تھا لیکن وہ اسحٰق کی طرف سے بھی غافل نہ تھا۔ خادموں کے ذریعے اُسے پل پل کی خبریں پہنچ رہی تھیں۔ جونہی نشانہ کی چڑیا زمین پر گری۔ نوکروں نے دوڑ کر شیخ کو لختِ جگر کی کامیابی کی اطلاع کی۔ بوڑھا ادریس ادائے شکر کے لئے فوراً سجدے میں جھک گیا۔ اس کے بعد محبت پدری کے جوش سے لاٹھی ٹیکتا محل کے دروازے پر آ کر کھڑا ہو گیا۔ شہر کا شہر مبارکبادی کیلئے اُمڈا چلا آتا تھا۔ شیخ نے عارف کو پہلے سے مہمانوں کی خاطر مدارات کیلئے کہہ دیا تھا۔ دیوان خانے میں بے شمار کرسیاں اور چارپائیاں بچھ رہی تھیں نوکر مہمانوں کو شربت پلاتے پھرتے تھے۔ شہر کی طرف سے رہ رہ کر نعرہ ہائے تکبیر سنائی دے رہے تھے۔ لوگوں کا شوروغل تیز ہو رہا تھا۔ کہ فتحمند اسحاق آرہا ہے۔ ادریس کا دل بیٹے کو مبارک دینے اور اُسے کلیجہ سے لگانے کے لئے

بلیوں اچھل رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اسحٰق اپنے مشکی گھوڑے پر سوار محل کی طرف آتا دکھائی دیا۔ اور جونہی اس کی نظر بوڑھے باپ پر پڑی۔ فوراً گھوڑے سے اتر پڑا۔ اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا باپ کے پاس پہنچا۔ اور اپنا سر اس کے سینہ پر رکھ دیا۔ شیخ سب کے ساتھ دیوان خانے میں آیا۔ یہاں سب کی میوے اور پھل وغیرہ سے خاطر تواضع کی گئی۔ ابھی مہمان رخصت بھی نہ ہوئے تھے کہ ماموں کے گھر سے الیاس نامی خادم بلانے کے لیے آپہنچا۔ شیخ اسحٰق کو لے کر زنان خانے گیا۔ وہاں خواجہ حسن کی بیوی اور اس کی ماں منتظر بیٹھی تھیں۔ انہوں نے شفقت سے سر پہ ہاتھ پھیرا۔ اور مبارکباد دی۔ خواجہ کی بیوی نے کہا۔ اب میرا اسحٰق خیر سے جوان ہوچکا ہے۔ ہم سب اپنی عمر کی آخری منزلوں میں ہیں۔ بہتر ہے کہ اسی مہینہ میں اپنی بہو کو بیاہ لائیں۔ اور نوشہ کو سہرے بندھے دیکھ لیں۔ ادریس احمد نے کہا۔ ہاں یہ بات تو شیخ عبدالکریم سے طے ہوچکی ہے۔ کل میں جاکر اس کی شادی کی تاریخ مقرر کر آؤنگا۔ اسحٰق مسکراتا ہوا حمام میں داخل ہوا۔ اور نہا دھو عمدہ لباس زیب تن کر ماموں کے گھر جانے کے لیے باہر نکلا۔

ماں نے کہا۔ بیٹا شام ہونے سے پہلے پہلے لوٹ آئیو۔!

"یہ تو ماموں جان پر ہی منحصر ہے۔ اگر انہوں نے اجازت دی تو سر شام آجاؤنگا۔ ورنہ کل صبح کو حاضر خدمت ہونگا۔" اسحٰق نے چلتے چلتے جواب دیا۔

دیوان خانے میں جا کر اسحٰق نے ابلق گھوڑا طلب کیا۔ اور خادم کو ہمراہ لے قرطبہ کو روانہ ہو گیا۔

اسحٰق کا قتل

شیخ عبدالکریم نے اسحٰق کی کامیابی کی خوشی میں اپنے احباب کو ظہر کے بعد اپنے ہاں مدعو کر رکھا تھا۔ اس مجلس میں قرطبہ کے بڑے بڑے رئیس موجود تھے۔ خلیفہ کا بھائی سلیمان اور بھتیجا محمد اور دستور اعظم کا بڑا لڑکا عبدالملک بھی شامل تھے۔ اسحٰق کے آنے پر اہل محفل کھڑے ہو گئے۔ اور ہر ایک نے بڑی گرم جوشی سے اس کے ساتھ مصافحہ کیا۔ شیخ نے اپنے بھانجے کو گلے سے لگایا۔ اور اس کے سر اور پیشانی پر بوسے دیئے۔ جب سب لوگ جمع ہو گئے۔ تو دریا دل میزبان نے اپنے دیوان خانے میں دستر خوان بچھوایا۔ اور اس پر عربی اور اندلسی کھانے بڑی ترتیب سے سجا دیئے گئے۔ جب مہمان کھانا کھا چکے۔ تو اس کے فوراً بعد قہوے کا دور چل پڑا۔ دو اڑھائی گھنٹہ تک یہ پر لطف مجلس گرم رہی۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے مہمان رخصت ہونے لگے۔ اور اسحاق بھی ماموں جان سے رخصت لے کر گھوڑے پر سوار ہوا اور گھر کو چل پڑا۔

سورج غروب ہو رہا تھا۔ اسحٰق کو ماں کی ہدایت یاد تھی۔ اور وہ چاہتا تھا۔ کہ مغرب کی نماز بوڑھے باپ کے ساتھ جا کر ادا کرے۔ اسلئے وہ گھوڑا اڑائے

چلا جا رہا تھا۔ لیکن جب وہ گورستان شاہی کے قریب پہنچا۔ تو اس نے گھوڑے کی باگ کھینچ لی۔ کیونکہ یہاں پگڈنڈی تنگ ہو گئی تھی۔ اور سامنے ایک شخص گٹھڑی سر پر رکھے چلا آرہا تھا۔ گھوڑا اس سے ڈر کر سیخ پا ہو گیا۔ اسحٰق نے اُسے بڑا سنبھالا۔ لیکن مسافر نے جو پاس سے گذرنے کی کوشش کی گھوڑے کی ٹکر سے اس کی گٹھڑی گر گئی۔ اور وہ اسحٰق کو بے نقط سنانے لگ گیا۔

اسحٰق بڑا حلیم الطبع نوجوان تھا۔ اس نے بجائے بگڑنے کے معذرت کی اور ساتھ ہی جیب سے چند اشرفیاں نکال کر کہا۔

"بھائی! تم مجھے اجنبی معلوم ہوتے ہو۔ یہ رقم تمہارے کام آئے گی۔ مجھ سے غلطی ہوئی ہے۔ معاف کر دو ——— !"

مسافر نے غضب آلود نگاہوں سے اسحٰق کو دیکھ کر کہا۔

احمق آدمی! مجھے بھی تو نے اندلسی سمجھ لیا ہے۔ میں اس علاقے کا باشندہ ہوں۔ جو کسی کا احسان نہیں اُٹھاتے۔ تم مجھے اشرفیوں سے خریدنا چاہتے ہو!

مسافر نے انتہائی طیش سے زمین پر لعابِ دہن نکال پھینکا۔ اور پھر اسحاق کو گھورتے ہوئے کہا۔

"سچے عیسائی۔ تم پاجی ——— عربوں کے ممنونِ احسان نہیں ہو سکتے۔"

اسحٰق نے گرم ہو کر کہا۔ بے وقوف! ایک شریف اور غیور قوم کو اس طرح بُرا بھلا نہ کہو۔ عربوں نے تیرا کیا بگاڑا ہے۔ مجھ سے غلطی ہوئی معافی مانگ رہا ہوں

مگر اس میں ساری قوم کا کیا قصور ؟"

"قوم کا کیا قصور ____" عیسائی نے منہ چڑاتے ہوئے کہا لٹیروں کی قوم!!
اسحٰق اپنی قوم کی توہین سن کر بھنّا اٹھا۔ مگر بہت جلد اپنے جذبات پر قابو پا کر بولا۔

"میرے مذہب میں مسافر پر ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں۔ ورنہ تجھے اس سرکشی کا مزہ چکھا دیتا ____!"

اسی لئے لاکھوں عیسائیوں کو اپنا غلام بنا رکھا ہے۔ اسی لئے آئے دن تمہارے خونریز اور سفاک لشکر قسطالہ اور پرتگال پر چڑھ دوڑتے ہیں؟؟ تیرے مذہب کی ایسی تیسی۔ بڑا مذہب لئے پھرتا ہے۔ قتر بازوں کا مذہب ____!"
اسحاق نے سوچا۔ یہ کوئی یورپی اس کی جماعت کا دیوانہ عیسائی ہے اسے چھیڑنا مناسب نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر کوئی حملہ کر دے۔ اس لئے اس نے گھوڑا آگے بڑھانا چاہا۔ مگر وہ کم بخت راستہ روکے کھڑا تھا۔ اسحٰق کو خاموش پا کر بولا۔

ارے چپ ہو گیا۔ تیرا محمد صلی اللہ علیہ وسلم ____!
سرکار دو عالم کا نام سنتے ہی اسحٰق کی شریانیں کھول اٹھیں۔ دینی حمیّت سے بے قرار ہو کر بولا۔

"خبردار! میرے آقا کے حق میں اگر کوئی گستاخی کی۔ تو ____!"

ارے جا لے جا۔ بڑا آیا ہے جھوٹے نبی کا جھوٹا ——— !

اسحٰق عیسائی کی اس بکواس سے تڑپ اُٹھا۔ بولا۔ خدا کی قسم اگر تو نہتا نہ ہوتا۔ تو میں تجھے حضرت کی توہین کا مزا چکھا دیتا ——— !"

میں نہتا کہاں ہوں اگر کچھ ہمت ہے تو گھوڑے سے اُتر۔ دیکھیں کون مزہ چکھاتا ہے۔ اور بُلا اپنے عربی رسولؐ کو ——— !

نصرانی نے گٹھری ایک جانب پھینک دی۔ اور کمر سے خنجر کھول کر مقابلے پر آمادہ ہو گیا۔

"میں تجھے قتل تو نہیں کرونگا۔ لیکن جس زبان سے تو نے میرے آقا پر حملے کئے ہیں۔ اُسے ضرور کاٹونگا۔" یہ کہہ کر اسحٰق نے گھوڑے کی اَیال پر ہاتھ رکھا۔ اور جلدی سے اُترنے لگا۔ لیکن ابھی اس کا ایک پاؤں زمین پر اور دوسرا رکاب میں تھا۔ کہ نصرانی نے جھپٹ کر اپنا خنجر اسکی پیٹھ میں بھونک دیا اسحاق تیورا کر زمین پر گر پڑا۔ اور گرتے ہی جان بحق ہو گیا۔

نصرانی نے اسحٰق کو قتل کرنے کے بعد۔ اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ اسحٰق کا غلام جو کسی ضرورت کے لئے پیچھے رہ گیا تھا ———

——— اس نے صورتِ حال کا اندازہ لگا لیا۔ چلّا کر بولا۔ خبردار حرامی! میں ابھی آیا۔ قرب وجوار سے بیک وقت لوگوں کی آوازیں آئیں۔ لینا! لینا!! جانے نہ پائے ——— !!!

چاروں طرف سے لوگ لپک کر جائے وقوعہ پر آپہنچے۔ دو تین آدمی تو اسحق کی لاش اُٹھانے کے لئے ٹھہر گئے۔ باقی قاتل کے پیچھے دوڑ پڑے۔

شہر کی طرف سے لوگ بھاگے چلے آتے تھے۔ نصرانی کو جب آگے بچاؤ کا کوئی راستہ نظر نہ آیا۔ تو وہ پیچھے کی طرف دوڑا۔ لیکن جس طرف جاتا۔ باغ کی دیوار راستہ روک لیتی۔ دیوار اونچی تھی۔ اس کا پھاندنا بہت مشکل تھا۔ جس طرح تعاقب کرنے والے درندوں کے سامنے گلہری اِدھر اُدھر دوڑتی ہے۔ کسی درخت پر چڑھنے کی بار بار کوشش کرتی ہے لیکن ہاتھ پاؤں پھول جانے کے باعث ہر مرتبہ گر پڑتی ہے۔ یہی حالت اس نصرانی کی تھی۔

دوڑتے دوڑتے اس کا سانس پھول گیا۔ پاؤں من من کے ہو گئے کئی بار دل میں آیا کہ پلٹ کر سب پر ٹوٹ پڑے۔ لیکن تعاقب کرنے والوں کی تعداد دیکھ کر حوصلہ گر جاتا۔

لینا۔ پکڑنا اور دوڑنا کا شور برپا تھا۔ اچانک نصرانی کو دائیں طرف باغ کی دیوار کچھ نیچی نظر آئی۔ یہ دیکھتے ہی اس کے پاؤں میں نئی قوت عود کر آئی۔ رگوں میں نیا خون دوڑنے لگا۔ وہ ہرن کی طرح اس طرف دوڑا۔ اور ایک جست میں دیوار پھاند کر باغ میں داخل ہو گیا۔

بیٹے کا قاتل باپ کی پناہ میں

شام کے وقت جب آفتاب کی الوداعی کرنیں درختوں کی بلند چوٹیوں

پر آنکھ مچولی کھیل رہی تھیں۔ شیخ ادریس احمد اپنے بیٹے اسحاق کی انتظار میں کئی بار گھر سے دیوان خانے تک آ جا چکا تھا۔ اندر زینب اور اس کی بہو الگ سہمی بیٹھی تھیں۔ مغرب کی نماز کا وقت ہو چکا تھا۔ عارف وضو کے لئے پانی لے آیا۔ شیخ نے وضو کر کے مسجد میں جماعت کے ساتھ نماز ادا کی۔ اور پھر اسحٰق کی راہ دیکھنے کے لئے پھاٹک پر جا کھڑا ہوا۔ اسی اثنا میں درختوں سے سرسراہٹ کی آواز آئی۔ اور ساتھ ہی ایک شخص جو خون سے لت پت ہو رہا تھا۔ ہانپتا کانپتا آیا۔ اور شیخ کے آگے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ اور ہاتھ جوڑ کر بڑی عاجزی سے بولا۔

"حضور! میں ایک غریب عیسائی ہوں مصیبت میں پھنس گیا ہوں اگر آپ پناہ دیں۔ تو میں بچ سکتا ہوں ——————!"

"خداوند عالم تیری مدد فرمائینگے۔ تو کس مصیبت میں گھر گیا ہے؟" شیخ نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

نصرانی نے لجاجت سے کہا۔

"میں ڈرتا ہوں۔ کہ اگر میں نے سچ سچ کہہ دیا۔ تو شاید آپ بھی میرے خون کے پیاسے نہ ہو جائیں!"

"جب تو میری پناہ میں آ گیا ہے۔ آپ کو مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم مسلمان ہیں جس کو ایک دفعہ پناہ میں لے لیتے ہیں۔ زندگی بھر

اس کی حفاظت کرتے ہیں ــــــــــ !"

"حضرت میں بالکل بے گناہ ہوں۔ خدا کے لئے مجھے بچا لیجئے۔ خدا آپ کو اس کا نیک بدلہ دے گا۔ اور رسول عربی آپ کی شفاعت فرمائینگے!"

"انشاءاللہ۔ انشاءاللہ۔!" شیخ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نام سن کر ادب سے سر جھکا لیا۔ اب تم خدا کی پناہ میں آچکے ہو۔ گھبراؤ نہیں۔ لیکن آخر بتاؤ تو سہی۔ کہ ماجرا کیا ہے؟

عارف سے کہا۔ جلدی سے شربت کا ایک گلاس لے آیئے۔ اس شخص کا پیاس سے حلق سوکھ رہا ہے۔ عارف لپک کر مفرّح شربت کا ایک گلاس لے آیا۔ نصرانی کی زبان جو سوکھ کر کانٹا ہو رہی تھی۔ اس کے پینے سے درست ہوئی اور پھر اس نے کہنا شروع کیا۔

"حضور آپ اپنی قوم کے سردار معلوم ہوتے ہیں میں ایک غریب الوطن مسافر ہوں شہر کو جا رہا تھا۔ کہ راستے میں چند نوجوان ملے۔ انہوں نے مجھے حضرت مسیح اور پاک مریم کو بُرا بھلا کہنا شروع کیا۔"

نعوذ باللہ! نعوذ باللہ!!" ایک جلیل القدر پیغمبر اور جنابِ صدیقہ مریمؑ کو بُرا بھلا کہنے لگے! اور ابھی وہ زندہ ہیں ــــــــ !! لاحول ولا قوۃ" شیخ نے برہم ہو کر کہا۔

ہاں حضور! پھر انہوں نے میرے مارنے کے لئے کٹاریں نکال لیں۔

ہیں لے اپنی جان بچانے کے لئے کمر سے خنجر نکالا۔ اس کشتم کشتا میں ان کا ایک آدمی مجھ سے مارا گیا۔ وہ اس کی طرف متوجہ ہوتے۔ اور میں جان کے خوف سے ادھر بھاگ آیا ——— مجھے مسیح اور پاک مریم کی قسم میں بالکل بیگناہ ہوں۔ میں آپ کو محمد عربی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا واسطہ دیتا ہوں۔ مجھے اپنے دامن میں پناہ دے دیجئے۔ میں بے وطن ہوں۔ خدا کے سوا میرا اور کوئی آسرا نہیں ———!

سڑک کی طرف سے شور و غل سنائی دیا۔ نصرانی نے گھبرا کر کہا حضرت یہ لو۔ میرے قاتل آپہنچے۔ نصرانی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اور شیخ کے منہ کو تکنے لگا۔ شیخ کو اس پر رحم آگیا۔ عارف سے کہا کہ اسے دیوان خانے کے غربی کمرے میں بند کر دو۔ بند کمرے کا لفظ سن کر نصرانی لمحہ بھر کے لئے رک گیا۔ شیخ نے کہا۔

"بھائی ڈرو نہیں۔ تمہارا اور میرا خدا ضامن۔ تم نے مجھ سے پناہ مانگی ہے۔ میں نے رضائے الٰہی کے پیش نظر تجھے پناہ دے دی۔ اب اگر مقتول کے وارث بھی آئیں گے تو بھی تمہیں ان کے حوالے نہیں کروں گا۔ خواہ مجھے کتنا ہی خون بہا ادا کیوں نہ کرنا پڑے۔"

اب نصرانی مطمئن ہو گیا۔ خوشامد کے طور پر گھٹنے جھکا کر شیخ کی قبا کو بوسہ

دیا۔ اور پھر عارف کے ہمراہ دیوان خانے میں چلا گیا۔ عارف نے اُسے کمرے میں بٹھا کر باہر سے مقفل کر دیا۔

اسحٰق کا جنازہ ـــــــــ

ہجوم دروازے پر آپہنچا۔ شیخ نے خیال کیا۔ کہ نصرانی کو پکڑ لے چلے آتے ہیں۔ اس لئے لاٹھی کے سہارے آگے بڑھے۔ مگر آگے نقشہ ہی کچھ اور نظر آیا۔ چند آدمیوں نے چارپائی پر لاش اُٹھا رکھی تھی۔ اور ہجوم داڑھیں مار مار کر رو رہا تھا۔ شیخ کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ گھبرا کر پوچھا۔

"یہ کس کی لاش ہے ـــــــــ؟"

لوگوں نے بجائے کچھ بتانے کے لاش کے منہ سے کپڑا ہٹا دیا۔ شیخ کے منہ سے "میرا اسحاق" کا لفظ نکلا۔ اور وہ چکرا کر پیچھے کو گرے۔ خادموں نے لپک کر تھاما۔ اور دیوان خانے میں ان کی مسند پر لٹا دیا۔ نوکر چاکر پنکھا جھلنے لگے۔ عارف نے زنان خانے سے لخلخہ منگوا کر سنگھایا۔ اندر الگ کہرام برپا تھا۔ بیویاں اور نوکرانیاں سب رو پیٹ رہی تھیں۔ بڑی تدبیروں سے شیخ کو ہوش میں لایا گیا۔ انہوں نے آنکھ کھولی۔ عارف سے کہا۔ اسحٰق کے ساتھ جو خادم گیا تھا۔ اُسے حاضر کرو!"

وہ پاس ہی حزن وملال کی تصویر بنا بیٹھا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر دردناک آواز میں کہا "میرے آقا! میں حاضر ہوں ـــــــــ!"

"اسحٰق کیسے شہید ہوا؟" بوڑھے شیخ نے ڈوبی ہوئی آواز میں کہا۔ عارف کو اشارہ کیا۔ کہ مجھے اُٹھنے میں مدد دو۔ عارف نے سہارا دے کر شیخ کو اُٹھایا اور نیچے بڑا تکیہ رکھوا دیا۔

خادم نے کہنا شروع کیا۔

"حضرت! میں میاں اسحٰق کے پیچھے پیچھے چلا آتا تھا۔ انہوں نے نماز کے خیال سے گھوڑے کو مہمیز کیا۔ میں ان سے ٹوٹ گیا۔ دور سے میں نے دیکھا۔ کہ کوئی شخص گورستان کے پاس ان سے کھڑا باتیں کر رہا ہے۔ پھر میں نے انہیں گھوڑے سے اترتے دیکھا۔ لیکن قبل اس کے کہ وہ قدم زمین پر رکھتے۔ اس آدمی نے خنجر مار کر انہیں شہید کر دیا۔ میں چیختا چلاتا لوگوں کو امداد کے لئے پکارتا دوڑا۔ مگر میرے پہنچنے سے پہلے قاتل بھاگ گیا۔"

"انا للہ وانا الیہ راجعون۔ خدا کی تقدیر غالب ہے۔ میں اس پر شاکر ہوں۔" بوڑھے ادریس نے رُک رُک کر ڈوبی ہوئی آواز میں کہا۔

شیخ عبدالکریم کو بھی اطلاع مل چکی تھی۔ وہ بھی بیوی سمیت روتے پیٹتے آپہنچے۔ شیخ نے گلوگیر آواز میں کہا۔

میاں۔ وہ تھا اندر روٹھا پڑا ہے۔ جاؤ اسے مناؤ۔ تم سے بہت پیار

کرنا تھا۔ شاید سن جائے۔

شیخ عبدالکریم آہ و فغاں کرتا اندر داخل ہوا۔ اسحق کے چہرے سے کپڑا اٹھایا۔ جس طرح مسکرا کر ماموں سے رخصت چاہی تھی وہی مسکراہٹ چہرے پر کھیل رہی تھی۔ کافی دیر تک عبدالکریم لاش سے لپٹ کر روتا رہا۔ اس کے بعد لاش کو غسل اور کفن دے کر دیوان خانے میں لے آئے۔ شیخ ادریس احمد نے کہا۔ عارف میاں لوگوں سے کہہ دو۔ کہ جنازہ صبح کو ہوگا۔ اکثر آدمی شیخ کے صبر اور حوصلہ کی تعریف کرتے شہر کو لوٹ گئے۔ جو وہاں لاش کے پاس بیٹھے تھے۔ وہ قرآن مجید کے پارے منگوا کر تلاوت کرنے لگے۔

والعافین عن الناس

نصرانی کو عارف کمرے میں بٹھا کر واپس لوٹا ہی تھا کہ اُسے لوگوں کے رونے پیٹنے کی آواز سنائی دی۔ اس نے خیال کیا۔ شاید مقتول کے ورثا شیخ سے امداد طلب کرنے آئے ہیں۔ لیکن جب یہ سلسلہ دیر تک جاری رہا۔ اور بڈھے ادریس کی غم میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی۔ تو اس کے ہوش اُڑ گئے۔ اس نے یقین کر دیا۔ ہو نہ ہو مقتول اس کا کوئی قریبی رشتہ دار ہے۔ لیکن جب بھی کوئی ادھر کو نہ آیا۔ تو پھر وہ قسم قسم کے خدشات میں گھر گیا کوئی آدھی رات کا عمل تھا۔ کہ شیخ ادریس احمد عارف کے کندھے کا سہارا لیتے اندر داخل ہوا۔ اور نصرانی کو مخاطب کر کے لڑکھڑاتی ہوئی زبان

یس بولا:-

"آہ ظالم! تو جانتا ہے کہ میں کون ہوں-؟ میں اسی نوجوان کا بدقسمت باپ ہوں جس کو تو نے بے رحمی سے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ تو نہیں جانتا۔ کہ اسحٰق کو قتل کر کے تو نے مجھ پر کتنا ظلم کیا۔ تو نے میرے خاندان کا نشان مٹا دیا۔ میرا چراغ گل کر دیا۔

اسحٰق میرا اکلوتا بیٹا تھا۔ میری زندگی کی سبھی تمنائیں اسی سے وابستہ تھیں۔ وہی میری آنکھوں کا اجالا اور میرے بوڑھے جسم کی زندگی تھا۔ تو اندازہ نہیں کر سکتا۔ کہ مجھے تجھ پر کس قدر غصہ آرہا ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ دونوں ہاتھوں سے تیری گردن دبوچ کر اس زور سے دباؤں کہ تیری زبان باہر نکل آئے۔ اور آنکھیں کوڑیوں کی طرح نکل پڑیں۔ لیکن نہیں تو نے میری پناہ

لی ہے۔ فرض نے میرے ہاتھ باندھ رکھے ہیں۔ رسولِ پاک کی ہدایت کے موافق پناہ میں آتے ہوئے پر ہاتھ اُٹھانے سے ناصر ہوں۔ دنیا تو تباہ ہو چکی۔ عاقبت کیوں برباد کروں۔ گو صبر کرنا مشکل ہے۔ لیکن صبر کروں گا تاکہ کل کو نبی صلعم کے سامنے آنکھیں نیچی نہ کرنی پڑیں"

نصرانی ندامت سے پانی پانی ہو رہا تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں

یہی نتیجہ اخذ کیا تھا۔ کہ مسلمان جلّاد قوم ہے۔ لیکن آج وہ یہ دیکھ کر کہ مسلمان دل سے زیادہ رحمدل اور پابند عہد اور کوئی قوم نہیں ہے۔ دل ہی دل میں حیران ہو رہا تھا۔ شیخ نے عارف سے کہا۔ میاں اصطبل سے تیز رفتار سانڈنی نکال کر پھاٹک پر لے آؤ۔ تاکہ میں اسحٰق کے مہمان کو اسی وقت رخصت کر دوں۔ ممکن ہے میں اپنے جذبات کو دیر تک قابو میں نہ رکھ سکوں۔ عارف کمرے سے نکل گیا۔ تو شیخ نے نصرانی کو پھر مخاطب کیا۔ کہا۔

"اے نصرانی! میرا لڑکا مر چکا ہے۔ وہ واپس نہیں آسکتا اور تجھے میں پناہ دے چکا ہوں۔ تیرا بال بیکا نہیں کر سکتا تجھے مسیح ناصری کی قسم! مجھے ایک بات سچ سچ بتا دے کہ زیادتی کس سے ہوئی۔ ——— ؟"

بوڑھے کے یاس انگیز چہرے کو دیکھ کر نصرانی اس کے دلی غم کو بھانپ گیا۔ اس لئے اب فیصلہ کر لیا۔ کہ خواہ بوڑھا مجھے معاف کرے یا نہ کرے۔ لیکن میں اب جھوٹ نہیں بولوں گا۔ اس لئے کہا۔

حضرت! آپ کا لڑکا شریف اور غیور مسلمان تھا۔ وہ گھوڑے پر چلا آتا تھا۔ کہ گورستان کے قریب ٹکراؤ ہو گیا۔ گھوڑے کی ٹھوکر سے میں گر پڑا۔ اس نے معذرت طلب کی۔ اور کچھ رقم بھی پیش کی۔ لیکن میری بے وقوفی سمجھئے۔ کہ میں نے

مصنف کی مہر کے بغیر کتاب مسروقہ تصور ہوگی

۱۵۶ ے

اسلامی افسانے

نہ سنتے تم جو غیروں کی زبانی
بہت دلچسپ تھی میری کہانی

جلد دوم

از

مولانا نور احمد خاں فریدی

ناشر

قصر الادب جگو والہ براہ لودھراں ضلع ملتان